سنہرے نقوش

دلوں پر نقش ہونے والے سنہرے واقعات

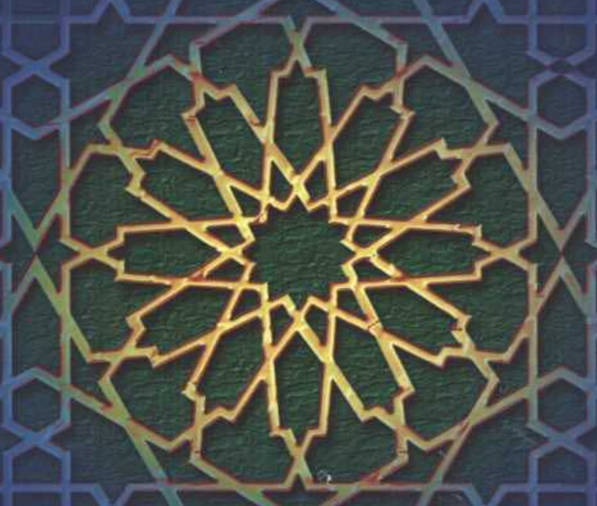

عبدالمالک مجاہد

دار السلام
DARUSSALAM

جملہ حقوق اشاعت برائے دارالسلام محفوظ ہیں

220.9
ی 12.1

ⓒ مكتبة دارالسلام، ١٤٢٩ هـ

فهرسة مكتبة الملك فهد الوطنية أثناء النشر
مجاهد، عبدالمالك
النقوش الذهبية باللغة الاردية. / عبدالمالك مجاهد - الرياض، ١٤٢٩ هـ
ص: ٣٨٤ مقاس: ١٤×٢١ سم
ردمك: ٩٧٨-٦٠٣-٥٠٠-٠٠١-٧
١. التاريخ الاسلامي أ. العنوان
ديوي ٩٥٣ ١٤٢٩/١١٥٠

رقم الإيداع: ١٤٢٩/١١٥٠
ردمك: ٩٧٨-٦٠٣-٥٠٠-٠٠١-٧

پوسٹ بکس: 22743 الریاض: 11416 سعودی عرب فون: 4043432-4033962 1 00966 فیکس: 4021659
E-mail: darussalam@awalnet.net.sa - riyadh@dar-us-salam.com
Website: www.dar-us-salam.com
● طریق مکہ۔ العلیا۔ الریاض فون: 4614483 فیکس: 4644945 ● الملز۔ الریاض فون: 4735220 فیکس: 4735221
● سویلم فون: 2860422 1 00966

دارالسلام	فون	فیکس
جدہ	00966 2 6879254	6336270
مدینہ منورہ	00966 503417155	8151121
خمیس مشیط	00966 7 2207055	0500710328
الخبر	00966 3 8692900	8691551
شارجہ	00971 6 5632623	5632624
لاہور، پاکستان	0092 42 7240024	7354072
اسلام آباد، پاکستان	0092-051-2500237	2500237
کراچی، پاکستان	0092-21-4393936	4393937
لندن	0044 208 539 4885	208 5394889
نیویارک، امریکہ	001 718 6255925	6251511
ہوسٹن، امریکہ	001 713 7220[illegible]19	7220431
ملائشیا	00603-77109[illegible]50	77100749

المکتبۃ الرحمانیۃ
99۔۔ جے ماڈل ٹاؤن۔ لاہور
نمبر ...17658......

سُنہرے نُقُوش

دِلوں پر نقش ہو جانے والے سُنہرے واقعات

عبدالمالک مُجاہِد

دارُالسّلام
کتاب و سُنّت کی اشاعت کا عالمی ادارہ
ریاض • جدہ • شارجہ • لاہور • کراچی
اسلام آباد • لندن • ہیوسٹن • نیو یارک

مضامین

- عرض ناشر 09
- تقدیم 13
- تقوی کے ثمرات 19
- پروردگار کے فیصلے کا خیر مقدم 22
- راہ اخلاص ووفا میں جانوں کا نذرانہ 25
- مرقدِ نبوی کے خلاف گھناؤنی سازش 32
- عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی زندگی کا آخری دن 39
- بہادر ڈاکو حجاج کی عدالت میں 43
- کس کس کا ہاتھ میرے گریباں میں آئے گا 53
- وعدے کی پاسداری 57
- عدل کے بغیر حکومت قائم نہیں رہ سکتی 62
- دجال کا جاسوس 64
- ظلم کا بدلہ 69
- باپ سے بدسلوکی کا بھیانک انجام 73
- خبردار! دشمن ہمہ وقت موقع کی تلاش میں ہے 75

■ دولت کا نشہ......ایک سانحہ عبرت 83
■ سچی توبہ 94
■ نہلے پر دہلا 97
■ لاجواب دلہن 100
■ جہنم سے فرار 113
■ تاک جھانک کا خمیازہ 125
■ اللہ کی نافرمانی کے خسارے 129
■ یہ کبھی نہ ہوگا 132
■ بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ 138
■ چاہ کن را چاہ درپیش 148
■ یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا 152
■ اچھی تربیت کا صحیح طریقہ 158
■ خلیفہ منصور کو خالد برمکی کا مشورہ 164
■ بارگاہ الٰہی میں جوابدہی کا احساس 167
■ جھوٹی توبہ 169
■ کفر و سرکشی کی سزا 173
■ اللہ تعالیٰ اس کی گھات میں تھا 176
■ مٹ گئے مٹ جائیں گے اعداء تیرے 181
■ خون ناحق کی ہیبت 190
■ آداب فرزندی کا قابل رشک مظاہرہ 198
■ کہیں عہد شکنی نہ ہوجائے 202

- سلطان جلال الدولہ کی ہوشیاری 205
- زیادہ صائب فیصلہ 208
- عضد الدولہ کی دور اندیشی 210
- دندان شکن جواب 213
- جو سو رہے ہیں ان کو جگانے کی فکر کر 214
- ان کا نقش قدم......معراج انسانیت 220
- حقیقی طالب علم 233
- حق بحقدار رسد 242
- کسریٰ پر عربوں کی پہلی جیت 247
- سر بمہر لفافے پر بیعت 255
- اندھیرے سے اجالے کی طرف 260
- عربوں کی مہمان نوازی 272
- وعدے کی پابندی 274
- ایفائے عہد کی نادر مثال 277
- پاس وفا 279
- دنیا کی بے ثباتی 284
- خدائی خون کے گھناؤنے دعویدار 286
- امرائے روم وایران کی عیاشیاں 295
- ......اور انصاف اپنی معراج کو پہنچ گیا 298
- قصی کے کارنامے 300
- سچی توبہ! 302

- ظالم کا عبرتناک انجام 305
- غلاموں کی خوش بختی! 307
- ہمارے خدشات درست نہ تھے 309
- اس نے میری آنکھیں کھول کر اپنی آنکھیں بند کر لیں 312
- پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا 323
- باپ کی عدالت سے بیٹے کے خلاف فیصلہ 330
- داستان ایک متکبر کی 332
- اصحاب اقتدار کی توجہ کے لیے 336
- مالک ارض وسماء کی پہچان 341
- لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے 343
- نومولود کی گواہی 346
- فرشتہ صفت نوجوان شیطان کے نرغے میں 349
- شیر خوار بچے کا اعلان حق 354
- کامیاب حربہ 356
- تربیت اولاد سے غفلت کا نتیجہ 359
- طوفانوں کے مقابل کوہ گراں 366

عرض ناشر

انسان اس فانی دنیا میں تھوڑی دیر کے لیے آتا ہے، زندگی کے گنے چنے دن پورے کرتا ہے، پھر سفرِ آخرت پر روانہ ہو جاتا ہے۔ بس یہی محدود اور مختصر سی مہلت انسان کی سب سے قیمتی پُونجی ہے۔ اس دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں انسان کی کامیابی کا سارا دارومدار صرف اسی مہلت پر موقوف ہے۔ اگر یہ مہلت اللہ رب العزت کے احکام اور امام الانبیاء حضرت محمد ﷺ کے مبارک طریقوں کے مطابق کام میں لائی جائے تو انسان لازوال کامیابی سے سرفراز ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے اس دنیا میں بھی پاکیزہ زندگی عطا فرماتا ہے اور آخرت میں بھی جنت کے سدا بہار خیابانوں کا مالک ومکین بنا دیتا ہے...... اس کے برعکس وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام نہیں مانتے اور زندگی کی مہلت غفلت، جہالت، ظلم وستم، ناجائز زراندوزی، حرص وہوس اور لہو ولعب میں ضائع کر دیتے ہیں، وہ آخرت میں بھی دوزخ کی غذا بنیں گے اور اس دنیا میں بھی رسوائی کا عذاب جھیلتے رہیں گے۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا، سراسر حقیقت ہے۔ اکثر یہ دلدوز خیال گزرتا ہے کہ جو لوگ اس حقیقت کو ذہن نشین نہیں کریں گے اور اپنی زندگی کو ایمان اور اعمال صالحہ کا آئینہ دار نہیں بنائیں گے، وہ لامحالہ دونوں جہانوں میں ناقابل تلافی خسارے کا شکار ہو جائیں گے۔ پس ہم سب کو اس ناکامی سے خود بچنے اور دوسروں کو بچانے کی ہر ممکن تدبیر کرنی چاہیے۔ یہ

ہمارا دینی، اخلاقی اور سماجی فریضہ ہے جسے التزام سے ادا کرتے رہنا چاہیے۔ بس اسی احساس کے زیر اثر میں نے کامیابی کی صفات اُجاگر اور ناکامی کے اسباب واضح کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اپنا عاجز سا قلم اٹھایا اور اچھی سیرت سازی کے لیے عبرت ونصیحت اور بصیرت وفراست پر مبنی واقعات لکھنے شروع کر دیے۔ یہ واقعات یکے بعد دیگرے سنہرے اوراق، سنہری کرنیں، سنہرے فیصلے اور سنہرے حروف کے زیر عنوان کتابوں کی شکل میں شائع ہوئے۔ الحمدللہ! یہ کتابیں بڑے ذوق وشوق سے پڑھی گئیں۔ بہت سے ثقہ احباب اور ان کے محترم اہلِ خانہ نے ان کتابوں کے مطالعے کے بعد اسی نوعیت کی مزید کتابوں کا اشتیاق ظاہر فرمایا چنانچہ زیرِ نظر کتاب اسی اشتیاق کا جواب اور اسی سلسلے کی نئی کڑی ہے جو 'سنہرے نقوش' کے عنوان سے پیش کی جا رہی ہے۔

اچھی کتابوں کا مطالعہ دل ودماغ کو راحت بخشتا ہے۔ اسی لیے میں سفر وحضر میں مطالعے کا موقع ضرور نکال لیتا ہوں۔ اس دوران جو واقعہ دل کو بھا جاتا ہے اسے قارئینِ کرام کے لیے محفوظ کر لیتا ہوں۔ یہ کتاب ایسے ہی واقعات کا مجموعہ ہے۔ میری پسند کا پیمانہ یہ ہے کہ کسی شخص کی زندگی میں نیکی کا کوئی دل رُبا عمل دیکھتا ہوں تو آرزومند رہتا ہوں کہ اسے جلد از جلد ناظرین کو بھی دکھا دوں تاکہ نیکی کی مہک دل ودماغ کی سرزمین میں دور تک پھیلتی اور اعلیٰ کردار سازی کا ذوق بیدار کرتی چلی جائے۔ نیک لوگوں کے ساتھ ساتھ میں نے اس کتاب میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نافرمانوں اور بعض سفاک انسانوں کے واقعات بھی درج کیے ہیں تاکہ لوگ ان کے لرزہ خیز انجام سے عبرت پکڑیں اور توبہ واستغفار کا اہتمام کر کے اپنی زندگی سنوار لیں۔ ...... فی الجملہ میری دیگر کتابوں کی طرح اس کتاب کی بھی اصل غرض وغایت یہی ہے کہ ہمارے معاشرے کا ہر فرد اچھے اور بڑے لوگوں

کے واقعات سے اعمالِ صالحہ کا سبق سیکھے اور دانشِ عمل (PRACTICAL WISDOM) نیکی اور ناموس کی زندگی بسر کرے۔ ان شاء اللہ اس طرح زندگی کی مشکلیں ناقابلِ توجہ معلوم ہونے لگیں گی اور ماحول کی تاریکیوں میں حُسنِ سیرت کے چراغ روشن کرنا آسان ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایمان کی مضبوطی اور اعمالِ صالحہ کی درخشندگی عطا فرمائے۔

مدیر دارالسلام لاہور عزیزی حافظ عبدالعظیم اسد کی نگرانی میں تکمیل و تہذیب کے مراحل سے گزرنے والی اس کتاب کی پیش کش میں شعبہ فقہ و متفرقات کے نگران حافظ محمد ندیم، مولانا تنویر احمد اور جملہ معاونین کرام کے علاوہ کمپوزنگ سیکشن کے گل رحمٰن اور ندیم کامران کی محنت بھی شامل ہے۔ دارالسلام کے نہایت مخلص اور سینئر ریسرچ سکالر احمد کامران حفظہ اللہ نے اس کتاب پر نظر ثانی بھی کی ہے اور وارفتگیٔ شوق میں مقدمہ بھی لکھا ہے۔ آخر میں دارالسلام ریسرچ سنٹر ریاض کے انچارج قاری محمد اقبال عبدالعزیز حفظہ اللہ نے بھی پوری کتاب کا مراجعہ کیا اور متعدد مفید اصلاحات کیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب بھائیوں کو خوش اور اقبال مند رکھے۔

خادم کتاب وسنت
عبدالمالک مجاہد
دارالسلام الریاض، لاہور

مارچ 2008ء

تقدیم

ایک بزرگ کراچی سے تشریف لائے۔ وہ دینی لحاظ سے مسلمانوں کی موجودہ حالت پر تشویش اور تردد میں مبتلا تھے۔ موصوف نے باتوں باتوں میں ایک واقعہ سنایا۔ کہنے لگے: قیام پاکستان سے پہلے برطانوی ہند کی بات ہے۔ ایک مسلمان نوجوان اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن گیا۔ وہاں ایک CLASS FELLOW انگریز لڑکی سے دوستی ہوگئی۔ اس لڑکی نے نوٹ کیا کہ یہ نوجوان جب بھی پانی پیتا ہے، بیٹھ کر پیتا ہے۔ اُس نے اِس کی وجہ پوچھی تو نوجوان نے جواب دیا: میرے ماں باپ بیٹھ کر پانی پیتے ہیں، اس لیے میری بھی یہی عادت ہے۔ لڑکی کہنے لگی: اِس روایت کی کوئی نہ کوئی معقول وجہ ضرور ہوگی۔ نوجوان بولا: یقیناً ہوگی۔ میں معلوم کرکے بتاؤں گا...... اب اس نوجوان نے دینی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، پتہ چلا کہ بیٹھ کر پانی پینا حضرت محمد ﷺ کی سنت ہے۔ نوجوان کا اشتیاق بڑھا۔ معمولاتِ زندگی کی دیگر سُنتیں جاننے کے لیے اس نے احادیث کے ترجمے پڑھنے شروع کردیے۔ جوں جوں مطالعے کی رفتار بڑھی نوجوان کی حالت بدلنے لگی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس نے انگریز لڑکی سے ملاقاتیں یک قلم ترک کردیں۔ لڑکی بہت پریشان ہوئی۔ ترکِ تعلق کی وجہ پوچھی تو نوجوان نے بتایا کہ آپ نے مجھ سے بیٹھ کر پانی پینے کی وجہ پوچھی تھی، میں نے رسول اللہ ﷺ کی احادیث کے ترجمے پڑھ کر معلوم کیا کہ یہ عمل سنت ہے۔ دورانِ مطالعہ نت نئی دینی تعلیمات سے آگاہی حاصل ہوئی تو میری آنکھوں سے غفلت اور جہالت کے پردے اُٹھنے لگے۔ ایک دن معلوم ہوا کہ غیر

محرم لڑکیوں سے ملاقاتیں بھی حرام ہیں اور ہمارا دین اس کی سختی سے ممانعت کرتا ہے...... نوجوان نے لڑکی کو یقین دلایا کہ مجھے آپ سے نفرت نہیں ہے۔ لیکن اب میں اپنے دینی احکام کی رُو سے آپ سے دوستی کا رشتہ برقرار نہیں رکھ سکتا...... وہ لڑکی رو پڑی، کہنے لگی: آپ کا دین بڑا مہذب ہے۔ مجھے مشرف بہ اسلام کیجیے اور مجھ سے شادی کر لیجیے...... یہ نوجوان اعلیٰ تعلیم کی ڈگری لے کر واپس آیا تو اس کے ساتھ یہ لڑکی بھی اس کی بیوی کی حیثیت سے ہندوستان آئی۔ اس نوجوان کے والدین اور دیگر عزیزوں نے اس انگریز لڑکی کی ایمانی زندگی دیکھی تو دنگ رہ گئے۔

راقم الحروف نے یہ واقعہ سُنا تو طبیعت بے حد متأثر ہوئی۔ کئی دن تک یہی خیال دل و دماغ میں ضیا پاشی کرتا رہا کہ سنت رسول ﷺ میں کیسی زبردست انقلابی قوت کے خزانے چھپے ہوئے ہیں۔ ہندوستان سے لندن جانے والے نوجوان نے صرف بیٹھ کر پانی پینے کی ایک ہی سنت پر عمل کیا تو اس کی برکت سے نہ صرف وہ خود صراط مستقیم پر چل پڑا بلکہ ایک انگریز لڑکی بھی اسلام کی دولت سے مالا مال ہو گئی۔ اس واقعے سے علمائے حق کے اِس ارشاد کی توثیق و تجدید ہو گئی کہ مسلمانوں کے تمام مصائب اور مکروہات کا واحد علاج یہ ہے کہ وہ اپنے دل کو اللہ رب العزت کی جلوہ گاہ بنائیں اور اپنے اعمال کو قرآن و سنت کی تعلیمات سے مزین کر کے ایسے مخلص اور منور مومن بن جائیں کہ جو غیر مسلم انھیں دیکھے تکتا ہی رہ جائے اور بے ساختہ اسلام پر ایمان لے آئے۔

حق یہ ہے کہ اس مقصد جلیلہ کے لیے ہمارے مکرم علمائے کبار نے نہایت خلوص اور دردمندی سے انتھک کام کیا ہے اور قرآن و حدیث کی تعلیمات عالیہ کی اس قدر مستحسن اور دلنشین تشریح کی ہے کہ صراطِ مستقیم پوری طرح روشن اور بے غبار ہو گئی ہے۔ اب جس شخص کے

دل میں بھی خلوص کی آنچ اور ہمت میں اقدام موجود ہو وہ امام ابن تیمیہ، امام محمد بن عبدالوہاب، شاہ ولی اللہ، سید نذیر حسین محدث دہلوی، نواب صدیق حسن خان، شیخ محمد بن صالح عثیمین، شیخ ابن باز، علامہ ناصر الدین البانی، مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف کا مطالعہ کرے، ان شاء اللہ اس کے قدم ہدایت اور سرفرازی کی راہ پر لگ جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا بڑا کرم ہے کہ جُملہ علمائے حق اور بیدار مغز دانشوروں کی طرح دارالسلام کے محترم مدیر مولانا عبدالمالک مجاہد نے بھی یہ بھید اچھی طرح سمجھ لیا کہ اسلام کی حقانیت، ایمان کی تازگی، مالک الملک کی بندگی، رسالت مآب ﷺ کی پیروی، علم کی پیاس اور تحقیق وجستجو کا ذوق بیدار کرنے کا مؤثر طریقہ یہ ہے کہ ٹھیک ٹھیک قرآن وسنت کی تعلیمات و تشریحات پر مبنی کتابیں عام کردی جائیں تاکہ صحیح فکری تربیت کا نور چمکے، دماغوں سے شرک و بدعت کے مہلک خیالات نکل جائیں اور صحیح، صالح اور صحت مند خیالات کی ترویج ہو۔ یہی وہ عظیم الشان مقصد اور رفعتِ آرزو تھی جس کے لیے انھوں نے دارالسلام جیسے رفیع، عالمی، اشاعتی اور تبلیغی ادارے کی بنیاد رکھی اور اپنے بیش بہا تجربات کا ذخیرہ اس مبارک ادارے کے حوالے کر دیا۔ اس ادارے کے مقاصدِ جلیلہ کے فروغ کے لیے انھوں نے اپنے مخلص اور محنتی رفیقِ کار جناب حافظ عبدالعظیم اسد، دیگر معزز رفقاء اور اجل علماء کے ساتھ مل کر کتنی محنت کی ہے؟ اس کا کچھ اندازہ دارالسلام کی نہایت اہم دینی، علمی، تحقیقی اور فنی لحاظ سے نہایت خوبصورت مطبوعات سے کیا جاسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اہم علوم عظیمہ کے سلسلۂ کتب کی اشاعت کے ساتھ ساتھ محترم مجاہد صاحب مفید عوامی ادب کی تخلیق کے لیے بھی وقت نکال رہے ہیں اور اچھی

سیرت سازی کے لیے آسان اور عام فہم کتابیں لکھ رہے ہیں، یہ کتابیں علم پرور، آگہی بخش سبق آموز اور بہت دلچسپ داستانوں پر مشتمل ہیں۔ زبان و بیان نہایت سادہ اور سلیس ہے، اس لیے ان سے معمولی پڑھے لکھے لوگ بھی خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ کتابیں سنہرے عنوانات (Golden series) کے تحت سلسلہ وار شائع ہو رہی ہیں۔ زندگی ہزار شیوہ نازنین ہے۔ مجاہد صاحب نے زندگی کو بڑے قریب سے دیکھا، پرکھا اور برتا ہے۔ اسی لیے وہ زندگی کے ہر پہلو اور ہر ادا کے بارے میں ایسے پرکشش سچے واقعات یکجا کر رہے ہیں جنھیں پڑھ کر زندگی اور اس کی ذمہ داریوں کے نت نئے افق سامنے آتے ہیں۔

سنہرے اوراق، سنہرے فیصلے، سنہری کرنیں اور سنہرے حروف کے بعد زیر مطالعہ کتاب ''سنہرے نقوش'' اسی عوامی ادب کی نئی کڑی ہے۔ راقم الحروف نے یہ کتاب پڑھی تو حیران رہ گیا۔ باتوں باتوں میں کہانی کے انداز میں کیسے کیسے معارف و بصائر، زمانے اور زندگی کی کتنی اہم اور اٹل حقیقتیں کتنے اچھے اسلوب اور کیسے جچے تلے لفظوں میں بیان کر دی گئی ہیں۔

قرآن اچھے اور منتخب روزگار انسانوں کے نورانی اعمال و احوال کے قصے کتنے سادہ اور دلکش پیرائے میں سناتا ہے اور فرعون و نمرود جیسے مغرور و مردود لوگوں کے افعال و انجام کی حکایات یاد دلا کر کس طرح رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ اسی اسلوب کی جھلکیاں اس کتاب میں بھی جھلملاتی نظر آتی ہیں۔ ایک طرف تو اس میں حضرت سعید بن جبیر اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ جیسے رجال کبار کی سیرت کے جلوے نظر آتے ہیں اور دوسری طرف ایسے سفاک اور بدبخت شخص کا تذکرہ بھی ہے جس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آشوب اور آزمائش میں ان کی اہلیہ محترمہ کو تھپڑ مارا تھا۔ اس ظالم کا انجام پڑھ کر دل لرزنے لگتا ہے۔

مرد مومن کا ایمان پہاڑوں سے زیادہ محکم ہوتا ہے۔ وہ فقط احکام الٰہی کا پابند اور محمد ﷺ کا

پیروکار ہوتا ہے، چاروں طرف سے گردشوں کے طوفان آ جائیں، باطل کے لشکر امڈ پڑیں اور آسمان کی ساری بجلیاں بھی اتر آئیں، تب بھی وہ ایک مردِ مومن کے ایمان کو شکست نہیں دے سکتیں۔ یہ نظارہ دیکھنا ہو تو لشکر اسامہ کی روانگی کے زیرعنوان حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی استقامت ملاحظہ فرمائیے۔ اسلام کا طریق سیاست وحکومت کیا ہے؟ یہ قیمتی سبق سیکھنا ہو تو حضرت عمر بن عبدالعزیز ؒ کے احوال پڑھیے۔ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کتنا عظیم وجلیل اور کتنا اثر آفرین کلام ہے اور جب کوئی مکرم خاتون قرآن کریم کی تلاوت کرتی ہے تو کیسے کیسے انقلابات ظہور میں آتے ہیں؟ یہ کرشمہ دیکھنا ہو تو عالی قدر حضرت عمر اور ان کی گرامی قدر ہمشیرہ فاطمہ بنت خطاب ؓ کا واقعہ پڑھیے۔ ایک مسلمان نوجوان صرف شادی کرنے کے لیے بالغ نہیں ہوتا، اس کا شباب اسلام کی تبلیغ و دعوت اور فتوحاتِ عظیمہ کی امانت بھی ہوتا ہے۔ اس راز کی تفصیل جاننی ہو تو عمیر بن حمام، اسامہ بن زید ؓ اور طارق بن زیاد کی سیرت ملاحظہ فرمائیے۔

فی الجملہ یہ کتاب نیکی اور بدی کے کرداروں کا حیرت انگیز نگار خانہ ہے۔ یہ کردار دل ودماغ کے دریچے کھولتے ہیں، خیالوں میں انقلاب برپا کرتے ہیں، نیکی سے محبت کا سلیقہ سکھاتے ہیں اور بدی سے متنفر کر دیتے ہیں۔ اسی لیے یہ کتاب ہر فرد کی زیادہ سے زیادہ توجہ کی مستحق ہے۔ اللہ رب العزت سے التجا ہے کہ یہ ”سنہرے نقوش“ ہم سب کو سنہرے نفوس بنا دیں۔

احمد کامران

مارچ 2008ء　　(ریسرچ سکالر: دارالسلام لاہور)

تقویٰ کے ثمرات

ایک رات امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب ؓ[1] اپنے خادم کے ساتھ گشت کے لیے نکلے۔ وہ مدینے کی گلیوں میں لوگوں کے حالات معلوم کرنے کے لیے گھومتے پھرتے رہے۔ چلتے چلتے انھیں تھکاوٹ محسوس ہوئی۔ وہ ایک گھر کی دیوار سے ٹیک لگا کر آرام کی غرض سے کھڑے ہو گئے، اتنے میں صبح بھی روشن ہو گئی۔

اس گھر کے اندر سے ایک بوڑھی عورت کی آواز آ رہی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کو دودھ میں

---

[1] حضرت عمر بن خطاب ؓ 583ء میں مکہ میں پیدا ہوئے اور 644ء میں مدینہ منورہ میں جامِ شہادت نوش فرمایا۔ آپ کی کنیت ابو حفص تھی۔ جرأت و بے باکی کا مجسمہ تھے۔ سچی بات علی الاعلان کہہ دیتے تھے۔ آپ ساڑھے دس سال منصب خلافت پر مامور رہے۔ اسلام کی تبلیغ و اشاعت آپ کے عہد کا زریں کارنامہ ہے۔ آپ اسلام کے اتنے بڑے جرنیل تھے کہ آپ نے اپنے عہد کی دو عظیم سلطنتوں ایران اور روم کو شکست فاش دے کر اسلام کا پرچم دور دور تک لہرا دیا آپ کی صفات و حسنات بے پایاں ہیں۔ ان کے تذکرے کے لیے ایک ضخیم کتاب بھی ناکافی ہے۔ اعمال بدل جانے سے نتائج بھی بدل جاتے ہیں۔ حضرت عمر ایمان اور حسنِ عمل کی جس معراج پر تھے اُس کا نتیجہ یہ تھا کہ ساری دُنیا کی باطل قوتیں ان کے آگے سرنگوں ہو گئیں۔ آج ہم اللہ تعالیٰ کے احکام اور رسول اللہ ﷺ کی مبارک سنتوں کو چھوڑ کر ذلت و ہلاکت کی جس انتہا کو پہنچ گئے ہیں، وہ سراسر ہمارے کرتوتوں کا نتیجہ ہے۔ اس میں کسی دوسرے کا کیا قصور؟

؎ یوں ہنسی آتی ہے مجھ کو حضرتِ انسان پر
کارِ بد تو خود کرے لعنت کرے شیطان پر!

پانی ملانے کا حکم دے رہی تھی لیکن لڑکی ماں کے اس حکم کی تعمیل سے انکار کر رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ امیر المومنین نے دودھ میں پانی ملانے سے منع کیا ہوا ہے اور بذریعہ منادی اس کا اعلان بھی کرا دیا ہے۔

ماں نے بیٹی سے کہا: کیا اس وقت عمر تمھیں دیکھ رہا ہے جو تم اس سے ڈر رہی ہو؟

لڑکی نے جواب دیا:

وَإِنْ لَّمْ يَكُنْ عُمَرُ يَرَانَا فَإِنَّ رَبَّ عُمَرَ يَرَانَا

”اگر عمر ہمیں نہیں دیکھ رہا تو کیا ہوا‘ عمر کا رب تو یقیناً ہمیں دیکھ رہا ہے۔“

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اس نوجوان لڑکی کی دینداری و امانت داری سے بہت مسرور اور متاثر ہوئے۔ غلام سے فرمایا کہ اس گھر کو نظر میں رکھو۔ دن چڑھے اس لڑکی کے بارے میں پوچھا، لوگوں نے بتایا کہ وہ سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ کی بیٹی ام عمارہ ہے۔ جب یہ معلوم ہوا کہ وہ ابھی کنواری ہے تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے تمام بیٹوں کو بلوایا اور پوچھا کہ تم میں سے کون اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے؟

ان کے بیٹے عاصم کہنے لگے کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں، چنانچہ ان کے لیے امیر المومنین نے اس لڑکی کا رشتہ مانگ لیا اور عاصم کی شادی اس نیک بخت لڑکی سے ہو گئی۔ عاصم کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی۔ اُس کا نام ام عاصم رکھا گیا، یہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی پوتی تھیں، جب سن بلوغت کو پہنچیں تو ان کی شادی مروان بن حکم کے بیٹے عبدالعزیز سے ہوئی۔ اب ام عاصم کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا، اس کا نام انھوں نے اپنے دادا کے نام پر عمر رکھا۔ یہ وہی عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ ہیں جو خلیفۃ المسلمین بنے جنھیں پانچواں خلیفۂ راشد بھی کہا جاتا ہے کیونکہ ان کے دور میں اسلام کا شباب لوٹ آیا تھا۔ یہ ثمرہ تھا ایک نیک اور متقی

لڑکی کی خدا خوفی کا...... ۔[1]

عمر بن عبدالعزیز ؒ کے عہد (99ھ تا 101ھ) میں بنو امیہ نے اپنی ناجائز جائیدادیں ضبط ہونے سے بچانے کے لیے ان کی پھوپھی فاطمہ بنت مروان کو سفارشی بنا کر ان کے پاس بھیجا، انھوں نے پھوپھی کو سمجھا بجھا کر واپس کر دیا۔ فاطمہ نے واپس آ کر بنو امیہ سے کہا: ''تم نے فاروق اعظم ؓ کی پوتی سے رشتہ کیا تھا، لہٰذا وہی فاروقی رنگ اُن کی اولاد میں بھی موجود ہے۔''

---

[1] یہ واقعہ تاریخ کی متعدد کتابوں میں مذکور و معروف ہے۔ دیکھیے تاریخ عمر بن خطاب ؓ، تالیف: علامہ ابن جوزی (104)

پروردگار کے فیصلے کا خیر مقدم

بنی اسرائیل میں ایک عبادت گزار تھا۔ اُس نے پہاڑ کی کھوہ میں اپنا مسکن بنا رکھا تھا۔ وہ لوگوں کی آنکھوں سے اوجھل تھا، لوگ بھی اس کی نظروں سے دور تھے۔ اس کے قریب پانی کا ایک چشمہ تھا جس سے وہ وضو کرتا، اپنی تشنگی دور کرتا اور نباتات سے اپنی غذا حاصل کرتا تھا۔ دن کو روزے سے رہتا اور رات اللہ کی عبادت میں گزارتا۔ اس کا ہر پل اور ہر لمحہ اطاعت و بندگی کی نذر ہوتا تھا، چنانچہ سعادت و کامرانی کے آثار اس کے چہرے سے نمایاں تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس عبادت گزار کی خبر ہوئی تو آپ ایک دن اس کے پاس پہنچے لیکن اسے نماز اور ذکر اذکار میں مشغول دیکھ کر واپس چلے گئے، پھر رات کو اس کے پاس گئے تو اسے عزیز و غفار رب العالمین کے دربار میں سرگوشی و مناجات میں مگن پایا۔

موسیٰ علیہ السلام نے اسے سلام کیا اور فرمایا: جناب والا! اپنے آپ پر نرمی کیجیے۔

عبادت گزار: اے اللہ کے نبی! مجھے خدشہ ہے مبادا اچانک غفلت میں انتقال کر جاؤں اور اپنے پروردگار کے حضور مجھ سے کوئی کوتاہی ہو جائے۔

موسیٰ علیہ السلام: کیا آپ کو کوئی حاجت ہے؟

عبادت گزار: آپ میرے لیے پروردگار سے اس کی رضا و خوشنودی کی دعا کر دیں اور میری یہ التجا بھی پہنچا دیں کہ وہ مجھے زندگی بھر صرف اپنی ہی خوشنودی

کے کاموں میں مشغول رکھے حتیٰ کہ میں اس سے جاملوں۔

موسیٰ علیہ السلام دعا و مناجات میں مشغول ہو گئے اور اپنے مولیٰ سے لذتِ کلام میں اس قدر ڈوب گئے کہ عبادت گزار کی باتیں یاد ہی نہ رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا: آپ سے میرے عبادت گزار بندے نے کیا کہا تھا؟

موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: میرے پروردگار! تو ہی زیادہ جانتا ہے۔ اس نے تیری رضا و خوشنودی طلب کی ہے اور یہ درخواست بھی کی ہے کہ اس کی زندگی تیری ہی یاد میں گزرے حتیٰ کہ وہ تیرے دربار میں حاضر ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: اے موسیٰ! اس عبادت گزار کے پاس جائیے اور کہیے کہ رات دن جتنی عبادت چاہے کر لے لیکن ہے وہ بہر حال جہنمی کیونکہ میرے صحیفے میں اُس کا نام گناہ گاروں کی فہرست میں درج ہے۔

موسیٰ علیہ السلام جب اس عابد کے پاس گئے اور پروردگار کے فیصلے سے اسے آگاہ کیا تو عابد نے کہا: سبحان اللہ! میں اپنے پروردگار کے فیصلے کو خوش آمدید کہتا ہوں، ہر چیز میرے پروردگار کے فیصلے کے مطابق رواں دواں ہے۔ اس کے حکم کو کوئی ٹال نہیں سکتا اور اس کے فیصلے کو کوئی روک نہیں سکتا۔ یہ کہہ کر وہ عبادت گزار زور زور سے گریہ وزاری کرنے لگا...... پھر کچھ دیر کے بعد بولا:

اے موسیٰ! میرے پروردگار کے جاہ و جلال اور عزت و شان کی قسم! میں اس کے در سے پلٹنے والا نہیں اور اس فیصلے کو سن کر ہرگز مایوس نہیں بلکہ اب اپنے پروردگار سے میری محبت دوبالا ہو گئی ہے۔

اس کے بعد جب موسیٰ علیہ السلام دوبارہ اپنے پروردگار سے دعا و مناجات میں مشغول ہوئے

تو عرض کیا: میرے رب! جو کچھ تیرے عبادت گزار بندے نے کہا ہے اس سے تو اچھی طرح واقف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! میرے اس بندے کو یہ خوشخبری سنا دیجیے کہ وہ جنتی ہے۔ میری رحمت نے اسے جالیا۔ اُسے یہ بھی بتا دیجیے کہ اس نے میرا یہ خوش کن فیصلہ اپنے صبر و رضا کے عوض حاصل کیا ہے کیونکہ میرا سابقہ کڑوا فیصلہ سن کر بھی وہ چیں بہ جبیں نہ ہوا تھا۔ اگر وہ آسمان و زمین بھر گناہ بھی ساتھ لائے تب بھی میں اسے بخش دوں گا، میں کریم اور غفار ہوں۔

جب موسیٰ علیہ السلام نے یہ خوشخبری اس عبادت گزار کو سنائی تو وہ سجدے میں گر گیا، پروردگار کی حمد و ثنا کرنے لگا اور زبانِ حال سے کہنے لگا:

سب کے دل میں ہے جگہ میری جو تُو راضی ہُوا
مجھ پہ گویا اِک زمانہ مہرباں ہو جائے گا!

پھر اس طویل سجدے ہی میں اُس نے اپنی جان جاں آفریں کے حوالے کر دی۔

راہ اخلاص و وفا میں جانوں کا نذرانہ

حضرت صہیب رُومی رضی اللہ عنہ [1] کا بیان ہے، رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم سے پہلے لوگوں میں ایک بادشاہ تھا، اُس کے پاس ایک جادوگر تھا۔ وہ جادوگر بوڑھا ہو گیا، اس نے بادشاہ سے عرض کیا: بادشاہ سلامت! میری عمر اب بڑھاپے کی سرحد پار کرنے والی ہے، اس لیے کوئی لڑکا میری خدمت میں بھیجیں تا کہ اسے اپنا فن سکھلا دوں (تا کہ وہ میری وفات کے بعد میرا قائم مقام ہو سکے)۔

بادشاہ نے جادوگر کے ہاں جادوگری سیکھنے کے لیے ایک لڑکا روانہ کر دیا۔ راستے میں ایک راہب تھا، وہ راہب کے پاس بیٹھ گیا اور اس کا کلام سنا۔ راہب کی بات اسے بڑی بھلی معلوم ہوئی۔ اس کے بعد جب لڑکا جادوگر کے پاس جاتا تو جاتے جاتے اس راہب کی خدمت میں بھی حاضری دیتا اور کچھ دیر کے لیے بیٹھا رہتا (اس وجہ سے جادوگر کے پاس پہنچنے میں تاخیر ہو جاتی تھی۔) جب وہ جادوگر کے پاس پہنچتا تو اس کی پٹائی ہوتی تھی۔ لڑکے نے اس بات کی شکایت راہب سے کی تو اس نے یہ ترکیب بتائی کہ اگر جادوگر کی مار کا خوف ہو تو اس سے کہہ دینا کہ گھر والوں نے مجھے روک رکھا تھا اور جب گھر والوں کا

---

[1] یہ جلیل القدر صحابی حضرت صہیب بن سنان بن مالک رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ کی والدہ بنی مالک بن عمرو بن تمیم سے ہیں آپ کے والد اور چچا کسریٰ کی طرف سے اُبلّہ کے حاکم تھے۔ ...... انھیں صہیب رومی اس لیے کہا جاتا ہے کہ رومیوں نے آپ کو بچپن میں قید کر لیا تھا۔ آخر کار صہیب کو بنو کلب کے ایک شخص نے خرید کر مکہ میں عبداللہ بن جدعان کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ آپ اُن کمزور ترین مسلمانوں کی صف میں تھے جنھیں اللہ کی راہ میں بے حد ظلم و ستم سہنا پڑا۔ آپ نے حضرت علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ کے ساتھ مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ غزوۂ بدر اور دیگر غزوات میں شریک رہے۔ ◄◄

خوف ہو تو یہ بہانہ کر دینا کہ جادوگر نے روک لیا تھا۔

اُس کے لیل و نہار اسی معمول کے مطابق گزر رہے تھے کہ ایک دن راستے میں ایک بھاری بھرکم جانور پر اس کی نگاہ پڑی جس نے لوگوں کی آمدورفت میں رکاوٹ ڈال رکھی تھی۔

لڑکے نے اپنے دل میں کہا: آج میں جان لوں گا کہ جادوگر حق پر ہے یا راہب۔

پھر لڑکے نے ایک پتھر لے کر کہا: اے اللہ! اگر جادوگر کے مقابلے میں راہب کا طریقہ تجھے محبوب ہے تو اس جانور کو مار دے (یہ کہہ کر جانور کو پتھر دے مارا)، اللہ کے حکم سے وہ بھاری بھرکم جانور وہیں ڈھیر ہو گیا۔

جب وہ لڑکا راہب کے پاس پہنچا اور اسے حقیقتِ حال سے آگاہ کیا تو اس نے کہا: اے بچے! اب تو مجھ سے افضل ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تیرا معاملہ حد کو پہنچ چکا۔ عنقریب تجھے ابتلا و آزمائش کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اگر تجھے آزمائش میں ڈالا گیا تو میرا پتہ نہ بتلانا۔

پھر یہ حال ہو گیا کہ وہ لڑکا اللہ کے حکم سے پیدائشی اندھوں کو ٹھیک کرنے لگا، برص کی بیماری والے بھی اس کے علاج سے شفایاب ہونے لگے، اس کے علاوہ بھی وہ ہر قسم کی بیماریوں کا علاج معالجہ کرنے لگا۔ اسی دوران میں بادشاہ کے ایک خاص آدمی کو جو اندھا تھا، لڑکے کے کمالات معلوم ہوئے تو وہ بھی بہت سے تحائف لے کر لڑکے کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا: اگر تو نے مجھے شفایاب کر دیا تو میں یہ جو کچھ لایا ہوں تجھے دے دوں گا۔

لڑکے نے کہا: میں کسی کو شفایاب نہیں کرتا بلکہ شفا عنایت کرنا تو اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔

» حضرت عمر بن خطاب ؓ کو جب شہید کیا گیا تو انھوں نے شدید زخمی حالت میں وصیت کی کہ ان کی نمازِ جنازہ صہیب ؓ پڑھائیں اور جب تک مسلمانوں کا کوئی خلیفہ مقرر نہ ہو، ان کی امامت بھی یہی کراتے رہیں۔ حضرت صہیب ؓ کی وفات ستر (70) سال کی عمر میں شوال 38ھ میں ہوئی۔

اگر تو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے تو میں اللہ تعالیٰ سے تیرے لیے دعا کروں گا، ممکن ہے وہ تجھے شفا دے دے۔

وہ آدمی اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے بینائی بخش دی۔

پھر وہ آدمی بادشاہ کی خدمت میں پہنچا اور حسبِ معمول اس کے پاس بیٹھ گیا۔

بادشاہ نے پوچھا: تیری بینائی کس نے بحال کر دی؟

اس نے جواب دیا: میرے پروردگار نے۔

بادشاہ طیش میں آ کر بولا: کیا میرے سوا بھی تیرا کوئی رب ہے؟

اس نے ڈٹ کر کہا: میرا اور تیرا رب صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

یہ سُن کر بادشاہ بھڑک اُٹھا اور اس آدمی کو مسلسل دردناک سزائیں دیتا رہا یہاں تک کہ اس نے عاجز آ کر لڑکے کا پتہ بتا دیا۔ اب بادشاہ نے اُس لڑکے کو بُلوا بھیجا۔

لڑکا حاضر ہوا تو بادشاہ نے کہا: ارے واہ! تیری جادوگری کا فن اس قدر کامیاب ہو گیا کہ تو نابیناؤں کو بینائی عطا کرتا ہے اور برص کے مریضوں کو ٹھیک کر دیتا ہے۔ اور ساری بیماریاں تیرے علاج سے ٹھیک ہو جاتی ہیں۔

لڑکے نے کہا: بادشاہ سلامت! میں اپنی طرف سے کسی کو شفا نہیں دیتا بلکہ اللہ تعالیٰ ہی مریضوں کو شفایاب فرماتا ہے۔

چنانچہ بادشاہ نے اسے بھی قید کر دیا اور طرح طرح کی سزائیں دینی شروع کر دیں یہاں تک کہ لڑکے نے راہب کا پتہ بتا دیا۔

راہب کو پکڑ کر لایا گیا اور اسے اپنے دین سے منحرف ہونے کا حکم دیا گیا لیکن اس نے صاف انکار کر دیا، اس کے لیے ایک آرا لایا گیا اور اسے راہب کے سر کی مانگ پر رکھ کر

چلا دیا گیا جس سے اس کے جسم کے دو ٹکڑے ہو گئے۔

پھر بادشاہ کا وہ خاص آدمی لایا گیا جسے بینائی مل گئی تھی۔ اُسے بھی اپنا دین چھوڑنے کو کہا گیا لیکن اس نے بھی انکار کر دیا، چنانچہ اس کی مانگ پر بھی آرا چلا دیا گیا جس سے اس کا وجود کٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔

پھر وہ لڑکا پیش ہوا اس سے بھی اپنا عقیدہ ترک کرنے کا مطالبہ کیا گیا لیکن اس نے بھی اپنا دین چھوڑنے سے انکار کر دیا۔

بادشاہ نے اس لڑکے کو اپنے سپاہیوں کی ایک ٹولی کے حوالے کر دیا اور حکم دیا: اسے فلاں پہاڑ پر لے جاؤ اور پہاڑ کی چوٹی پر پہنچنے کے بعد اسے اپنا دین چھوڑنے کو کہو۔ اگر یہ اپنا دین ترک کر دے تو ٹھیک ہے ورنہ وہیں سے اسے دھکا دے کر نیچے پھینک دو۔

سپاہی لڑکے کو لے کر پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے۔ لڑکے نے دعا کی: الٰہی! تو ہی کارساز ہے، ان لوگوں سے نپٹ لے، چنانچہ پہاڑ ڈگمگانے لگا، سارے سپاہی گر کر ہلاک ہو گئے اور لڑکا صحیح سلامت واپس بادشاہ کے دربار میں پہنچ گیا۔

لڑکے کو دربار میں دیکھ کر بادشاہ بہت حیران ہوا، اُس نے پوچھا: تیرے ساتھ جانے والے سپاہیوں کو کیا ہوا؟

لڑکے نے جواب دیا: اللہ تعالیٰ نے میری کفالت فرمائی اور انھیں تباہ کر کے مجھے نجات عطا فرمائی۔

بادشاہ نے لڑکے کو دوبارہ اپنے مصاحبین کی ایک جماعت کے حوالے کر دیا اور حکم دیا: اسے کشتی میں سوار کر کے عین سمندر کے بیچ لے جاؤ۔ اگر یہ اپنے دین سے باز آ جائے تو ٹھیک ہے ورنہ اسے سمندر میں غرق کر دو۔

یہ جماعت لڑکے کو لے کر جب بیچ سمندر پہنچی تو لڑکے نے دعا کی: الٰہی! تو ہی بے نواؤں کا سہارا ہے، میری طرف سے ان سے نمٹ لے۔ یہ دعا کرنا تھی کہ کشتی الٹ گئی اور بادشاہ کے حواریوں کی پوری جماعت ڈوب گئی مگر لڑکا بادشاہ کے دربار میں صحیح سلامت واپس پہنچ گیا۔

بادشاہ نے چونک کر لڑکے سے پوچھا: تیرے ساتھ بھیجی گئی جماعت کا کیا ہوا؟

لڑکے نے جواب دیا: اللہ تعالیٰ نے میری طرف سے ان سے نمٹ لیا۔

پھر لڑکے نے بادشاہ سے کہا:

اے بادشاہ! تو مجھے ہرگز قتل نہیں کر سکے گا۔ مجھے قتل کرنے کا ایک ہی راستہ ہے۔

بادشاہ نے پوچھا: وہ کیا ہے؟

لڑکے نے بتایا: لوگوں کو ایک کھلے میدان میں جمع کرو، کھجور کے تنے پر مجھے سولی پر لٹکا دو۔ پھر میرے ترکش سے ایک تیر کھینچ لو اور اسے کمان کے بیچ میں رکھ کر یوں کہو:

بِسْمِ اللّٰهِ رَبِّ الْغُلَامِ

"اس لڑکے کے رب اللہ کے نام سے تیر چلاتا ہوں۔"

پھر مجھے نشانہ بناؤ۔ جب ایسا کرو گے تو مجھے قتل کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔

چنانچہ بادشاہ نے لوگوں کو ایک کھلے میدان میں جمع کیا، لڑکے کو کھجور کے تنے پر لٹکا دیا، پھر اس کے ترکش سے ایک تیر کھینچا اور اسے کمان میں رکھ کر کہا:

بِسْمِ اللّٰهِ رَبِّ الْغُلَامِ

پھر نشانہ لے کر تیر چھوڑا تو وہ لڑکے کی کنپٹی پر جا لگا۔ لڑکے نے کنپٹی پر وہاں ہاتھ رکھا

جہاں تیر لگا تھا، پھر وہ مر گیا۔ لوگ یہ ماجرا دیکھ کر رب کائنات کی حقیقت اور الٰہ واحد کی توحید سمجھ گئے اور بے اختیار پکار اٹھے:

آمَنَّا بِرَبِّ الْغُلَامِ، آمَنَّا بِرَبِّ الْغُلَامِ، آمَنَّا بِرَبِّ الْغُلَامِ

ہم اس لڑکے کے رب پر ایمان لائے۔ ہم اس لڑکے کے رب پر ایمان لائے۔ ہم اس لڑکے کے رب پر ایمان لائے۔

لوگوں نے بادشاہ سے کہا: ''آپ جس چیز سے ڈرتے تھے، اللہ کی قسم وہ ہو کر رہا اور آپ کے سامنے آ گیا۔ اب سب لوگ اللہ پر ایمان لے آئے ہیں۔''

بادشاہ طیش میں آ گیا، اس نے حکم دیا کہ سڑکوں کے کنارے خندقیں کھودی جائیں۔ اس کے حکم کی تعمیل میں خندقیں کھودی گئیں اور ان میں آگ بھڑکا دی گئی۔

بادشاہ نے حکم دیا: ''جو اپنے دین سے نہ پھرے اسے اس آگ میں جھونک دو یا اس سے کہو: آگ میں کود پڑو!''

انھوں نے ایسا ہی کیا حتیٰ کہ ایک عورت آئی اُس کے ہاتھوں میں ایک بچہ تھا، وہ آگ میں گرنے سے جھجکی تو بچے نے کہا: ''اماں! صبر کر یقیناً تو حق پر ہے۔''[1]

اسی واقعے کے پس منظر میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانِ عالی شان ہے:

﴿ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۙ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۙ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ؕ قُتِلَ اَصْحٰبُ
الْاُخْدُوْدِ ۙ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۙ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۙ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ
شُهُوْدٌ ؕ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴾

---

[1] صحیح مسلم، حدیث:3005.

”بُرجوں والے آسمان کی قسم! اور اس دن کی (قسم) جس کا وعدہ کیا گیا اور حاضر ہونے والے کی اور حاضر کیے گئے کی (قسم)۔ ہلاک کیے گئے ایندھن بھری آگ کی خندقوں والے۔ جبکہ وہ ان خندقوں کے کنارے بیٹھے تھے۔ اور جو کچھ وہ مومنوں کے ساتھ کر رہے تھے، اسے دیکھ رہے تھے۔ اور انھیں ان (مومنوں) کا یہی کام برا معلوم ہوا کہ وہ غالب و بالا، قابلِ تعریف اللہ پر ایمان لے آئے تھے۔ وہ ذات کہ اسی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے اور اللہ ہر چیز پر شاہد ہے۔“[1]

چنانچہ خاتون نے بے دھڑک آگ میں چھلانگ لگا دی۔ اس بادشاہ کا نام ذونواس تھا۔ اور علامہ ابن کثیر اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس ظالم اور متعصب بادشاہ نے صبح سے دوپہر تک بیس ہزار مؤمنین صادقین کو کھائیوں میں گرا کر شہید کر دیا۔

---

[1] البروج 85:1-9. واقعہ کی تفصیل کے لیے کتب تفسیر ملاحظہ فرمائیں جبکہ یہ حدیث صحیح مسلم میں 3005 پر موجود ہے۔

مرقدِ نبوی کے خلاف گھناؤنی سازش

خلافتِ عباسیہ اپنی حکمرانی کی آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ اسلامی ریاستیں تقسیم ہو رہی تھیں اور ان کے باشندوں میں باہمی تنافس اور افتراق و انتشار کا زہر پھیل رہا تھا۔ گروہی اختلافات ان کی جڑیں گھن کی طرح کھائے جا رہے تھے۔ اُدھر یورپی عیسائیوں نے بیت المقدس اور شام و فلسطین کے ساحلی علاقوں پر قبضہ کر کے ملّتِ اسلامیہ کو بدترین بحران سے دوچار کر دیا تھا۔ اس پر آشوب زمانے میں ایک بہت تشویش ناک حادثہ رونما ہوا جس نے مسلم دنیا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ 557ھ میں عیسائیوں نے اپنی ایک خفیہ مجلس میں متفقہ فیصلہ کیا کہ رسولِ اکرم ﷺ کی قبر مبارک سے آپ کا جسدِ اطہر نکال کر اپنے قبضے میں لے لیا جائے، چنانچہ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انھوں نے اپنے دو آدمی منتخب کیے اور انھیں مدینہ منورہ روانہ کر دیا تاکہ وہ رسولِ اکرم ﷺ کا جسم مبارک نکال لائیں اور اس طرح ان کی ناپاک سازش کامیاب ہو جائے۔ وہ دونوں آدمی مدینہ منورہ پہنچے۔ انھوں نے مدینہ کے باشندوں کے سامنے اپنے بارے میں یہ ظاہر کیا کہ ہم مغربی ہیں اور ہمارا تعلق اندلس سے ہے۔ یہ دونوں مسجد نبوی سے باہر قبلے کی جانب آلِ عمر کی رہائش گاہ کے نزدیک ٹھہرے جہاں سے رسولِ اکرم ﷺ کی قبر شریف قریب تھی۔ وہ رہائش گاہ ”دیارِ عشرہ“ کے نام سے مشہور تھی۔ جب مسجد نبوی کی توسیع کی گئی تو مسجد نبوی کے اردگرد کے

مکانات اس کی زد میں آ گئے اور تمام مکانوں کے نشانات مٹا دیے گئے۔

یہ دونوں نصرانی بظاہر وہاں نیکی اور بھلائی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے، نماز پابندی سے ادا کرتے، قبرستان بقیع اور رسولِ اکرم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت التزام کے ساتھ کرتے تھے۔ اس طرح انھوں نے اپنے آپ کو نہایت نیک، پرہیزگار اور اصحابِ خیر کی حیثیت سے متعارف کرالیا۔ لیکن اندر ہی اندر وہ اپنی ناپاک سازش کی تکمیل کے لیے کوشاں تھے، جب ان کے اردگرد بالکل سکون ہو جاتا اور لوگ اپنی اپنی ضروریات میں مشغول ہو جاتے یا جب رات ڈھلتی اور سب لوگ نیند کی آغوش میں چلے جاتے تو یہ دونوں نصرانی اپنے ناپاک مقصد کی تکمیل میں لگ جاتے۔

اصل بات یہ تھی کہ یہ دونوں نصرانی اپنے رہائشی مقام پر خفیہ طور پر ایک سرنگ کھود رہے تھے جس کا رُخ قبرِ نبوی کی طرف تھا۔ سرنگ کی کھدائی سے جو مٹی نکلتی، یہ دونوں وہ مٹی تھوڑی تھوڑی کر کے کبھی اپنے قریبی کنویں میں ڈال دیتے تھے اور کبھی چمڑے کی تھیلی میں بھر کر قبرستان بقیع میں پھینک آتے تھے اور لوگوں کے سامنے یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ بقیع کی زیارت کو جا رہے ہیں۔

یہ دونوں اپنی گھناؤنی سازش کی تکمیل کے لیے ایک مدت تک لوگوں کی آنکھوں میں دُھول جھونکتے رہے اور اپنا مذموم کام اپنے پروگرام کے مطابق مسلسل انجام دیتے رہے۔ جب انھیں یقین ہو گیا کہ وہ اب رسولِ اکرم ﷺ کی قبرِ مبارک کے قریب پہنچ چکے ہیں اور مقصد حاصل ہونے والا ہے تو انھیں یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ جسدِ اطہر کو کس طرح نکالا اور منتقل کیا جائے، چنانچہ وہ رسولِ اکرم ﷺ کا جسدِ اطہر اپنے ساتھ لے جانے کے لیے خفیہ پلان بنانے لگے۔ انھیں یقین ہو چلا تھا کہ اب بہت جلد اُن کی ناپاک سازش کامیاب

ہونے والی ہے۔

لیکن اللہ رب العالمین ان کی گھات میں تھا اور انھیں ذلیل ورسوا کرنے اور ان کی ناپاک منصوبہ بندی کا پول کھولنے کے لیے غضبِ الٰہی کے شعلے ان کے سروں پر لپک رہے تھے۔ ٹھیک انھی دنوں سلطان نور الدین محمود زنگی[1] نے خواب میں نبیٔ کریم ﷺ کی زیارت کی اور دیکھا کہ آپ ﷺ دو بھورے رنگ کے آدمیوں کی طرف اشارہ کر کے فرما رہے ہیں:

يَا مَحْمُودُ! أَنْقِذْنِي مِنْ هٰذَيْنِ

”اے محمود! مجھے ان دو (ظالموں) سے بچاؤ۔“

نور الدین زنگی گھبرا کر اٹھا اور نماز پڑھ کر پھر سو گیا۔ لیکن لگاتار تین مرتبہ اس نے بعینہٖ یہی خواب دیکھا۔ تیسری مرتبہ جب خواب سے بیدار ہوا تو اپنے وزیر جمال الدین موصلی کو طلب کیا۔ یہ وزیر نہایت عقل مند، ہوشیار، دین دار اور تقویٰ شعار تھا۔ نور الدین زنگی نے اُسے اپنا خواب تفصیل سے سنا دیا۔ جمال الدین موصلی نے بادشاہ سلامت سے کہا:

هٰذَا أَمْرٌ حَدَثَ بِالْمَدِينَةِ الْمُنَوَّرَةِ، اُخْرُجِ الْآنَ لِلْمَدِينَةِ النَّبَوِيَّةِ وَاكْتُمْ مَا رَأَيْتَ

---

[1] یہ سلطان عادل عماد الدین زنگی کا بیٹا تھا جو 541ھ/1146ء میں تخت نشین ہوا۔ اس نے دوسری صلیبی جنگ (1147-49ء) میں عیسائیوں کو بار بار شکست دی۔ بغداد کے عباسی خلیفہ نے اسے سلطان کا خطاب اور سندِ حکومت دی۔ اس نے اپنے سپہ سالار شیرکوہ اور اس کے بھتیجے صلاح الدین کو 569ھ/1173ء میں مصر بھیجا اور ان کی کاوش سے مصر اس کی قلمرو میں شامل ہو گیا۔ اس کے چند روز بعد نور الدین زنگی کا انتقال ہو گیا، پھر اس کے جانشین صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس کو صلیبیوں کے پنجے سے چھڑایا۔ (تاریخ اسلام از اکبر شاہ خاں نجیب آبادی: 2/416-417 أطلس التاريخ العربي الإسلامي.)

"یہ حادثہ مدینہ منورہ میں رونما ہو چکا ہے، فوراً مدینہ طیبہ روانہ ہو جائیے اور جو کچھ آپ نے خواب میں دیکھا ہے اسے صیغۂ راز میں رکھیے۔"

سلطان نور الدین زنگی نے رات کے بقیہ حصے میں مدینہ منورہ روانگی کی تیاری کی اور بیس آدمیوں کی نگرانی میں بہت سے اونٹ لے کر روانہ ہو گیا۔ سلطان کے ساتھ اس کا وزیر جمال الدین موصلی بھی تھا جو بہت سا مال و متاع بھی ساتھ لے جا رہا تھا۔ بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ سلطان کے ساتھ اس سفر میں ایک ہزار اونٹ تھے، گھوڑے اور دیگر سواریاں ان پر مستزاد تھے۔

شام سے مدینہ کا یہ سفر سولہ دن میں طے ہوا۔ مدینہ پہنچ کر سلطان نے مسجد نبوی کے اندر ریاض الجنہ میں نماز ادا کی اور قبر نبوی کی زیارت کے بعد وہیں بیٹھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ اتنے میں وزیر جمال الدین نے سلطان سے پوچھا: آپ نے جن دو آدمیوں کو خواب میں دیکھا تھا، کیا آپ ان کی شناخت کر سکتے ہیں؟ سلطان نے کہا: ہاں۔ وزیر نے مسجد نبوی میں موجود باشندگانِ مدینہ سے کہا: سلطان نور الدین زنگی آپ حضرات کے روبرو تشریف فرما ہیں، ان کے پاس صدقے کے بہت سارے اموال ہیں، آپ لوگ اپنا اپنا حصہ ابھی لے لیں اور جو افراد نہیں آ سکے انھیں یہاں لے آئیں تا کہ وہ بھی اپنا حصہ لے جائیں۔

محتاج حاضر ہوئے اور اموال تقسیم ہونے لگے۔ سلطان حاضرین کا بغور معاینہ کر رہا تھا لیکن ان میں سے کوئی شخص ان دو آدمیوں کی شکل و شباہت سے ملتا جلتا نہ تھا جنھیں اس نے خواب میں دیکھا تھا، اس لیے سلطان نے پوچھا: کیا کوئی اور ایسا شخص باقی رہ گیا ہے جو مال لینے حاضر نہیں ہو سکا؟ لوگوں نے جواب دیا: کوئی باقی نہیں رہا، البتہ دو مغربی آدمی ہیں۔ وہ

کسی سے کوئی چیز نہیں لیتے ، وہ بہت نیک اور پارسا لوگ ہیں۔ سلطان نے حکم دیا: ان دونوں کو میرے پاس لاؤ!

لوگوں نے جب ان دونوں کو حاضر کیا تو سلطان دیکھتے ہی پہچان گیا کہ یہی وہ دو آدمی ہیں جن کی طرف رسولِ اکرم ﷺ نے خواب میں اشارہ فرمایا تھا۔

سلطان نے ان دونوں سے دریافت کیا: تم کہاں کے رہنے والے ہو؟

انھوں نے جواب دیا: ہم مغرب (اندلس) کے ہیں۔ حج کی نیت سے آئے تھے اور اس سال مسجد نبوی کے قریب رہنے کا ارادہ ہے۔

سلطان نے کہا: سچ سچ بتلاؤ کہ تم کس نیت سے آئے ہو؟

سلطان نے ان دونوں سے بار بار اصرار کے ساتھ اصل حقیقت سے آگاہی کی بہت کوشش کی لیکن وہ ہر بار ایک ہی بات دہراتے رہے۔ سلطان نے انھیں وہیں چھوڑ دیا اور اہلِ مدینہ کے چند لوگوں کے ساتھ ان دونوں مغربی آدمیوں کی رہائش گاہ پر پہنچا۔ وہاں لوگوں نے دیکھا کہ بہت سارا مال موجود ہے اور دیوار سے لگی پرچھتی (Cornice) پر قرآن پاک کے دو نسخے اور چند کتابیں رکھی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی اور چیز ان کی رہائش گاہ میں نہیں تھی۔

سلطان اس رہائش گاہ کا اچھی طرح معاینہ کرنے لگا اور چاروں طرف گھومنے لگا۔ اللہ تعالیٰ نے سلطان کو الہام کیا اور اس نے اچانک رہائش گاہ میں بچھا ہوا قالین اُٹھا کر دیکھا۔ قالین کے نیچے لکڑی کا ایک تختہ تھا۔ جب تختہ اٹھایا تو اس کے نیچے ایک کُھدی ہوئی سُرنگ نظر آئی جو سیدھی قبر نبوی کی طرف جا رہی تھی اور مسجدِ نبوی کی دیوار کی حد پار کر چکی تھی۔ باشندگانِ مدینہ نے جب یہ منظر دیکھا تو ان پر دہشت طاری ہوگئی اور وہ گھبرا گئے کیونکہ ان

دونوں مغربی شخصوں کے بارے میں ان کا اعتقاد بہت اچھا تھا اور وہ اُنھیں تقویٰ و پرہیز گاری کا مرقع سمجھتے تھے۔

سلطان نے ان دونوں مجرموں کی پٹائی کی تو انھوں نے اقبالِ جُرم کر لیا اور بتایا کہ عیسائی بادشاہوں نے بھاری مال و دولت دینے کا وعدہ کر کے ہمیں مغربی حجاج کے بھیس میں یہاں بھیجا ہے تا کہ ہم محمد (ﷺ) کی قبر کھود کر کسی طرح ان کا جسدِ اطہر نکال لے جائیں اور اسے مسیحی بادشاہوں کے حوالے کر دیں۔

جب ان مجرموں کی حقیقت بے نقاب ہو کر منظر عام پر آ گئی اور انھوں نے ساری سازش اگل دی تو سلطان نے حجرۂ شریف کی مشرقی جالی کے پاس ان کی گردن مارنے کا حکم دیا، چنانچہ سرِ عام ان کی گردن اُڑا دی گئی اور شام کے وقت انھیں آگ میں جلا دیا گیا۔

پھر سلطان نے حکم دیا کہ حجرۂ نبوی کے اردگرد پانی کی سطح تک خندق کھودی جائے اور اس میں سیسہ پگھلا کر ڈالا جائے، چنانچہ سیسہ پگھلا کر پوری خندق بھر دی گئی۔ اس کے بعد سلطان مدینہ سے رُخصت ہو کر شام کی طرف واپس چلا گیا۔ واللہ اعلم[1]

اسی نوعیت کا ایک واقعہ تاریخ فاطمی خلافتِ مصر میں بھی منقول ہے جو 400 ہجری میں پیش آیا۔ مؤرخین کے مطابق دولتِ فاطمیہ مصر کے شیعہ حاکم ابوعلی حسن الحاکم بامراللہ نے اپنے چند گُرگوں کو حکم دیا کہ مدینہ منورہ جاؤ اور حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہما) کی قبریں ادھیڑ کر ان کی لاشیں مصر لے آؤ۔ یہ گُرگے مدینہ پہنچے۔ انھوں نے بھاری مال و متاع کا لالچ دے کر ایک علوی کو پھانس لیا۔ اس شخص نے اپنے مکان میں زمین کی کھدائی شروع

---

[1] فصول من تاريخ المدينة المنورة لعلي حافظ

کر دی اور رسول اللہ ﷺ کی قبر تک نقب لگانے کے لیے خُفیہ طور پر اپنے مذموم کام میں جُت گیا۔ ایک دن یہ شخص اسی طرح خفیہ کھدائی میں مصروف تھا کہ اس قدر خوفناک آندھی آئی کہ پورے مدینے کی فضا تاریک ہوگئی، پھر بادل گرجے اور بجلی اتنی شدت سے کڑکی کہ یہ شخص لرز گیا اور اپنے مذموم فعل سے باز آ گیا۔ یہ معاملہ حاکمِ مدینہ کے علم میں آیا تو اس نے علوی اور ان پھانسنے والے مصریوں کو سخت سزا دی۔ (روضة الصفاء)

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی زندگی کا آخری دن

ذوالحجہ، 23 ہجری کے آخری ایام میں سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نمازِ فجر کے لیے نکلے۔ آپ کا معمول تھا کہ جب تک مقتدیوں کی صفیں بالکل سیدھی نہ ہو جاتیں، تکبیر تحریمہ نہیں کہتے تھے۔ آپ نماز پڑھانے کے لیے مصلیٰ پر کھڑے ہوئے، اچانک نمازیوں کی صفوں میں مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کا مجوسی غلام ابولؤلؤہ آ پہنچا، اس کے ہاتھ میں ایک خنجر تھا جس کے دونوں طرف دھار تھی۔ وہ نمازیوں کے بیچ سے نکلتا ہوا سیدھا امیرالمومنین کے پاس پہنچا اور خنجر کے تابڑ توڑ وار کرنے لگا۔ اس نے امیرالمومنین پر چھ وار کیے، ایک وار آپ کے زیرِ ناف کیا۔ یہی وہ کاری ضرب تھی جس سے آپ جانبر نہ ہو سکے اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔

آپ کے پیچھے کلیب بن ابوالکبیر اللیثی رضی اللہ عنہ نماز پڑھ رہے تھے۔ ابولؤلؤہ نے انھیں بھی خنجر مار دیا، اس طرح ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ امیرالمومنین کو خنجر کا زہر لگا تو آپ گر پڑے۔ اسی حالت میں دریافت فرمایا: کیا مقتدیوں میں عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ موجود ہیں؟

پھر آپ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو آگے بڑھا دیا تاکہ وہ نماز پڑھائیں۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو نماز پڑھائی اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بدستور زمین پر پڑے رہے۔ نماز کے بعد آپ رضی اللہ عنہ کو اٹھا کر گھر لایا گیا۔ آپ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا:

إِنِّي أُرِيْدُ أَنْ أَعْهَدَ إِلَيْكَ

میں آپ کو ایک ذمہ داری دینا چاہتا ہوں۔

عبدالرحمٰن بن عوف: میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ آپ مجھے خلافت قبول کرنے کا مشورہ تو نہیں دیں گے؟

امیرالمومنین: اللہ کی قسم! نہیں۔

عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

وَاللّٰهِ! لَا أَدْخُلُ فِيهِ أَبَدًا

''اللہ کی قسم! پھر تو میں خلافت کے پیچ وخم میں کبھی نہیں پھنسوں گا۔''

عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بس اب اس سلسلے میں خاموش رہو، کسی سے کوئی بات نہ کرو یہاں تک کہ میں ان لوگوں کو خلافت کی پیشکش کروں جن سے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم آخر دم تک راضی تھے۔ میرے پاس علی، عثمان اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم کو بُلا لاؤ اور طلحہ رضی اللہ عنہ کا بھی انتظار کر لو، اگر وہ بھی آ جاتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ تم لوگ انھی میں سے کسی کو اپنا خلیفہ منتخب کر لو۔

پھر آپ رضی اللہ عنہ حضرت علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: اے علی! میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں، اگر تم مسلمانوں کے کسی کام کے ذمہ دار بنو تو اپنے خاندان کے افراد کو دوسرے لوگوں پر ترجیح مت دینا۔ یہی بات آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان اور حضرت سعد رضی اللہ عنہما سے بھی کہی، پھر فرمایا: تم لوگ جاؤ اور باہمی مشورے سے کسی ایک کو اپنا خلیفہ منتخب کر لو، پھر آپ نے حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ مسلمانوں کی نمازوں میں امامت کریں، پھر حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کو بلا کر تاکید فرمائی کہ آپ یہاں دروازے پر

کھڑے رہیں اور کسی کو ان کے مشوروں میں مداخلت نہ کرنے دیں، پھر آپ نے یہ وصیتیں فرمائیں:

”میں اپنے بعد آنے والے خلیفہ کو وصیت کرتا ہوں کہ وہ انصارِ مدینہ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے اور ان کا خیال رکھے کیونکہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خاطر بے حد قربانیاں دی ہیں اور ایمان و آخرت ہی کو جائے پناہ بنائے رکھا۔ میری وصیت ہے کہ انصار کے اچھے لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے اور ان میں سے جو لوگ برے ہیں ان کی غلطیوں کو نظر انداز کیا جائے۔ میں اپنے بعد کے خلیفہ کو وصیت کرتا ہوں کہ وہ عربوں کا خیال رکھے کیونکہ دراصل عرب ہی اسلام کی جڑ ہیں۔ ان کے مالداروں سے صدقے اور خیرات لیے جائیں اور غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیے جائیں۔ میں اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کو وصیت کرتا ہوں کہ وہ اہل کتاب، یعنی یہود و نصاریٰ کو جو عہد و پیمان دے اسے پورا کرے۔ یہی رسول اکرم ﷺ کی تعلیم ہے۔ اے اللہ! تو گواہ رہ! میں نے اپنی حد تک تیرا پیغام پہنچا دیا۔“

ان ارشادات کے بعد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

يَا عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ! اُخْرُجْ فَانْظُرْ مَنْ قَتَلَنِي

”عبداللہ بن عمر! جا کر دیکھو کہ میرا قاتل کون ہے۔“

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے عرض کیا: اے امیر المومنین! آپ کا قاتل حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کا نصرانی غلام ابولؤلؤ ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر ٹھنڈا سانس بھرا اور فرمایا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي لَمْ يَجْعَلْ مِيتَتِي بِيَدِ رَجُلٍ سَجَدَ لِلّٰهِ سَجْدَةً وَّاحِدَةً

’’تمام تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جس نے میری موت کسی ایسے آدمی کے ذریعے واقع نہیں ہونے دی جس نے اللہ کے لیے ایک بھی سجدہ کیا ہو۔‘‘

پھر آپ نے اپنے بیٹے عبداللہ ؓ سے فرمایا:

اِذْهَبْ إِلٰى عَائِشَةَ فَسَلْهَا أَنْ تَأْذَنَ لِي أَنْ أُدْفَنَ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَبِي بَكْرٍ

’’ام المومنین سیدہ عائشہ ؓ کے پاس جاؤ اور پوچھو کہ کیا وہ اجازت دیتی ہیں کہ میں رسول اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکر ؓ کے ساتھ دفن کیا جاؤں؟‘‘

جب عبداللہ بن عمر ؓ ام المومنین کے پاس اجازت لینے کے لیے پہنچے تو وہ زاروقطار رو رہی تھیں۔ انھوں نے حضرت عبداللہ ؓ کو جواب دیا: میری تمنا تھی کہ مجھے رسول اکرم ﷺ اور اپنے والد کی قبر کے پاس دفن کیا جائے مگر آج میں اپنے آپ پر امیرالمومنین کو ترجیح دوں گی، چنانچہ ان کی اجازت کے بعد حضرت عمر ؓ رسول اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے پہلو میں دفن کیے گئے۔ [1]

---

[1] البدء و التاریخ 189/5 و الکامل في التاریخ 447/2 و تاریخ ابن خلدون 569/2۔

بہادر ڈاکو حجاج کی عدالت میں

یہ قصہ سعودی عرب کے شہر ریاض کے قریب ایک علاقے یمامہ میں پیش آیا۔ اس علاقے میں آج کل الخرج واقع ہے۔ اس قصے پر بلاشبہ کئی صدیاں بیت چکی ہیں مگر یہ داستان آج بھی نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہے۔

یہ پہلی صدی ہجری کے اواخر کی بات ہے، اموی خاندان کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ دمشق میں ولید بن عبدالملک مسلمانوں کے خلیفہ تھے۔ عراق اور اس کے مشرقی علاقوں کا گورنر حجاج بن یوسف تھا۔

یمامہ کے لوگ کئی مہینوں سے خوف و ہراس میں مبتلا تھے...... راتوں کو ڈرتے ڈرتے سوتے تھے۔ سڑکوں پر سناٹا چھایا رہتا تھا۔ لوگ کم ہی گھروں سے نکلتے تھے۔ کسی وقت بھی کوئی حادثہ رُونما ہوسکتا تھا۔ ہر ایک کو یہی خوف لاحق تھا کہ اگلا شکار وہی ہوگا۔ وہ کوئی بڑا دبنگ اور دلیر قسم کا ڈاکو اور رہزن تھا جو دن دہاڑے لوگوں کے اموال اور مویشی لوٹ کر لے جاتا تھا۔ اس نے لوگوں کی نیند حرام کر دی تھی۔

ایک دن کچھ نوجوان اکٹھے ہوئے اور کہنے لگے کہ ہمیں اس کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ ظہر کا وقت تھا، ڈاکو نہایت اطمینان سے سڑک پر بے خوف وخطر گھوم رہا تھا۔ نوجوانوں نے اسے للکارا تو وہ لپک کر آیا، ان سب کو آڑے ہاتھوں لیا اور نہایت بے دردی سے مارا، ان کے جسم سے خون بہنے لگا، تھوڑی ہی دیر میں یہ نوجوان مقابلہ چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

لوگوں میں اور زیادہ خوف و ہراس پھیل گیا۔ وہ کہنے لگے کہ یہ کوئی عام لٹیرا یا ڈاکو نہیں بلکہ یہ تو کوئی شیطان ہے۔ بھلا اتنے نوجوانوں کا مقابلہ ایک آدمی کیسے کرسکتا ہے۔ اُس نے کتنی دلیری اور مہارت سے انھیں مارا ہے۔ بلاشبہ یہ رہزن ڈاکو کے روپ میں کوئی شیطان ہے۔ ہر جگہ، ہر مجلس اور ہر گھر میں اسی کی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ رفتہ رفتہ اس ڈاکو کی خبریں ایک محلے سے دوسرے محلے تک، ایک بستی سے دوسری بستی تک اور ایک علاقے سے دوسرے علاقے تک پھیلتی چلی گئیں۔

یمامہ کے گورنر کو بھی یہ خبریں پہنچ چکی تھیں۔ اس ڈاکو کی کارروائیاں مسلسل بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ ایک دن یہ خبر حجاج بن یوسف تک پہنچ گئی۔ اس کے غیظ و غضب کی انتہا نہ رہی۔ وہ کہنے لگا: بڑی حیرت کی بات ہے کہ صرف ایک ڈاکو نے سارے علاقے کا امن غارت کر رکھا ہے۔ اس نے فوراً یمامہ کے گورنر کو خط لکھا کہ اس ڈاکو پر جلد قابو پایا جائے۔ اُسے قتل کر دیا جائے یا قید کر کے میرے پاس روانہ کیا جائے۔ گورنر کو انتباہ کیا گیا کہ اگر اس نے ڈاکو کو زندہ یا مردہ گرفتار نہ کیا تو اسے معزول کر کے نیا شخص گورنر بنا دیا جائے گا۔

اس ڈاکو کا نام جحدر تھا۔ بلاشبہ وہ اس وقت کے سب سے خطرناک ڈاکوؤں کا سرغنہ تھا...... یمامہ کے گورنر نے اُسے گرفتار کرنے کی پوری کوشش کی مگر وہ ہمیشہ اس کے سپاہیوں کو جُل دینے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔ ادھر یمامہ کے گورنر کو حجاج کا نوٹس مل گیا کہ اس کی گورنری خطرے میں ہے اور کسی بھی وقت اسے برطرف کر دیا جائے گا تو اس نے جحدر کو پکڑنے کے لیے اپنے تمام وسائل جھونک دیے۔ جحدر بھی چھلاوا تھا۔ وہ اپنے شکار کو لوٹتا اور نہایت اطمینان سے غائب ہو جاتا۔ تمام تدابیر ناکام ہوگئیں تو اُسے پکڑنے کے لیے نیا حیلہ سوچا گیا۔

گورنر یمامہ نے دو نہایت توانا اور کڑیل نوجوانوں کا انتخاب کیا، یہ بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت ذہین بھی تھے، انھیں نہایت سوچ بچار کے بعد یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ جحدر کو زندہ یا مردہ گرفتار کریں۔ اس کے صلے میں انھیں بڑی دولت دینے کا وعدہ کیا گیا اور پلان سمجھا دیا گیا کہ انھیں کیا کرنا ہے۔

نوجوانوں نے جحدر کو پیغام بھیجا کہ ان کی قوم نے ان پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے، ہم بھی چوری چکاری کرتے ہیں، لوگوں کے گھر لوٹتے ہیں اور اب ہم کسی وقت بھی گرفتار ہو سکتے ہیں کیونکہ ہمارے گرد قافیہ تنگ ہو چکا ہے۔ ہمیں تمھاری جرأت اور ہمت کی خبریں ملی ہیں تو ہم تم سے نہایت متاثر ہوئے ہیں، ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تمھیں اپنا لیڈر بنائیں، تمھاری ہی قیادت میں ڈاکے ماریں اور جو کچھ ہمیں حاصل ہو اس کا ایک چوتھائی حصہ تمھاری خدمت میں پیش کریں۔ گفتگو چلتی رہی، نوجوان چھوٹے موٹے ڈاکے مارتے رہے۔ ان خبروں کو خوب اُچھالتے رہے۔ اس طرح ان کی دلیری کے قصے زبان زد عام ہو گئے، چنانچہ انھوں نے جحدر کو آخری پیغام بھیجا کہ اگر اس نے انھیں اپنے گینگ میں شامل نہ کیا تو وہ اپنے طور پر علیحدہ ہی ڈاکے مارتے رہیں گے۔

جحدر کو اپنی ذہانت پر پورا اعتماد تھا، اس نے جتنے بھی ڈاکے مارے تھے، اکیلے ہی مارے تھے اور ہمیشہ کامیاب رہا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ کوئی اسے بھی دھوکا دے سکتا ہے۔ اس نے نوجوانوں کو مثبت جواب دیا اور ان کا سرغنہ بننا منظور کر لیا۔ اب انھوں نے مل کر ڈاکے مارنے شروع کر دیے۔ اس نے انھیں یکے بعد دیگرے کئی مقامات پر بھیجا، یہ نوجوان اُس کی بتائی ہوئی منزل پر جا پہنچتے، لُوٹ مار کرتے کامیاب و کامران واپس آ جاتے اور آتے ہی وعدے کے مطابق چوتھائی حصہ جحدر کے حوالے کر

دیتے۔ اب جحدر کو یقین ہوتا جا رہا تھا کہ یہ نوجوان میرے لیے نہایت مخلص ہیں۔ ان پر اس کا اعتماد بڑھتا گیا۔

جب نوجوانوں کو یقین ہو گیا کہ وہ ان پر اعتماد کرنے لگا ہے تو انھوں نے فوراً اپنی اصل ڈیوٹی پوری کرنے کی ٹھانی۔

چاندنی رات تھی، ٹھنڈی ہوا تھی، خاموش فضا تھی، یہ لوگ ایک بڑی واردات کے بعد اپنے ٹھکانے پر پہنچے۔ یہ سب بہت تھکے ہوئے تھے۔ جحدر نے فوراً اپنی تلوار اتار کر ایک طرف رکھ دی اور گہری نیند سو گیا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے اس کی نیند پر اور زیادہ غفلت طاری کر دی۔ ادھر نوجوان موقع کی تاک میں تھے۔ انھوں نے ایک دوسرے کو اشارہ کیا۔ انھوں نے پہلے ہی سے ایک مضبوط رسی تیار کر رکھی تھی۔ وہ بجلی کی تیزی سے اٹھے اور آناً فاناً جحدر کے ہاتھ پاؤں نہایت مضبوطی سے جکڑ دیے۔ جحدر کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو کشتیٔ طوفان میں پایا۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ وہ دھاڑا مگر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا۔ ادھر پولیس کو بھی مدد کے لیے بلا لیا گیا۔ اور پھر اسے گورنر یمامہ کی خدمت میں لے گئے۔ بلاشبہ یہ نوجوانوں کا بڑا کارنامہ تھا۔ گورنر نے اس مجرم کی گرفتاری پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ نوجوانوں کو انعام واکرام سے نوازا۔ بَارَكَ اللّٰهُ فِيكُمْ. تم نے بہت بڑا کام انجام دیا۔ ایک خطرناک ڈاکو سے لوگوں کو نجات ملی۔ اس نے فوراً پولیس کا ایک دستہ تشکیل دیا اور زبردست نگرانی میں حجاج کے پاس بھجوانے کا بندوبست کیا۔

جب لوگوں کو اس ڈاکو کے پکڑے جانے کی خبر ملی تو بے حد خوش ہوئے۔ ہر شخص کی خواہش تھی کہ وہ اسے دیکھے، چنانچہ جب جحدر کو حجاج کے پاس پہنچانے کے لیے قافلہ روانہ ہُوا تو سڑکوں پر لوگوں کا بڑا ہجوم جمع ہو گیا اور سب لوگ اس نامور ڈاکو کو دیکھنے کے لیے

ٹوٹ پڑے۔

لوگوں کا خیال تھا کہ وہ کوئی بہت بھاری بھرکم شخصیت کا مالک ہوگا۔ خوب موٹا تازہ لمبے قد کا جوان ہوگا جس نے سارے علاقے پر اپنی دھاک بٹھا دی تھی مگر انھیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ درمیانے قد کا چھوٹے سے سر والا مریل سا آدمی ہتھکڑیوں میں جکڑا چلا جا رہا ہے۔

جحدر کا قافلہ حجاج کے پاس پہنچا۔ وہ بھی اسے دیکھنے کا متمنی تھا۔ اس نے اپنے امراء اور درباریوں کے ساتھ جحدر سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد جحدر حجاج کے دربار میں پورے وقار اور تمکنت کے ساتھ کھڑا تھا۔ حجاج نے اس پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی، اس کا باوقار انداز میں کھڑے ہونا اس کے لیے باعث تعجب تھا۔ اس نے گرج کر پوچھا: کیا تم جحدر ہو؟

"ہاں، میں ربیعہ کا بیٹا جحدر ہوں۔"

"تمھیں اس قدر بھیانک جرائم پر کس نے اکسایا؟"

اس نے جواب دیا:

ظُلْمُ الزَّمَانِ ، وَجُرْأَةُ الْقَلْبِ ، وَإِفلاسُ الْجَيْبِ وَجُبْنُ النَّاسِ

"زمانے کے ظلم وستم، میرے دل کی جرأت اور بہادری، مفلسی و ناداری اور لوگوں کی بزدلی نے!"

حجاج اس جواب سے بڑا متاثر ہوا کہ یہ شخص تو بڑا فصیح اللسان ہے۔ موت کے دہانے پر کھڑا ہو کر بھی اس نے کتنی بے باکی سے جواب دیا ہے۔ حجاج نے اگلا سوال کیا:

کیا تمھیں معلوم ہے کہ تمھارے بھیانک جرائم اور غلط کاموں کا انجام کیا ہے؟

جحدر: اگر آپ مجھے اپنا باڈی گارڈ بنالیں اور اپنے خاص آدمیوں میں شامل کرلیں تو میں ایسے کارنامے انجام دوں گا کہ آپ حیران رہ جائیں گے۔

حجاج: تم میرے باڈی گارڈ بنو گے۔ ہاہاہا۔ ایک ڈاکو اور میرا باڈی گارڈ! تمھارے جیسے گھٹیا لوگ چوری اور ڈاکے سے زیادہ کچھ نہیں سوچ سکتے۔ اب تم اپنی موت کے سوا اور کوئی تمنا نہ کرو۔

جحدر: امیر! اگر آپ اپنے دشمنوں کے خلاف میری حکمت عملی سن لیں تو آپ بہت خوش ہوں گے۔

حجاج: چلو پہلے ہم تمھاری حکمت اور بہادری کا تجربہ کرتے ہیں اور تمھارا مقابلہ کرا کے دیکھتے ہیں۔

جحدر: اللہ امیر کو مزید عزت و احترام دے۔ میں ہر قسم کے تجربے اور مقابلے کے لیے تیار ہوں۔

حجاج: جانتے ہو یہ مقابلہ نہایت سخت ہے...... موت اس سے کہیں زیادہ آسان ہے۔

جحدر: آپ جس سے مقابلہ کرانا چاہتے ہیں، کرائیں میں تیار ہوں۔

حجاج: لیکن یہ مقابلہ کسی میدان جنگ میں نہیں ہوگا کہ تمھیں محض کسی آدمی کے ساتھ روایتی طور پر لڑنا ہو۔

جحدر: میں ہر قسم کے مقابلے اور آزمائش کے لیے تیار ہوں۔

حجاج: پھر سُن لو! یہ مقابلہ کسی آدمی کے ساتھ نہیں ہوگا۔

حجدر: میں مقابلے کے لیے تیار ہوں۔ بے شک کسی جن سے مقابلہ کرا کے دیکھ لیجیے۔

حجاج: لیکن یہ مقابلہ کسی جن کے ساتھ بھی نہیں ہے۔

جحدر: اے امیر! میں ایک گھنٹے سے آپ کے احاطۂ اطاعت میں کھڑا ہوں جس طرح جی چاہے، مجھے آزمائیے، میں تیار ہوں۔

حجاج: ہم تمھیں ایک بھوکے شیر کے سامنے کھڑا کریں گے۔ تمھارے پاس ایک تلوار کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ اگر شیر نے تمھارے ٹکڑے کر دیے تو تم اپنے انجام کو پہنچ جاؤ گے اور اگر تم نے اسے ہلاک کر دیا تو پھر ہم تمھیں معاف کر دیں گے۔

جحدر: اللہ امیر کا بھلا کرے! اس کا مطلب یہ ہوا کہ معافی اور خلاصی کی صورت نکل آئی۔

حجاج: اس قدر خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمھاری خوش فہمی حد سے بڑھ گئی ہے، جلد ہی تمھارا مقابلہ بھوکے شیر سے ہونے والا ہے۔

حجاج نے جحدر کو قید خانے میں ڈالنے کا حکم دیا اور تاکید کی کہ ایک نہایت خونخوار شیر کو دو تین دن بھوکا رکھا جائے تا کہ وہ جحدر کا مقابلہ کرے…… پھر وہ دن آ پہنچا جب چھوٹی سی کھوپڑی والا ایک آدمی شیر سے مقابلہ کرنے کے لیے اکھاڑے میں اترنے والا تھا۔ اس دن موسم معمول سے زیادہ گرم تھا۔ اکھاڑا اس طرح بنایا گیا کہ گہری جگہ کھودی گئی۔ اس کے ارد گرد مضبوط دیواریں بنائی گئیں۔ اس کے دو دروازے تھے۔ ایک شیر کے اور دوسرا جحدر کے داخلے کے لیے تھا۔

حجاج اپنے امراء، وزراء اور دیگر عمائدین شہر کے ساتھ یہ مقابلہ دیکھنے آیا۔ عام لوگ بھی سخت گرمی کے باوجود وہاں جمع ہو گئے۔ لوگوں کے دلوں میں جحدر کے لیے شدید نفرت تھی مگر اس کے باوجود جب انھیں خیال آتا کہ اب وہ بھوکے شیر سے مقابلہ کرے گا تو انھیں

جحدر سے ہمدردی ہونے لگی۔

حجاج نے مقابلہ شروع کرنے کا اعلان کیا۔ شیر کے پنجرے کا دروازہ کھول دیا گیا۔ شیر نہایت شدت سے دہاڑتا ہُوا اکھاڑے میں داخل ہوا۔ وہ بھوک کے مارے بے چین تھا۔ اکھاڑے میں اِدھر اُدھر بھاگنے لگا۔ یہ بڑا قوی ہیکل شیر تھا۔ اس کا سر بہت بھاری بھرکم تھا۔ اس کا جبڑا کھلا ہوا تھا اور اُس کے لمبے لمبے خوں آشام دانت باہر نکلے نظر آ رہے تھے۔ آنکھوں سے غصے کی چنگاریاں پُھوٹ رہی تھیں۔ لوگوں کو یقین تھا کہ اب چند ہی لمحوں کے بعد جحدر کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔

اب حجاج نے دوسرا اشارہ کیا کہ جحدر کا دروازہ کھولا جائے۔ جحدر کے جسم کا بیشتر حصہ ننگا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ اس نے حجاج کے سامنے آ کر اپنی گردن اُٹھائی تلوار کو حرکت دی اور پوری قوت سے بولا:

أَعَزَّاللّٰه الْأَمِيرَ...... هَذِهِ سَاعَةُ النِّهَايَةِ، فَهَلْ أَنَالُ عَفْوَكَ إِنِ انْتَصَرْتُ؟

”اللہ امیر کو مزید عزت و احترام دے۔ ممکن ہے یہ میری زندگی کے آخری لمحات ہوں۔ اگر میں کامیاب ہو جاؤں تو کیا میرے لیے معافی ہے؟“

حجاج: ہاں! اگر تم نے فتح پالی تو پھر تمھارے لیے معافی ہے۔

سپاہیوں نے جحدر کو اکھاڑے میں دھکیل دیا۔ جحدر اکھاڑے میں نہایت بے خوفی سے داخل ہوا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی ہرن کا شکار کرنے جا رہا ہے۔ جب شیر نے ایک آدمی کو اکھاڑے میں داخل ہوتے دیکھا تو زور سے غرایا۔ حاضرین کے دل دہل گئے۔ بڑے بڑے بہادروں کے پتے پانی ہو گئے۔ خوف کے مارے بڑے بڑے سُورماؤں نے

آنکھیں میچ لیں۔ اُدھر جحدر بے باکی سے شیر کی طرف بڑھا اور شیر کو مخاطب کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا:

لَيْثٌ وَّلَيْثٌ فِي مَجَالٍ ضَنْكٍ
كِلَاهُمَا ذُو قُوَّةٍ وَّسَفْكٍ

''ایک طرف یہ شیر ہے اور دوسری طرف دوسرا شیر مشکل میں ہے جبکہ دونوں شیر نہایت طاقتور اور خونخوار ہیں۔''

لوگ حیران تھے۔ جحدر نے لوگوں کی توقع کے خلاف شیر کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ ادھر شیر زور سے غُرایا۔ شیر نے اسے اپنی طرف آتے دیکھا تو اس پر چھلانگ لگا دی، ادھر جحدر بھی تیار کھڑا تھا، فوراً ایک طرف ہٹ گیا اور پھر اچانک پلٹ کر شیر پر ٹوٹ پڑا۔ شیر اٹھ ہی رہا تھا کہ تلوار کا ایک کاری وار اس پر پڑا، وار اگرچہ بھرپور تھا مگر مہلک نہ تھا۔ شیر نے پیچھے کی طرف جست لگائی۔ زخمی ہونے کی وجہ سے وہ مسلسل دہاڑ رہا تھا۔ اس کے بدن سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا۔ اس نے نہایت خوفناک انداز میں اپنا جبڑا کھولا۔ اُس کے خونخوار دانت اور تیز ہوگئے۔ وہ جحدر پر حملہ کرنے کے لیے پلٹا ہی تھا کہ جحدر بجلی کی طرح آگے بڑھا اور اس کی گردن پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ گردن کٹ کر شیر کے دھڑ کے ساتھ ہی جُھولنے لگی اور شیر دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔

لوگوں نے فلک شگاف نعرہ تکبیر بلند کیا اور جحدر سے اُن کی نفرت محبت میں بدل گئی۔ آج تک اتنا بہادر شخص کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ لوگ کہہ رہے تھے: کاش! اس شخص کی بہادری اور عظیم قوت قتل و غارتگری اور ڈاکہ زنی کے بجائے نیکی اور بھلائی کے کاموں میں استعمال ہو۔ جحدر نے اپنے چہرے سے پسینہ پونچھا اور حجاج کی طرف بڑھا۔ اس نے اپنا

ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ حجاج نے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا اور کہنے لگا:

مَا أَشْجَعَكَ يَا جَحْدَرُ!

’’جحدر! تم کتنے بہادر ہو!...... میں تمھیں دو اختیار دیتا ہوں۔ یا تو تم معزز اور مکرم بن کر میرے پاس رہو یا اس شرط پر واپس یمامہ چلے جاؤ کہ آئندہ کسی شخص پر ظلم اور زیادتی نہیں کرو گے۔ جحدر کو معلوم تھا کہ حجاج اپنے وعدے کا پابند ہے۔ اس نے کہا: میرے لیے افضل یہی ہے کہ میں آپ کے پاس رہوں اور آپ کی خدمت کروں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اب میری تلوار اور میری قوتِ بازو باغیوں اور اسلام دشمن طاقتوں کے خلاف لہرائے گی۔

حجاج نے اس کی بات قبول کر لی۔ جحدر نے بھی سچے دل سے توبہ کی اور اُس کی تقدیر بدل گئی۔ اب وہ ڈاکو نہیں رہا تھا بلکہ لوگوں کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کرنے والا بن گیا تھا۔ اُس نے اپنا تعلق اللہ رب العزت سے جوڑ لیا اور اپنا وقت نماز، روزے، تہجد اور جہاد میں بسر کرنے لگا۔[1]

---

[1] یہ قصہ البداية والنهاية 125/9، اور تاریخ مدينة دمشق 149/12 میں دیکھیے۔

کس کس کا ہاتھ میرے گریباں میں آئے گا!

خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ[1] کا شمار خلافتِ امویہ کے امراء و روٴسا میں ہوتا تھا۔ وہ ایک دن میں کئی کئی دفعہ لباس زیب تن کرتے تھے۔ سونے چاندی کے برتن ان کے پاس موجود تھے۔ نوکروں اور محلات کی کوئی کمی نہ تھی۔ کھانے پینے کی فراوانی تھی۔ غرضیکہ انھیں جس چیز کی بھی آرزو ہوسکتی تھی وہ ان کے پاس موجود تھی۔ مگر جونہی انھوں نے منصبِ خلافت سنبھالا اور مسلمانوں کے مسائل و معاملات کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر آ پڑی تو انھوں نے ناز و نعم کی تمام اشیاء یک قلم ترک کردیں اور تمام اسبابِ راحت سے سبکدوش ہو گئے۔ انھیں موت کی سنگینی کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ قبر کی پہلی رات کا تصور انھیں چین کی نیند نہیں سونے دیتا تھا۔

خلافت کے لیے جب عمر بن عبدالعزیز کا انتخاب عمل میں آ گیا اور پوری امت نے ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی تو جمعہ کے روز وہ منبر پر کھڑے ہوکر رونے لگے۔ اس وقت ان

---

[1] حضرت عمر بن عبدالعزیز 681ء میں پیدا ہوئے اور 720ء میں وفات پا گئے۔ اسلام نے جو رجالِ کبار پیدا کیے ان میں آپ کا درجہ بڑا ممتاز ہے۔ عہد حاضر کی رفتار سیاست دیکھیے اور اس کا موازنہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد خلافت سے کرتے جایئے۔ یہ تقابل فوراً ابتادے گا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کتنے عظیم مسلمان اور کتنے دور اندیش انسان تھے۔ ان کے حالات زندگی پڑھتے پڑھتے بے ساختہ اقبال کا یہ مصرع یاد آجاتا ہے۔

ع...... ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان!

پورے عالم اسلام کی تاریخ ٹٹول جایئے آپ کو کوئی ایسا فرمانروا نظر نہیں آئے گا جس نے بادشاہت کے ◂◂

کے ارد گرد امراء و وزراء، علماء و شعراء اور سپہ سالاروں کا بڑا مجمع موجود تھا۔ انھوں نے سامعین سے فرمایا:

خُذُوا بَيْعَتَكُمْ

”تم لوگ مجھ سے اپنی بیعت واپس لے لو۔“

حاضرین یک زبان ہو کر بول اُٹھے:

مَا نُرِيدُ إِلَّا أَنْتَ

”ہم آپ ہی کو اپنا خلیفہ مقرر کرنا چاہتے ہیں۔“

غرض خلافت کا عہدہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خواہش کے علی الرغم انھی کو سونپ دیا گیا۔ خلافت کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ابھی صرف ایک ہی ہفتہ گزرا تھا کہ وہ انتہائی کمزور ہو گئے، ان کا جسم لاغر اور رنگ فق ہو گیا۔ ان کے پاس صرف ایک ہی جوڑا باقی رہ گیا جسے وہ روزانہ پہنتے تھے۔

لوگوں نے ان کی بیوی سے دریافت کیا: امیر المؤمنین کو کیا ہو گیا ہے؟

« کامل اختیارات سے ازخود دست بردار ہو کر بادشاہت کو دوبارہ خلافت راشدہ کی صراطِ مستقیم پر ڈالنے کے لیے اپنی زندگی کے گریز پا لمحات بے دریغ صرف کر دیے۔ وہ مصر کے گورنر عبدالعزیز کے صاحبزادے اور خلیفہ عبدالملک کے بھتیجے اور داماد تھے۔ نازونعمت میں پلے۔ نہایت خوبصورت، خوش ذوق اور خوش پوش شہزادے تھے۔ بڑی نادر خوشبو لگاتے تھے۔ ڈاڑھی میں خلال کر کے سفوف عنبر چھڑکتے تھے۔ جدھر نکل جاتے تھے، ساری فضا مہک اٹھتی تھی۔ خلافت سنبھالی تو فقر و درویشی کی زندگی اختیار کر لی۔ پہلا کام ہی یہ کیا کہ اپنی وسیع جاگیر فلاحِ عامہ کے لیے بیت المال کے حوالے کر دی، پھر تمام امرائے بنوامیہ کی جاگیروں کے پروانے خود اپنی قینچی سے چاک کر دیے اور ان کی جاگیریں بھی بہبود عامہ کے لیے بیت المال کو دے دیں۔ اپنی اہلیہ محترمہ کے نہایت قیمتی ہیرے جواہرات بھی عام مسلمانوں کی بھلائی کی نذر کر دیے۔ معذوروں «

بیوی نے جواب دیا:

وَاللّٰهِ! إِنَّهٗ مَا يَنَامُ اللَّيْلَ ، وَاللّٰهِ! إِنَّهٗ يَأْوِي إِلٰى فِرَاشِهٖ فَيَتَقَلَّبُ كَأَنَّهٗ يَنَامُ عَلَى الْجَمْرَةِ، يَقُولُ: آه! آه! تَوَلَّيْتُ أَمْرَ أُمَّةِ مُحَمَّدٍ ﷺ يَسْأَلُنِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ الْفَقِيرُ وَالْمِسْكِينُ و الطِّفْلُ وَالْأَرْمَلَةُ

> ''اللہ کی قسم! وہ رات کو نہیں سوتے، اللہ کی قسم! وہ اپنے بستر کا سہارا نہیں لیتے ہیں۔ وہ بستر پر اس طرح پلٹیاں کھاتے ہیں جیسے آگ کے انگاروں پر لوٹ رہے ہوں۔ وہ کہتے ہیں: آہ! امتِ محمدیہ کی ذمہ داری میرے ناتواں کندھوں پر آ پڑی۔ قیامت کے دن فقراء و مساکین، بچے اور بیوگان سبھی میرا گریبان پکڑیں گے۔''

ایک عالم (ابن زیاد) نے ان سے پوچھا: اے امیر المؤمنین! مکہ میں ہم نے آپ کو خلافت کی ذمہ داری سنبھالنے سے پہلے ناز و نعم اور صحت و عافیت کے ساتھ دیکھا تھا لیکن کیا وجہ ہے کہ اب آپ بالکل بدل گئے ہیں؟

◀◀ اور مسکینوں کی بھرپور مدد فرمائی۔ اور مملکت اسلامیہ کو اتنا خوشحال بنادیا کہ نگر نگر، قریہ قریہ دور دور تک کوئی محتاج نظر نہیں آتا تھا۔ زندگی کے آخری سانس تک اللہ اور رسول ﷺ ہی کی اطاعت کرتے رہے۔ ذمیوں کے حقوق کی بڑی دیکھ بھال کرتے تھے۔ ایک مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کردیا تو آپ نے قاتل کو کیفر کردار تک پہنچایا۔ ایک مسلمان افسر نے ایک ذمی کا گھوڑا چھین لیا تو اسے چالیس درے لگوائے۔ ہشام بن عبدالملک کے خلاف ایک عیسائی نے فریاد کی تو آپ نے ہشام کو ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا کردیا۔ ہشام چیخا چلایا تو آپ نے اسے نہایت سختی سے سرزنش کی۔ خلفائے بنوامیہ خطبات جمعہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان کے خلاف ناگوار باتیں کرتے تھے، آپ نے اس رسم بد کو ختم کردیا اور اس کی جگہ یہ آیت پڑھنے کی ◀◀

یہ سوال سن کر حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اس عالم سے کہا: اے ابن زیاد! جب تم مجھے قبر میں دفن کیے جانے کے تین دن بعد دیکھو گے جبکہ میں تمام دوست احباب سے جُدا ہو کر کپڑوں سے بے نیاز ہو کر ننگا ہو چکا ہوں گا اور میرا بدن مٹی میں پڑا ہو گا تو بتاؤ، میں کیسا لگوں گا؟

وَاللّٰهِ! لَرَأَيْتَ مَنْظَرًا لَّيَسُوؤُكَ

”اللہ کی قسم! ایسا منظر نظر آئے گا جو تجھے پسند نہیں آئے گا۔“

» تاکید فرمائی: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝﴾ [النحل 16:90] یہ آیت آج تک بدستور اسلامی خطبات کا جز ہے جس کا ثواب نامعلوم مدت تک انھی کے حساب میں لکھا جائے گا۔ امرائے بنوامیہ اپنی جاگیریں چھن جانے پر بڑے برہم تھے۔ انھوں نے سازش کی، آپ کے ایک نوکر کو ایک ہزار اشرفیاں دے کر اس کے ذریعے آپ کو زہر کھلا دیا۔ آپ پر اس سازش کا بھید کھل گیا۔ شانِ کریمی کا عالم یہ تھا کہ وہ کسی سے ذاتی انتقام لینا اپنی توہین سمجھتے تھے۔ نوکر کو بلایا، ایک ہزار اشرفیاں واپس لیں۔ بیت المال میں جمع کرائیں اور نوکر سے فرمایا: چپکے سے بھاگ جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ میری موت کے بدلے تمھیں قتل کر دیا جائے۔ اسی زہر کی وجہ سے 101 ہجری بمطابق 720ء میں وفات پا گئے۔ رحمه الله تعالٰى رحمة واسعة

وعدے کی پاسداری

بنو عباس کی خلافت قائم ہوئی تو بنو امیہ کے تمام سرکردہ افراد روپوش ہو گئے۔ انھیں خوف تھا کہ ان سے نہایت برا سلوک کیا جائے گا۔ ادھر بنو عباس کے لوگ بھی ان لوگوں کی بو سونگھ رہے تھے اور انھیں جا بجا تلاش کر رہے تھے۔

بنو امیہ کے چھپے ہوئے سرکردہ افراد میں ابراہیم بن سلیمان بن عبدالملک بن مروان بھی شامل تھا۔ خلیفہ سفاح[1] کے خاص آدمی نے اس کی سفارش کی اور امان طلب کی جو دے دی گئی۔ ابراہیم بن سلیمان خلیفہ کے پاس آیا۔ اپنی غلطیوں کی معافی مانگی۔ خلیفہ نے اسے عزت و اکرام سے نوازا، شاہی لباس پہنایا اور اپنے خواص میں جگہ دی۔

ایک دن خلیفہ سفاح ابراہیم سے کہنے لگا: تم ایک مدت تک چھپے رہے۔ اگر اس دوران کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہو جو دلچسپ اور سبق آموز ہو تو ہمیں سناؤ۔ ابراہیم بن سلیمان نے اپنی زندگی کا سب سے نرالا واقعہ بیان کرنا شروع کیا۔ سنیے اور عربوں کے صبر و ثبات، حوصلوں اور عہد و پیمان کے احترام کی داد دیجیے......!

---

[1] خلیفہ سفاح ابوالعباس پہلا عباسی خلیفہ تھا۔ اس کا اصل نام عبداللہ تھا۔ 132 ہجری میں برسر اقتدار آیا اور 136 ہجری میں الانبار میں انتقال کر گیا۔ اس کے عہد حکومت میں عباسی تحریک انقلابی دور سے گزر کر آئینی دور میں داخل ہو گئی۔ اس کے کردار اور کارناموں کے بارے میں مؤرخین خاموش ہیں، البتہ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ وہ سمجھ دار اور فیاض حکمران تھا۔ سفاح کے معنی ہی خونریز کے ہیں، یہ شخص بنو امیہ کا جانی دشمن تھا۔ اس نے بنو امیہ کے افراد کا بے دریغ قتل عام کرایا، اس لیے سفاح کے نام سے مشہور ہو گیا۔

ع اب ایسے لوگ زمانے میں روز روز کہاں؟

ابراہیم بن سلیمان نے بتایا: میری تلاش اور گرفتاری کا شاہی پروانہ جاری ہو چکا تھا۔ میں ادھر اُدھر بھاگتا پھر رہا تھا، کہیں سکون نہ تھا۔ بھاگتے بھاگتے میں حیرہ پہنچا اور صحرا میں ایک بدو کے ہاں پناہ گزیں ہوا۔ موت میرے تعاقب میں تھی اور میں اس سے بھاگتا پھر رہا تھا۔ میرے سر پر ہر وقت خوف منڈلاتا رہتا تھا کہ نجانے مجھے کب دھر لیا جائے۔ ایک دن میں چھت پر بیٹھا تھا، صحرا پر نگاہیں گاڑ رکھی تھیں کہ دور سے کالے جھنڈے نظر آئے۔ کوفہ سے نکلنے والا یہ قافلہ حیرہ کی جانب آ رہا تھا۔ مجھے خوف محسوس ہوا۔ میری چھٹی حِس کہنے لگی کہ یہ لوگ مجھے گرفتار کرنے آ رہے ہیں۔ ممکن ہے کسی نے مخبری کر دی ہو۔ قافلہ ابھی دور تھا، میں نے موقع غنیمت جانا اور وہاں سے نکل بھاگا، کوفہ آ گیا۔ سامنے کوئی منزل نہ تھی، نہ میں کسی گھرانے کو جانتا تھا جو مجھے پناہ دیتا یا مدد کرتا۔ میں ادھر ادھر ٹامک ٹوئیاں مارتا پھر رہا تھا۔ لوگوں کی نگاہیں ایسی چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں جیسے وہ میری تلاش میں ہیں۔ اچانک مجھے ایک بڑا گھر نظر آیا، اس کا دروازہ بہت بڑا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ صاحب خانہ کوئی امیر کبیر اور بارسوخ آدمی ہے۔ میں غیر ارادی طور پر اس گھر میں گھس گیا۔ اس کا صحن بہت کشادہ تھا۔ وہاں بہت اجلے کپڑے پہنے ہوئے ایک باوقار شخص نظر آیا جو نہایت معزز اور محترم نظر آ رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو فوراً پوچھا: تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟ میں نے کہا:

رَجُلٌ خَائِفٌ عَلٰی دَمِهٖ، جَاءَ یَسْتَجِیرُ بِكَ

”میں ایسا آدمی ہوں جو اپنی موت سے ڈرتا پھر رہا ہے اور تم سے پناہ کا طلب گار ہے۔“

اس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اندرون خانہ اس کی بیویوں کے حجروں کے ساتھ

ایک کمرہ تھا، اس نے مجھے وہاں ٹھہرا دیا، میں ٹھہر گیا۔ صاحب خانہ کا حسن سلوک یہ تھا کہ روزانہ میرے لیے انواع و اقسام کے کھانے چنے جاتے۔ میں نہایت سکون سے رہ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کبھی کوئی گفتگو کی نہ میرے بارے میں پوچھا کہ میں کون ہوں، میرا جرم کیا ہے اور وہ کون لوگ ہیں جو میری تلاش میں ہیں۔ ہاں! ایک بات میں اچھی طرح نوٹ کرتا تھا کہ وہ روزانہ صبح سویرے کہیں نکل جاتا تھا اور ظہر سے پہلے واپس آتا تھا۔

ایک دن میں نے اس سے پوچھ ہی لیا کہ میں تمھیں روزانہ جاتے دیکھتا ہوں، تم کہاں اور کس کام کے لیے جاتے ہو؟ اس نے بتایا کہ میرے باپ کو ابراہیم بن سلیمان بن عبدالملک بن مروان نے قتل کر دیا تھا۔ مجھے باوثوق ذرائع سے پتہ چلا ہے کہ وہ حیرہ ہی میں چھپا ہوا ہے۔ میں روزانہ اس کا کھوج لگانے جاتا ہوں تاکہ اس سے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لے سکوں۔

امیر المومنین! جونہی میں نے یہ بات سنی، میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مجھے اپنی موت یقینی نظر آنے لگی۔ میں نے اس سے اس کا نام اور اس کے والد کا نام پوچھا۔ اس کے جواب سے فوراً معلوم ہو گیا کہ وہ صحیح کہہ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ تم بہت دنوں سے میری میزبانی کر رہے ہو۔ اب وقت آ گیا ہے کہ میں بھی تمھارا حق ادا کروں۔ تم نے مجھ سے بہت اچھا سلوک کیا ہے، یقیناً اس کا بدلہ میری طرف سے بھی ملنا چاہیے۔ میں بتاتا ہوں کہ تم جس شخص کو تلاش کر رہے ہو وہ کہاں ہے؟ اس نے نہایت بے تابی سے کہا: ہاں ہاں! جلدی بتاؤ وہ شخص کہاں چھپا ہوا ہے؟

میں نے کہا: میرے معزز میزبان! میں ہی وہ شخص ہوں جسے تم ڈھونڈ رہے ہو۔ تمھارے باپ کا قاتل تمھارے سامنے کھڑا ہے۔ میں تمھیں یہ بتانے کے لیے موجود ہوں کہ میرا نام

ابراہیم بن سلیمان بن عبدالملک بن مروان ہے۔ تم بڑی خوشی سے اپنا بدلہ لے لو۔

اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ کہنے لگا: یوں لگتا ہے کہ مسلسل چھپے رہنے اور اپنے گھر والوں کی جدائی کی وجہ سے تم موت کو پسند کرنے لگے ہو۔

میں نے کہا: نہیں ایسی کوئی بات نہیں، میں تم سے یہ حقیقت چُھپانا نہیں چاہتا کہ تمھارے باپ کا مطلوبہ قاتل میں ہی ہوں۔ میں نے تمھارے والد کو فلاں مقام پر فلاں دن اور فلاں تاریخ کو قتل کر دیا تھا۔

جب اس نے تفصیل سے سارا واقعہ سنا اور میری بیان کی ہوئی جُزئیات پر غور کیا تو اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور اس کی آنکھوں میں غیظ و غضب کے شرارے کوندنے لگے۔ وہ دیر تک خلا میں گھورتا رہا اور کچھ سوچتا رہا، پھر یوں لگا جیسے اس نے ایک قطعی فیصلہ کر لیا ہو۔ وہ دفعتًا میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا:

تم ایک دن میرے قادر مطلق پروردگار اور منصف حاکم کے روبرو میرے والد سے ضرور ملو گے اور وہ تم سے تمھارے ظلم، تمھاری سفاکی اور خونِ ناحق کا بدلہ لے لے گا۔ اب رہا میرا معاملہ تو امر واقعہ یہ ہے کہ میں نے تمھیں پناہ دی تھی۔ تمھیں بچانے کا عہد کیا تھا، لٰہذا میں اپنا وعدہ توڑنے کے لیے تیار نہیں کیونکہ میں بدعہدی کرنا اپنی توہین سمجھتا ہوں۔ لیکن اب میں چاہتا ہوں کہ تم فورًا میری نظروں سے دور چلے جاؤ۔ ممکن ہے، میں اپنے نفس پر قابو نہ پا سکوں اور اپنے باپ کے خون کا بدلہ لے لوں۔

پھر اس نے ایک ہزار دینار میری طرف بڑھا دیے اور کہا: یہ رقم بطور زادِ راہ ہے، یہ لے لو اور چلتے بنو۔ مجھے بڑی شرم آئی، میں نے دینار لینے سے انکار کر دیا اور وہاں سے چل دیا۔

امیر المومنین! یہ میری زندگی کا سب سے انوکھا واقعہ ہے جو میری توقع سے ماورا نہایت

عجیب وغریب، منفرد اور نرالا ہے۔ امیر المومنین! میں نے اپنی ساری زندگی میں آپ کے علاوہ اگر کسی شخص کو نہایت سخی اور اپنے وعدے کی پاسداری کرنے والا پایا ہے تو یہ وہی شخص تھا جس نے مجھے میری وحشت کے دنوں میں پناہ دی تھی اور یہ جان لینے کے باوجود کہ میں اُس کے باپ کا قاتل ہوں، مجھے معاف کر دیا تھا۔[1]

---

[1] تاریخ مدینہ دمشق لابن عساکر 416/6۔

عدل کے بغیر حکومت قائم نہیں رہ سکتی

ایک آدمی نے بنوامیہ کے کسی حکیم و دانا سے پوچھا:

مَا کَانَ سَبَبُ زَوَالِ نِعْمَتِکُمْ؟

”تمھاری حکومت کے زوال کا سبب کیا تھا؟“

حکیم نے جواب دیا:

قَدْ قُلْتَ، فَاسْمَعْ وَإِذَا سَمِعْتَ فَافْهَمْ

”تم نے مجھ سے یہ سوال پوچھ ہی لیا ہے تو اب میری باتیں غور سے سنو، میری باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نہ نکالنا بلکہ جو کچھ میں بتاؤں، اسے اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرنا۔“

پھر اس دانا آدمی نے سائل کے اہم سوال کا معقول جواب دیا۔ بنوامیہ کے زوال کے جو بنیادی اسباب تھے انھیں انتہائی انصاف کے ساتھ بے کم و کاست بیان کیا۔ اس نے بنوامیہ کی حکومت کے اسبابِ زوال پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا:

”جس بنیادی چیز کی ہمیں تلاش تھی اور جس کا اہتمام ہم پر شرطِ لازم تھا، اسے ہم نے بالائے طاق رکھ دیا۔ اس کے برعکس ہم اپنی خواہشاتِ نفس کی تکمیل کے لیے بے قابو ہوگئے۔ غیر ضروری چیزوں میں الجھ کر رہ گئے۔ ہم نے اپنے وزراء پر اندھا دُھند اعتماد کرنا شروع کر دیا اور وہ اس اعتماد کا ناجائز فائدہ اٹھانے لگے۔ ہماری

منفعت کی طرف توجہ دینے کے بجائے ہمارے ساتھ چپکے رہنے کو ترجیح دینے لگے۔ اپنا سارا زور اسی بات پر لگانے لگے کہ کسی طرح ہم سے پیوستہ ہی رہیں تاکہ اس پیوستگی کے پس پردہ وہ اپنے مفادات پورے کرتے رہیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ان وزراء نے ہماری اجازت کے بغیر طرح طرح کے قابل اعتراض کام کیے جن کا ہمیں علم بھی نہیں تھا۔ اس طرح رعایا پر ظلم وزیادتی کا ریلا آیا اور ہمارے بارے میں ان کے جذبات میں خیر کا ذرہ بھی باقی نہ رہا بلکہ ہمارے لیے ان کی نیتوں میں فتور نے جنم لیا۔ جب عوام ہمارے انصاف سے محروم ہو گئے تو اپنی راحت کے لیے ہمارے مخالفین کا ساتھ دینے لگے۔ جب ان کی اقتصادی حالت انتہائی ناگفتہ بہ ہو گئی تو پھر ہمارے بیت المال پر بوجھ پڑا اور بیت المال بھی آہستہ آہستہ اپنی اہمیت کھو بیٹھا، چنانچہ ہم اپنے لشکریوں کی مناسب حوصلہ افزائی نہ کر سکے، ان کی تنخواہوں میں تاخیر ہونے لگی، اس لیے ان کی طرف سے فرماں برداری میں ڈھیل ہونے لگی۔ نوبت بایں جارسید کہ جب ہمارے دشمنوں نے ہماری ہی رعایا کو ہمارے خلاف ورغلایا تو وہ ہمارے خلاف آمادۂ جنگ ہوگئی اور ہمارے مخالفین سے تعاون کرنے لگی۔ اس وقت جبکہ ہم اپنے ہی مسائل حل کرنے سے عاجز تھے، ہمارے دشمن ہم پر مقابلے کے لیے چڑھ دوڑے۔ ایک طرف دشمنوں کی قوت اور دوسری طرف ہماری بے بسی! اس صورتِ حال میں بھلا ہم کیا کر سکتے تھے؟ رعایا اور لشکر کی طرف سے ہمیں تعاون کی کوئی امید نہ رہی چونکہ ہر فرد ہمارے عدل وانصاف سے مایوس ہو چکا تھا، اس لیے ہم نے دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالنے ہی میں عافیت سمجھی۔ ہمارے زوال کا پہلا اور بنیادی سبب یہ تھا کہ ہم لوگوں کے درمیان عدل وانصاف قائم نہ کر سکے' ہم سے عوام کے حالات ومشکلات پوشیدہ رکھے گئے اور ہمیں حقیقت تک رسائی کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔''

دجال کا جاسوس

رسول اللہ ﷺ نے نماز ختم کی اور منبر پر تشریف لائے۔ ارشاد ہوا: ہر شخص اپنی جگہ بیٹھا رہے، پھر دریافت فرمایا: جانتے ہو میں نے تمھیں بیٹھے رہنے کے لیے کیوں کہا ہے؟

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا:

إِنِّي وَاللّٰهِ! مَا جَمَعْتُكُمْ لِرَغْبَةٍ وَّلَا لِرَهْبَةٍ

”میں نے تمھیں شوق دلانے یا ڈرانے کے لیے جمع نہیں کیا۔“

تمھیں جمع کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ تمیم داری جو پہلے نصرانی تھا، اب اس نے آ کر اسلام قبول کر لیا ہے۔ بیعت بھی کی ہے، پھر اس نے مجھ سے ایک ایسی بات بیان کی ہے جو میرے اس بیان کے مطابق ہے جو میں تم سے مسیح دجال کے بارے میں کیا کرتا تھا۔ اب اللہ کے رسول ﷺ نے تمیم داری کی زبانی بیان کردہ بات سنانا شروع کی۔

میں لخم اور جذام قبائل کے تیس آدمیوں کے ساتھ سمندر میں (چوبی جہاز) پر سوار تھا۔ ایک بڑی موج آئی اور جہاز کو بہا کر لے گئی۔ سمندری طوفان میں ہمارا جہاز ایک مہینے تک ادھر ادھر لڑھکتا اور بھٹکتا رہا، پھر اس کا رخ ایک جزیرے کی طرف ہو گیا یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا۔ جزیرے کے قریب پہنچ کر ہم ایک چھوٹی سی کشتی میں سوار ہو گئے، پھر جزیرے میں داخل ہوئے، ہم نے وہاں ایک گھنے اور کھردرے بالوں والا چوپایہ دیکھا۔ بالوں کی بہتات کی وجہ سے اس کی اگلی اور پچھلی جانب کا کوئی پتہ ہی نہ چلتا تھا۔

لوگوں نے اُس سے پوچھا: تمھارے لیے بربادی ہو! تم کون ہو؟

وہ کہنے لگا: میں جساسہ ہوں۔ ...... پوچھا: جساسہ کیا بلا ہے؟

وہ بولا: اے قوم! ایسا کرو، اس (سامنے والے) گرجا گھر میں ایک شخص رہتا ہے، اس کے پاس چلے جاؤ، وہ تمھیں بڑے شوق سے ساری بات بتائے گا اور (تمھاری بات بھی) سنے گا۔ وہ تمھارے بارے میں جاننے کا بہت مشتاق ہے۔

جب اس نے ہمیں متذکرہ آدمی کے بارے میں بتلایا تو ہمیں اس چوپائے کے بارے میں شیطان ہونے کا خوف ہوا۔ ہم لوگ جلدی سے اس آدمی کی طرف چل دیے اور گرجے میں داخل ہوئے، وہاں ایک آدمی تھا، وہ بہت لمبا تڑنگا تھا، اس کے دونوں ہاتھ گردن کے ساتھ اور دونوں زانو دونوں ٹخنوں تک لوہے (کی زنجیر) سے جکڑے ہوئے تھے۔ ہم نے اتنی سختی سے جکڑا ہوا آدمی کبھی نہ دیکھا تھا۔ ہم نے پوچھا: ارے کم بخت! تو کیا چیز ہے؟ وہ بولا: تم لوگ اب میری خبر پر قابو پا ہی لوگے (اب تمھیں میرا حال معلوم ہو جائے گا)۔ پہلے تم بتاؤ کہ تم کون لوگ ہو؟ ہم نے کہا: ہم عرب لوگ ہیں، ہم ایک سمندری جہاز میں سوار ہوئے، سمندر کی موجیں ہم سے ایک مہینے تک کھیلتی رہیں اور ہم کسی نہ کسی طرح تیرے اس ٹاپو سے آ لگے، پھر ہم ایک چھوٹی سی کشتی میں بیٹھ کر ٹاپو میں داخل ہوئے۔ یہاں ہمیں ایک بھاری دم کا بہت گھنے بالوں والا جانور ملا۔ بالوں کی کثرت سے اس کے اگلے پچھلے حصے کی شناخت ہی نہیں ہو پا رہی تھی، ہم نے پوچھا: اے کم بخت! تو کیا بلا ہے؟ وہ بولا: میں جساسہ ہوں۔ ہم نے پوچھا: یہ جساسہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا: تم لوگ اس آدمی کے پاس چلے جاؤ جو گرجے کے اندر ہے۔ وہ تمھاری خبر کا بے حد مشتاق ہے، چنانچہ ہم لوگ تیزی سے دوڑتے ہوئے تیرے پاس آ پہنچے اور ڈرے کہ مبادا تو کوئی بھوت پریت ہے۔

زنجیروں میں جکڑے ہوئے آدمی نے پوچھا: اچھا تم لوگ مجھے بیسان (فلسطین کی ایک بستی) کے نخلستان کے بارے میں تو بتاؤ؟ ہم نے کہا: تو اس نخلستان کے بارے میں کیا پوچھنا چاہتا ہے؟ وہ بولا: میں اس نخلستان کے بارے میں پوچھتا ہوں کہ کیا وہ پھلتا پُھولتا ہے؟ ہم نے کہا: ہاں پھلتا پھولتا ہے۔ اس نے کہا: اب عنقریب وہ نہیں پھلے پُھولے گا، پھر اس نے کہا: مجھے طبرستان کے سمندر (یہ سمندر فلسطین میں ہے جو فلسطین اور اردن کے درمیان حدِ فاصل ہے) کے بارے میں بتاؤ؟ ہم نے کہا: اس کے بارے میں تُو کیا پوچھنا چاہتا ہے؟ اس نے سوال کیا: کیا اس میں پانی ہے؟ ہم نے کہا: ہاں، اس میں تو بہت زیادہ پانی ہے۔ وہ بولا: عنقریب اس کا پانی سوکھ جائے گا۔ پھر اس نے کہا: مجھے زغر (ملک شام کا ایک شہر) کے چشمے کے متعلق معلومات دو؟ ہم نے کہا: تو اُس چشمے کے بارے میں کیا جاننا چاہتا ہے؟ کہنے لگا: کیا اس میں پانی ہے اور کیا وہاں کے لوگ اس پانی سے کھیتی باڑی کرتے ہیں؟

ہم نے بتایا: اس میں بہت پانی ہے۔ وہاں کے لوگ اس کے پانی سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور کھیتی باڑی کرتے ہیں۔

وہ پوچھنے لگا: مجھے نبی الامی ﷺ کے بارے میں بتاؤ کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟

ہم نے کہا: وہ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لا چکے ہیں۔

اُس نے دریافت کیا: کیا ان سے عربوں نے لڑائی کی ہے؟

ہم نے کہا: ہاں۔

پوچھا: اس کا نتیجہ کیا نکلا؟

ہم نے کہا: انھوں نے قرب و جوار کے عربوں پر قبضہ پا لیا ہے اور عربوں نے ان کی

اطاعت قبول کر لی ہے۔

کہنے لگا: کیا ایسا ہو گیا ہے؟

ہم نے کہا: ہاں۔

وہ کہنے لگا: یہ عربوں کے حق میں بہت اچھا ہے کہ اس کی اطاعت کریں۔ لو اب میں تمھیں اپنے بارے میں بتاتا ہوں:

میں مسیح دجال ہوں۔ اب وقت آیا ہی چاہتا ہے کہ مجھے یہاں سے نکلنے کی اجازت مل جائے گی۔ جب میں نکلوں گا تو ساری دنیا میں گھوموں گا۔ تمام چھوٹی بڑی بستیوں کا چالیس دنوں میں دورہ کرلوں گا۔ ہاں! میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں داخل نہیں ہو پاؤں گا کیونکہ ان دونوں شہروں میں میرے لیے داخل ہونا حرام ہے۔ جب بھی میں ان دونوں شہروں یا ان میں سے کسی ایک شہر میں داخل ہونے کی کوشش کروں گا ایک فرشتہ ننگی تلوار سونتے ہوئے میرا استقبال کرے گا اور مجھے شہر میں داخل ہونے سے روک دے گا۔ ان شہروں کے ہر راستے پر فرشتے ہیں جو ان کی حفاظت کرتے ہیں۔

اس حدیث کی راویہ فاطمہ بنت قیس ہیں جو ضحاک بن قیس کی بہن ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ اس موقع پر اللہ کے رسول ﷺ اپنے منبر پر کھڑے تھے، آپ نے اپنے عصا سے منبر پر ٹیک لگائی اور فرمایا:

هٰذِهِ طَيْبَةُ ، هٰذِهِ طَيْبَةُ ، هٰذِهِ طَيْبَةُ ، يَعْنِي الْمَدِينَةَ

”یہ طیبہ ہے، یہ طیبہ ہے، یہ طیبہ ہے۔“ یعنی مدینہ

پھر فرمایا: ”کیا میں نے تمھیں یہ باتیں نہیں بتائی تھیں؟“

لوگوں نے جواب دیا: بے شک بتائی تھیں۔

ارشاد ہوا: جب مجھ سے تمیم نے یہ اوپر والی باتیں بیان کیں تو یہ وہی باتیں تھیں جن کا میں تم سے ذکر کر چکا ہوں اور مکہ اور مدینہ کے بارے میں بتا چکا ہوں۔

أَلَا! إِنَّهُ فِي بَحْرِ الشَّامِ أَوْ بَحْرِ الْيَمَنِ، لَا بَلْ مِنْ قِبَلِ الْمَشْرِقِ

”آ گاہ رہو! دجال بحر شام (بحیرۂ روم) یا بحر یمن (بحیرۂ عرب) میں نہیں بلکہ وہ مشرق (بحر ہند) کی جانب سے آئے گا۔“

پھر آپ نے مشرق کی طرف اشارہ فرمایا۔[1]

---

[1] صحیح مسلم، حدیث:2941.

ظلم کا بدلہ

ان کی شادی کو زیادہ دیر نہیں گزری تھی، بس چند گھنٹے ہی گزرے تھے۔ میاں بیوی رات کا کھانا کھانے بیٹھے، اچانک کسی نے دروازے پر دستک دی۔ خاوند کو بڑا طیش آیا کہ یہ کون ہماری خلوت میں مخل ہو رہا ہے؟ نیک سیرت بیوی نے کہا: کوئی بات نہیں، کوئی ضرورت مند ہو گا، اچھا میں دیکھتی ہوں۔ دروازے کی اوٹ سے اس نے پوچھا: کون ہے؟ جواب ملا کہ فقیر ہوں۔ بھوکا ہوں اگر کھانا کھلا دو تو بڑا اشکر گزار ہوں گا۔

بیوی واپس آئی۔ خاوند نے غصے سے پوچھا: دروازے پر کون ہے؟

جواب دیا: کوئی فقیر ہے، کھانے کا طلب گار ہے۔

خاوند بڑابڑایا: بھلا یہ کون ہے اس وقت ہمارا دروازہ کھٹکھٹانے والا؟ وہ تاؤ میں آ کر باہر نکلا اور اس فقیر کو مارنا شروع کر دیا۔ وہ بے چارہ معذرت کرتا رہا مگر اس کا پارہ چڑھا ہوا تھا، یہ اس کی پٹائی کرتا رہا۔ فقیر ہانپتا کانپتا واپس چلا گیا۔ اس کے جسم پر خراشیں آ چکی تھیں۔ بھوک بھی بڑی سخت لگی ہوئی تھی۔ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ وہ کسی دروازے پر گیا ہو اور اس کے ساتھ ایسا ظالمانہ سلوک ہوا ہو مگر کیا کیا جائے، یہ قسمت کی بات ہے۔

خاوند واپس آ گیا۔ اب اس کا موڈ آف ہو چکا تھا۔ وہ بڑبڑاتا ہوا کھانے پر بیٹھ گیا۔ اس کی دلہن بھی پریشان نظر آ رہی تھی۔

پھر اچانک شوہر کی طبیعت خراب ہو گئی، اُسے چکر آنے لگے۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے

کسی اَن دیکھی قوت نے اُسے دبوچ لیا ہے، وہ بُری طرح چلاّ رہا تھا۔ اسی حالت میں وہ گھر سے باہر نکل گیا۔ اس کی دلہن نہایت غمگین ہوئی اور پریشانی کے عالم میں خاوند کا انتظار کرتی رہی مگر وہ گدھے کے سینگ کے مانند اس طرح غائب ہوا کہ پھر نہ آیا۔ ایک دن نہیں کئی ہفتے گزر گئے، اس کی تلاش جاری رہی۔ رشتہ دار اقرباء سب پریشان ہوگئے۔ ہر جگہ تلاش کیا مگر بے سود! اور پھر مہینے نہیں کئی سال بیت گئے۔ اس کی بیوی اس کا مسلسل بے سود انتظار کرتی رہی۔

طویل انتظار کے بعد اس نے قاضی کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا کہ میرا خاوند کئی برس سے مفقود الخبر ہے، لہٰذا میرے مستقبل کا فیصلہ کیا جائے، چنانچہ عدالت نے شریعت مطہرہ کی روشنی میں اس کا نکاح فسخ کر دیا۔

پھر اس کی شادی ایک نیک دل شخص کے ساتھ ہوگئی۔ شادی کو چند دن گزرے تھے کہ پھر وہی حالت پیش آئی جو اب سے کئی سال پہلے پیش آئی تھی۔ عورت نے دسترخوان پر کھانا لگایا۔ خاوند کھانے پر بیٹھا، ابھی چند لقمے ہی لیے تھے کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا......

شوہر بولا یہ کون ہے جو اس وقت ہماری خلوت میں مخل ہوا ہے؟ اچھا میں دیکھتا ہوں......

اس کی بیوی کہنے لگی: آپ بیٹھے رہیے، میں جاتی ہوں، پھر اس نے دروازے کی اوٹ سے پوچھا: تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟ دستک دینے والے نے کہا: میں فقیر ہوں، کئی دنوں سے بھوکا ہوں۔ کوئی مجھے کھانا کھلا دے۔ بیوی واپس آئی، خاوند کو بتایا کہ ایک فقیر ہے، کئی دن سے بھوکا ہے اور کھانا مانگ رہا ہے۔ خاوند نے اسی وقت دسترخوان سے کھانا اٹھایا اور بیوی سے کہا: جاؤ اُسے دے دو اور کہو خوب پیٹ بھر کر کھانا کھا لے۔ اگر کھانا بچ گیا تو فبہا، ہم بھی کھالیں گے ورنہ اور کھانا پکالیں گے۔

بیوی کھانا لے گئی، اس فقیر کو پیش کیا، پھر لوٹ آئی۔ اب اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے، وہ رو رہی تھی۔ خاوند نے پوچھا کیا ہوا، کیوں رو رہی ہو؟ کیا اس فقیر نے کوئی سخت بات کہہ دی ہے؟

بیوی نے روتے ہوئے جواب دیا: نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ فقیر جواب تمھارے دروازے پر بیٹھا کھانا کھا رہا ہے۔ درحقیقت یہ وہی شخص ہے جو کئی سال پہلے میرا خاوند تھا۔ میری اس سے شادی ہوئی، پہلی ہی رات ایک سائل ہمارے دروازے پر آیا، اس نے کھانا مانگا، میرا یہ خاوند غصے میں آکر اٹھا اور فقیر کو خوب مارا حتی کہ اس کا خون نکل آیا۔ وہ فقیر نڈھال ہو کر چلا گیا، پھر اچانک میرے خاوند کو یوں محسوس ہوا گویا کسی نادیدہ طاقت نے اس کے حواس سلب کر لیے ہوں۔ وہ گھر سے بھاگ گیا۔ ہم نے اُسے بہت تلاش کیا مگر وہ نہ ملا۔ اب مدتوں بعد میں نے اُسے سائل کی حیثیت سے دیکھا ہے کہ وہ میرے دروازے پر کھڑا ہے اور بھیک مانگ رہا ہے۔ اس کے خاوند نے یہ بات سنی تو وہ بھی رونے لگا۔

بیوی نے حیران ہو کر پوچھا: تم کیوں رو رہے ہو؟ وہ بولا: کیا تمھیں معلوم ہے کہ تمھارے سابقہ خاوند نے جس آدمی کو مارا تھا وہ کون ہے؟ وہ کہنے لگی: تم ہی بتاؤ وہ کون ہے۔ خاوند نے بتایا کہ وہ شخص میں ہی تھا جسے اس نے اُس دن مارا تھا۔ پاک ہے وہ ہستی جس نے ایک متکبر شخص سے ایک فقیر اور مسکین کا بدلہ لے لیا۔ مجھ سے اس نے جو سفاکانہ سلوک کیا جس طرح میری بے عزتی کی اور مجھ بھوکے پیاسے پر جو گزری اللہ نے یہ سارا ماجرا خوب دیکھا۔ اُس نے اس ظلم کو پسند نہ کیا اور اس شخص پر اپنا عذاب نازل کیا جس نے انسانیت کی توہین کی تھی۔ ربِ کریم نے مجھے میرے صبر کا پورا بدلہ دیا کہ میں نے مار کھائی،

صبر کیا، ہاتھ نہ اٹھایا، زبان سے اُف بھی نہ کہا اللہ تعالیٰ نے مجھ پر کرم فرمایا اور مجھے اپنے فضل سے غنی کر دیا اور اس ظالم شخص کو یہ سزا دی کہ اس کی عقل اور مال چھین لیا۔ اب وہ در بدر مارا مارا پھرتا ہے۔ اب وہ ایک بھکاری ہے۔ میں اُس اللہ رب العزت کے صدقے کیوں نہ جاؤں جس نے تمھارے صبر کا اتنا میٹھا پھل دیا کہ تمھیں سابقہ ظالم خاوند سے نجات دے کر اس کے بدلے میں ایک اچھا شوہر عطا فرمایا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿تِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ﴾

”ہم ان دنوں کو لوگوں کے درمیان ادل بدل کرتے رہتے ہیں۔“

باپ سے بدسلوکی کا بھیانک انجام

اصمعی ایک اعرابی کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ اس نے یہ واقعہ سنایا:

میں اپنی بستی سے یہ سوچ کر نکلا کہ سب لوگوں سے زیادہ بدبخت اور نیک بخت فرد کے بارے میں معلومات حاصل کروں اور اسے تلاش کروں۔ میں بستی بستی، نگر نگر بدبخت اور نیک بخت ڈھونڈتا رہا۔ ایک بستی سے میرا گزر ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک بوڑھے شخص کی گردن میں ایک رسی بندھی ہوئی ہے اور اس رسی کے ساتھ ایک بڑی سی بالٹی لٹک رہی ہے۔ اس کے پیچھے ایک نوجوان تھا، وہ اُس رسی کو کھینچ رہا تھا جو بوڑھے کی گردن سے بندھی ہوئی تھی، ساتھ ساتھ وہ اسے چابک سے مارتا بھی جا رہا تھا۔

میں نے نوجوان سے کہا: اس بوڑھے اور کمزور شخص کے بارے میں تجھے اللہ تعالیٰ کا خوف نہیں ہے؟ اس کی گردن میں تو پہلے ہی ایک رسی اور بڑی بالٹی لٹک رہی ہے جس سے یہ ہلکان اور پریشان ہے، اس کے باوجود تو اسے چابک بھی مار رہا ہے۔ تو کتنا سفاک ہے!

نوجوان کہنے لگا: ہاں! مگر میں تمھاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ یہ میرا باپ ہے!

میں نے اس سے کہا: اگر یہ تیرا باپ ہے تو میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے کوئی بھلائی نہ دے! کیا کوئی اپنے ہی باپ کے ساتھ اس طرح کا ظالمانہ سلوک کرتا ہے؟

نوجوان بولا:

أُسْكُتْ فَهٰكَذَا كَانَ يَصْنَعُ بِأَبِيهِ، وَكَذَا كَانَ يَصْنَعُ أَبُوهُ بِجَدِّهٖ

”خاموش رہو! (تمھیں کیا معلوم) یہ بھی اپنے باپ کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرتا تھا (جیسا مجھے اس کے ساتھ کرتے دیکھ رہے ہو)۔ اور پھر اسی طرح اس کا باپ بھی اس کے دادا کے ساتھ یہی کچھ کیا کرتا تھا۔“

میں نے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ کر کہا:

هٰذَا أَعَقُّ النَّاسِ

”بس یہی بڑھا سب سے زیادہ بد بخت ہے۔“[1]

اس واقعے سے معلوم ہوا کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا اس دنیا میں سب لوگوں سے زیادہ نیک بخت اور خوش قسمت ہے اس کے برعکس سب سے بڑا بد بخت وہ ہے جو اپنے والدین سے بُرا سلوک کرتا ہے اور انھیں تکلیف دیتا ہے۔

---

[1] دیکھیے شیخ ابراہیم بیہقی کی کتاب ”المحاسن والمساوئ“ (ص:553) ہم نے یہ قصہ ابراہیم الحازمی کی کتاب ”عاقبة عقوق الوالدين“ (ص:49) سے نقل کیا ہے۔

خبردار! دشمن ہمہ وقت موقع کی تلاش میں ہے

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

''ان کی مثال شیطان کی سی ہے جو انسان سے کہتا ہے کہ کفر کر، پھر جب وہ کفر کر بیٹھتا ہے تو پھر شیطان کہتا ہے: بے شک میں تجھ سے بری ہوں، میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔''[1]

مفسرین نے بیان کیا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک عابد گزرا ہے جس کا نام برصیصا تھا۔ اس نے اپنے گرجے میں چالیس سال تک اللہ تعالیٰ کی اطاعت و بندگی میں زندگی بسر کی اور شیطان کی اس تک رسائی نہ ہو سکی۔ ایک دن ابلیس نے سرکش شیاطین کو جمع کیا اور پوچھا: ''کیا تم میں سے کوئی برصیصا عابد کو بہکا کر میری دلجوئی نہیں کرے گا؟'' ابیض نامی شیطان بولا: میں آپ کی مراد پوری کروں گا۔

پھر ابیض نے راہب کی ہیئت اختیار کی اور برصیصا عابد کے گرجے میں پہنچ کر اسے آواز دی۔ عابد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ برصیصا عابد کی عادت تھی کہ وہ ہر دسویں دن اپنی نماز سے فارغ ہو کر دوسرے امور کی جانب متوجہ ہوتا تھا اور دسویں دن ہی روزے سے ناغہ کرتا تھا (بقیہ دنوں میں روزے سے ہوتا تھا)۔ جب شیطان نے دیکھا کہ عابد اس کا کوئی جواب نہیں

---

[1] الحشر 16:59 .

دے رہا ہے تو وہ بھی گرجے کے نیچے کھڑا ہو کر عبادت میں مصروف ہوگیا۔ برصیصا اپنی عبادت سے فارغ ہو کر ادھر متوجہ ہوا تو شیطان کو اچھی ہیئت میں بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ نماز پڑھتے دیکھا۔

برصیصا نے اسے آواز دی اور پوچھا: تیری کیا حاجت ہے؟

شیطان نے کہا: میری خواہش ہے کہ میں آپ کے ساتھ رہوں، آپ کے عمل سے استفادہ کروں، آپ کے آداب اپناؤں اور ہم دونوں عبادت بھی ایک ساتھ ہی کریں۔

برصیصا نے یہ سن کر کہا: عبادت ہی میری مشغولیت ہے۔ اگر میں تیرے ساتھ رہا تو میری مشغولیت میں کمی آ جائے گی۔ یہ کہہ کر برصیصا اپنی عبادت میں لگ گیا۔ ادھر ابیض شیطان بھی نماز پڑھنے لگا۔ برصیصا نے چالیس دن تک اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ چالیس دن بعد ادھر متوجہ ہوا تو دیکھا کہ نئے عابد صاحب تو بڑے انہماک سے نماز پڑھ رہے ہیں۔

برصیصا نے نئے عابد (شیطان) کی یہ جاں گداز عبادت وریاضت دیکھی تو پھر پوچھ بیٹھا: تیری کیا حاجت ہے؟ اس نے وہی بات کہی جو پہلے کہہ چکا تھا۔ برصیصا نے اب اُسے اپنے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی، چنانچہ یہ نیا عابد برصیصا کے گرجے میں اس کے ساتھ ایک سال تک مقیم رہا۔ اس دوران وہ ہر چالیسویں دن افطار کرتا (اور باقی دنوں میں روزے رکھتا تھا) اور ہر چالیسویں دن عبادت و بندگی سے کچھ فرصت پاتا تھا۔ جبکہ بقیہ ایام صرف عبادت ہی میں گزرتے تھے۔

جب برصیصا نے عبادت وریاضت میں نئے عابد، یعنی شیطان کی یہ کڑی محنت دیکھی تو اسے بہت بھلی لگی اور اس کا دل اس نئے عابد کی طرف کھچنے لگا۔

ایک سال بیت گیا تو ابیض شیطان نے برصیصا عابد سے کہا: اب میں چلتا ہوں کیونکہ میرا ایک دوسرا ساتھی بھی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ گمان سے بڑھ کر عبادت و ریاضت کے خوگر اور اس میں سخت محنت کرنے والے ہیں جبکہ ہمیں آپ کے بارے میں جو خبر ملی تھی وہ میرے چشم دید مشاہدے سے بالکل مختلف ہے۔ یہ بات برصیصا پر نہایت گراں گزری کیونکہ نئے عابد (شیطان) کی جدائی اسے گوارا نہیں ہوئی۔

ابیض شیطان نے جب الوداع کہا تو برصیصا عابد سے کہنے لگا: میرے پاس چند اوراد وظائف ہیں، وہ آپ کو سکھلائے دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے بیمار کو شفایاب کر دے گا اور ابتلا و آزمائش کا شکار راحت پائے گا۔

برصیصا عابد نے کہا: مجھے یہ مرتبہ و منزلت ناپسند ہے کیونکہ میں عبادت و ریاضت میں مشغول رہتا ہوں، خدشہ رہتا ہے، مبادا لوگ اس سے واقف ہو جائیں۔ اس طرح لوگ مجھے عبادت و بندگی میں مشغول نہیں رہنے دیں گے بلکہ اس سے دور کر دیں گے۔

ابیض شیطان مسلسل برصیصا عابد کی توجہ اپنے وظائف کی طرف پھیرتا رہا اور ان کلمات کے فضائل و مناقب سے اس کے دل کو رجھاتا رہا حتیٰ کہ وہ عابد کو یہ وظائف سکھانے میں کامیاب ہو گیا۔

اب یہ ابیض شیطان ایک طویل مدت تک سخت مشقت اٹھا کر اور ایک عابد کو گمراہی کی راہ پر ڈال کر اپنے سردار ابلیس کے دربار میں پہنچا اور کہنے لگا: اللہ کی قسم! میں نے برصیصا عابد کو ہلاکت و بربادی کی ڈگر پر گامزن کر دیا ہے۔

پھر یہ ابیض شیطان اپنی کارکردگی میں اضافے کے لیے نکلا اور ایک آدمی کو پکڑ کر اس کے گلے پر دباؤ ڈالا، پھر اس کے گھر بحیثیت معالج پہنچ گیا اور اہل خانہ سے کہا: تمھارے اس آدمی

کو جنون لاحق ہے، کیا میں اس کا علاج کر دوں؟ اہل خانہ نے کہا: ہاں ہاں، ضرور کرو۔ اس نے کچھ جھاڑ پھونک کا عمل دکھلانے کے بعد اہل خانہ سے کہا: اس کا جن بڑا خطرناک ہے۔ اس پر قابو پانا میرے بس کا روگ نہیں، البتہ میں تمھیں ایک عابد کا پتہ دیتا ہوں۔ اُس کی دعا سے یہ شفایاب ہو سکتا ہے۔ اہل خانہ نے پوچھا: اس کا پتہ کیا ہے؟ اس نے بتایا: تم لوگ برصیصا عابد کے پاس جاؤ، اس کے پاس اسم اعظم ہے جس سے تمھارا مریض تندرست ہو جائے گا۔

یہ لوگ برصیصا عابد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُس نے ابیض شیطان کے سکھائے ہوئے کلمات کے ساتھ دعا کی تو شیطان نے مریض سے دباؤ ہٹا لیا۔ اس طرح جنون زدہ شخص شفایاب ہو گیا۔

ابیض شیطان لوگوں کے ساتھ اسی طرح کی حرکات کرتا اور انھیں برصیصا عابد کے پاس بھیجتا رہا۔ وہاں جا کر وہ لوگ شفایاب ہو جاتے تھے۔

ایک طویل عرصے کے بعد ابیض شیطان بنی اسرائیل کے بادشاہ کی لڑکی کے پاس آیا اور اس کا بھی گلا گھونٹ دیا۔ لڑکی کے تین بھائی تھے۔ ان کے پاس یہ شیطان معالج کی شکل میں پہنچا اور بولا: کیا میں اس لڑکی کا علاج کر دوں؟ بھائیوں نے کہا: ہاں، ہم تو یہی چاہتے ہیں۔ شیطان نے کچھ کرتب دکھلانے کے بعد کہا: اس لڑکی پر کوئی سرکش شیطان سوار ہو گیا ہے، اسے بھگانا میرے بس کا روگ نہیں، البتہ تمھاری ایک آدمی کی طرف رہنمائی کرتا ہوں، اس لڑکی کو اُس کے پاس چھوڑ آؤ۔ جب سرکش شیطان آئے گا تو وہ اس لڑکی کے لیے دعا کر دے گا اور یہ ٹھیک ہو جائے گی۔ بھائیوں نے پوچھا: وہ کون آدمی ہے؟ اس نے بتایا: برصیصا عابد جو فلاں گرجے میں رہتا ہے۔

بھائیوں نے عرض کیا: برصیصا عابد کیونکر ہماری بہن کا علاج کر سکتا ہے جبکہ اس کا مرتبہ

اس سے کہیں زیادہ اونچا ہے؟

ابیض شیطان نے کہا: اگر وہ علاج کرنے کے لیے تیار ہو جائے تو ٹھیک ہے ورنہ لڑکی کو اسی کے گرجے میں رہنے دینا اور اس سے کہہ دینا کہ یہ تیرے پاس امانت ہے۔

لڑکی کے بھائی برصیصا عابد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسے حالات سے آگاہ کیا تو اس نے علاج کرنے سے انکار کر دیا، چنانچہ انھوں نے لڑکی کو اُسی کے پاس گرجے ہی میں چھوڑ دیا۔

بعض دیگر روایات کے مطابق گرجے کے گوشے میں ایک غار تھا، برصیصا عابد نے غار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لڑکی کے بھائیوں سے کہا: لڑکی کو اُس غار میں چھوڑ دو، چنانچہ بھائیوں نے لڑکی کو اس غار میں چھوڑا اور چلے گئے۔

پھر ابیض شیطان برصیصا عابد کے پاس آیا اور اس سے کہا: اس لڑکی کے پاس جاؤ اور اس کے بدن پر صرف ہاتھ پھیر دو، وہ شفایاب ہو جائے گی اور اپنے گھر واپس چلی جائے گی۔ برصیصا عابد لڑکی کی طرف چلا۔ جب غار کے دروازے کے قریب پہنچا تو شیطان جلدی سے غار میں گھس گیا اور لڑکی کے پاس جا پہنچا۔ وہ لڑکی اسے دیکھ کر ہاتھ پاؤں مارنے لگی جس کی وجہ سے اس کے جسم کا کپڑا زمین پر گر گیا۔ ادھر جب برصیصا عابد کی نظر پہلی دفعہ حسن و جمال کی ایسی زبردست پری پر پڑی تو وہ بے قابو ہو گیا۔ اپنے آپ کو کنٹرول میں نہ رکھ سکا اور اس سے اس طرح چمٹ گیا کہ اس کے حاملہ ہونے تک اُس سے لپٹا ہی رہا۔

برصیصا عابد کا منہ کالا کرانے کے بعد یہ شیطان بولا: تیری بربادی ہو برصیصا! تو نے زنا کا ارتکاب کر کے بہت بھاری غلطی کی ہے، اب تیرے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ تو

اس لڑکی کو قتل کر دے اور اللہ رب العزت کے دربار میں خالص توبہ کر لے۔ جب لڑکی کے بھائی تجھ سے اس کے بارے میں پوچھیں تو کہہ دینا کہ لڑکی کا شیطان آیا تھا، وہ لڑکی کو لے کر بھاگ گیا۔

شیطان مسلسل برصیصا عابد کو سجھاؤ دیتا رہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے لڑکی کو قتل کر کے کسی جگہ دفن کر دیا اور اپنے گرجے میں لوٹ آیا، پھر عبادت و بندگی میں مشغول ہو گیا۔ وہاں لڑکی کے بھائی آئے اور لڑکی کے بارے میں پوچھا: اے برصیصا! تو نے ہماری بہن کو کیا کیا؟ اس نے جواب دیا: لڑکی کا شیطان آیا اور اسے لے کر فرار ہو گیا۔ میں اس سے لڑکی کو نہیں چھڑا سکا۔ بھائیوں نے برصیصا عابد کی بات سچ مان لی اور واپس چلے گئے۔

بعض روایات کے مطابق برصیصا عابد نے کہا: میں نے تمھاری بہن کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کی، وہ شفایاب ہو گئی اور تمھاری طرف واپس چلی گئی۔ یہ سُن کر بھائی اپنی بہن کی تلاش میں ادھر ادھر پھیل گئے۔

جب یہ لوگ شام کو سو گئے تو سب سے بڑے بھائی کے خواب میں وہی شیطان آیا۔ اُس نے کہا: تیری خرابی ہو! برصیصا عابد نے تیری بہن سے یہ یہ شرمناک حرکت کی ہے اور اسے فلاں پہاڑ کے پاس فلاں جگہ دفن کر دیا ہے۔ بھائی نے دل ہی دل میں کہا: یہ خواب، خوابِ بد ہے۔ برصیصا عابد سچا ہے۔ وہ شیطان اسی طرح مسلسل تین راتوں تک اس بڑے بھائی کے خواب میں آ کر اسے برصیصا عابد کے خلاف ورغلاتا رہا لیکن اسے کوئی نتیجہ خیز جواب نہ مل سکا، چنانچہ وہ یکے بعد دیگرے پہلے منجھلے بھائی اور پھر چھوٹے بھائی کے خواب میں بھی اسی طرح آیا۔ چھوٹے بھائی نے دونوں بڑے اور منجھلے بھائیوں سے اپنا خواب بیان کیا۔ منجھلے اور بڑے بھائیوں نے بھی بتایا کہ ہمیں بھی ایسا ہی خواب آیا ہے۔

اب وہ تینوں بھائی دوبارہ برصیصا عابد کے پاس آئے اور اپنی بہن کے بارے میں دریافت کیا۔ برصیصا عابد نے جواب دیا: میں نے تم لوگوں کو تمھاری بہن کی خبر سے آگاہ کر دیا ہے لیکن شاید تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو۔ بھائیوں نے کہا: اللہ کی قسم! ہماری طرف سے آپ پر کوئی الزام نہیں، یہ لوگ اس بات سے بہت شرمندہ ہوئے اور اپنے گھر واپس چلے گئے۔

مگر شیطان بھلا کب خاموش رہنے والا تھا۔ ان کے پاس پھر آ دھمکا اور کہا: تم لوگ برباد ہو جاؤ! تمھاری بہن فلاں جگہ دفن کی گئی ہے۔ جا کر دیکھو، اس کا ازار بند بھی مٹی کے اوپر ہی نظر آ رہا ہے۔ وہ لوگ شیطان کی بتلائی ہوئی جگہ پہنچے، زمین کھودی۔ اب جو دیکھا تو لڑکی کی لاش موجود تھی۔ یہ دیکھ کر وہ غضبناک ہو گئے۔ فوراً برصیصا عابد کے پاس پہنچے اور کہا: چل اللہ کے دشمن، نیچے اتر تو نے ہماری بہن کو کیوں قتل کیا؟ پھر ان لوگوں نے برصیصا عابد کا گرجا منہدم کر دیا۔ اس کی گردن میں رسی باندھی اور اُسے کھینچتے ہوئے بادشاہ کے دربار پہنچے۔

بادشاہ کے رُوبرو برصیصا عابد نے اپنے جرم کا اعتراف کیا اور بتایا کہ اس جرم پر اسے شیطان نے اُکسایا تھا۔

بادشاہ نے کہا: تو نے لڑکی کو قتل کیا، اب اس کا اعتراف بھی کر رہا ہے، پس تیری سزا موت ہے، پھر بادشاہ نے برصیصا عابد کے قتل کا حکم جاری کر دیا۔

اب ابیض شیطان برصیصا عابد کے پاس آیا اور پوچھا: کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟

برصیصا عابد نے کہا: نہیں۔

شیطان نے کہا: میں تمھارا وہی دوست ہوں جس نے تمھیں وظائف سکھلائے تھے۔

تمھاری خرابی ہو! تمھارے پاس جو امانت رکھی گئی، اس میں تم نے اللہ کا خوف نہیں کیا اور خیانت کر ڈالی، کیا تمھیں اللہ سے شرم نہیں آتی؟ تم نے تو بادشاہ کے سامنے اقبالِ جُرم بھی کر لیا اور یوں تم نے خود اپنی اور اپنے جیسے دوسرے عابدوں کی بھی مٹی پلید کر دی۔ اگر تمھیں اسی حال پر موت آ جائے تو تم اور تمھارے جیسا کوئی بھی نجات نہ پا سکے گا۔

برصیصا عابد نے پوچھا: پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟

شیطان نے کہا: میری ایک بات مان لو تو میں تمھیں بچا دوں گا، ان لوگوں کی آنکھوں سے اوجھل کر دوں گا اور تمھیں تمھاری موجودہ قید سے رہائی دلا دوں گا۔

برصیصا نے پوچھا: وہ کون سی بات ہے؟

شیطان نے کہا: مجھے سجدہ کرو۔

شیطان نے کہا: مجھے سجدہ کرو۔ برصیصا نے شیطان کو سجدہ کر دیا۔

شیطان بولا: بس میں تجھ سے یہی گھناؤنا جرم کرانا چاہتا تھا۔ اب تیرا انجام کفر نکلا اور کہا:

﴿إِنِّي بَرِيٓءٌ مِّنكَ﴾

''میں تجھ سے بری ہوں۔''[1] پھر برصیصا قتل کر دیا گیا۔ امام بغوی فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے یہ مثال یہودیوں کے لیے بیان فرمائی جنھیں منافقین مدینہ نے دھوکے میں ڈال دیا، وہ بنونضیر کی مدد اور دفاع کا وعدہ کر کے انھیں مسلمانوں کے خلاف اکساتے رہے اور مشکل وقت آنے پر شیطان کی طرح ان سے لاتعلق ہو گئے۔ اور کہنے لگے: بھئی ہم لوگ تو مسلمان ہیں اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔ تمہاری مدد کیسے کریں۔[2]

---

[1] الحشر 16:59. [2] تفسیر البغوي 322/4، البداية والنهاية 136/2، المنتظم في تاريخ الملوك والأمم 158/2۔

دولت کا نشہ......ایک سانحۂ عبرت

معروف تاجر وصنعت کار فائیو سٹار ہوٹل کی لابی میں بیٹھا اپنی سوچوں میں گُم ہے۔ وہ ہمیشہ الجزائر کے دارالحکومت کے اسی ہوٹل میں ٹھہرتا ہے۔ اس کے سامنے بحیرۂ روم کا نیلگوں پانی حدنگاہ تک پھیلا ہوا ہے۔ پانی کی لہریں اٹھتیں اور ساحل تک پہنچتے پہنچتے دم توڑ دیتیں۔ دور سے بادل ہوا کے دوش پر تیرتے ہوئے آئے اور نیلے آسمان پر چھا گئے۔ موسم معتدل تھا، نہ گرمی نہ سردی۔ اس کے سامنے میز پر چائے رکھی ہوئی تھی۔ اس نے بادلوں کی طرف دیکھا اور خود کلامی کرنے لگا: کتنے خوبصورت ہیں یہ بادل، کبھی نہیں رکتے ......تمھاری زندگی بھی تو ایسی ہی ہے نا، مسلسل جدوجہد اور کوشش میں سرگرداں، کبھی نہ رکنے والی، کبھی نہ تھمنے والی، ساری زندگی مال وجاہ کی تلاش وتعاقب میں گزر گئی۔ میں نے زندگی میں کتنے سفر کیے ہیں، بالکل ان بادلوں کی طرح جن کا کوئی نشانِ منزل نہیں۔ کبھی یہاں کبھی وہاں، آج اس مُلک میں، کل اُس ملک میں۔ آج یہاں نمائش لگی ہے، کل وہاں صنعتی میلہ ہے آج یورپ میں کاروباری میٹنگ ہے تو کل عرب ممالک میں۔ ایک ہی منزل ایک ہی تمنا کہ میں کسی طرح دنیا کا کامیاب بزنس مین بن جاؤں، دنیا کے چند امیر کبیر لوگوں میں میرا بھی نام ہو میں ارب پتی کہلاؤں ...... یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے اس نے کتنی کڑی محنت کی، کتنا وقت بیرون ملک گزارا...... اس نے اپنے آپ سے سرگوشی کرتے ہوئے پوچھا: تمھاری کتنی راتیں بیوی بچوں کے ساتھ گزری ہیں اور کتنی فائیو سٹار

ہوٹلوں میں...... یقیناً جو وقت بیوی اور بچوں کے بغیر گزارا ہے وہ زندگی کا ایک بڑا حصہ ہے۔

پھر وہ قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ اپنی شکل دیکھی تو چونک پڑا...... اف یہ میرا چہرہ ہے؟ اف خدایا! میری جوانی کہاں چلی گئی؟ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

بلاشبہ میں نے بڑی دولت جمع کر لی ہے، میں بڑا معروف بزنس مین بن گیا ہوں، میری خوبصورت سی بیوی ہے اور میرا پیارا سا بیٹا بھی ہے بیوی اور بچے کا خیال آتے ہی اس کے دل میں فرحت کا احساس بیدار ہوا۔ اب تو میرا بیٹا جوان ہوگیا ہے، میری ساری جائیداد کا تنہا وارث...... کاش! ان لمحات میں میری بیوی اور میرا اکلوتا بیٹا میرے پاس ہوتے...... میری اس سے آخری سرسری سی ملاقات آج سے چند ماہ پہلے ہوئی تھی۔ شاید وہ اٹھارویں سال میں ہے۔ مگر یہ یقینی بات ہے کہ وہ انجینئرنگ یونیورسٹی کا طالب علم ہے۔ بس اب وہ انجینئر بننے ہی والا ہے۔

احمد ابھی تصورات میں گم تھا کہ اس کے کمرے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ٹرن...... ٹرن کی آواز دم بدم آرہی تھی، اس نے آنکھیں کھولیں۔ لپک کر ریسیور پکڑا...... کال قاہرہ سے آرہی تھی...... فون پر اس کا بڑا بھائی بات کر رہا تھا، اس نے ریسیور کان سے لگایا۔ وہ کہہ رہا تھا: ”فوراً پہنچ جاؤ...... تمھاری بیوی خطرے کی حالت میں ہے...... فوراً آجانا...... کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اُسے دیکھ ہی نہ سکو...... ہاں ہاں، ٹریفک کے حادثے میں شدید زخمی ہوگئی ہے...... ہاں، حالت سخت خطرناک ہے۔“

احمد نے کہا: ”اُسے فوراً خصوصی طیارے کے ذریعے یورپ منتقل کر دو، میں بھی وہاں پہنچ جاؤں گا۔ چاہے کتنی ہی رقم خرچ ہو جائے، کوئی پروا نہیں...... بس اُسے زندہ رہنا

چاہیے۔‘‘

’’جلدی آ جاؤ ہم علاج کرا رہے ہیں۔ بس تم لیٹ نہ ہونا۔‘‘

فون کال ختم ہوگئی، اس نے ریسیور رکھا...... پھر وہ ارب پتی، بچوں کی طرح رونے لگا۔

وہ فوراً پہلی فلائٹ پر قاہرہ کے لیے روانہ ہوگیا۔ ائرپورٹ پر اس کا بڑا بھائی اس کے انتظار میں تھا، کئی سال بعد اس سے ملاقات ہو رہی تھی۔ ان کی باہمی ملاقات میں اتنی طویل مدت کے خلا کا سبب کاروباری مسائل اور مصروفیات تھیں۔ برسوں بعد دونوں نے معانقہ کیا۔ بزنس مین نے بے تابی سے اپنے بڑے بھائی سے پوچھا: ’’اب میری بیوی کیسی ہے؟‘‘ بھائی نے بڑے غمگین لہجے میں جواب دیا: ’’تمھاری بیوی اب اس دنیا میں نہیں، تھوڑی دیر پہلے وہ زخموں کی تاب نہ لا کر وفات پا گئی ہے۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔ ‘‘ یہ سن کر ارب پتی بچوں کی طرح بلکنے لگا، اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اس کے بھائی نے اُسے گلے لگایا۔‘‘ بھائی کے دلاسے اور گلے لگانے سے اُسے کچھ حوصلہ اور تسلی ملی...... بھائی کی محبت غرض مندی، مفادات اور دھوکے سے پاک تھی...... اس نے بھائی سے پوچھا: ’’میری بیوی کی لاش کہاں ہے؟‘‘

بھائی نے بتایا: وہ اس وقت پوسٹ مارٹم کے لیے گئی ہے۔ میرا خیال تھا کہ ہم اُسے فوراً دفن کر دیں لیکن میں چاہتا تھا کہ تم الوداعی نظر ڈال لو اور اسے اپنے ہاتھوں سے دفن کرو۔ احمد نے اب اپنے بیٹے کے بارے میں پوچھا: ’’اسے تو تمھارے ساتھ یہاں ائرپورٹ پر ہونا چاہیے تھا، وہ کیوں نہیں آیا؟ کدھر ہے وہ؟‘‘ بھائی نے کہا: ’’ہاں، وہ کسی وجہ سے میرے ساتھ نہیں آ سکا۔‘‘

پھر احمد اپنے بھائی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا، گاڑی کا رخ گھر کی طرف تھا۔

احمد کا بڑا بھائی نبیل کسی اور ہی فکر میں مبتلا ہے...... میں اُسے کیسے بتاؤں...... یہ حادثہ کیسے ہوا...... کیوں ہوا...... اس کا ذمہ دار کون ہے اور اس کا بیٹا کہاں ہے؟

احمد نے دیکھا کہ گاڑی کا رخ اس کے گھر کی طرف نہیں ہے۔ اُس نے پوچھا: ”بھائی! تم کس طرف جا رہے ہو؟ یہ میرے گھر کا راستہ نہیں ہے، لگتا ہے کہ تم اپنے گھر جا رہے ہو۔“

احمد کا بڑا بھائی نبیل کوئی امیر کبیر آدمی نہ تھا۔ ایک متوسط درجے کا شہری اور مقامی ہائی سکول میں ٹیچر تھا...... معمولی سی تنخواہ تھی ...... مگر ایک چیز قابل توجہ تھی اور وہ یہ کہ اس کے چھوٹے بھائی نے اس کی کبھی مدد نہیں کی تھی۔

نبیل بھائی کو سہارا دیتے دیتے خاص کمرے میں لے گیا اور اندر کا دروازہ بند کر لیا۔ کئی مرتبہ اس نے زبان کھولنے کی کوشش کی مگر ہر مرتبہ وہ کچھ سوچ کر چپ ہو جاتا......۔

احمد نے بے تابی سے کہا: ”بھائی! لگتا ہے کہ آپ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”نہیں تو...... مگر...... دراصل ......“ وہ رکا، ٹھٹکا اور ذرا جھجکا...... ”بات یہ ہے......“ زبان لڑکھڑا رہی تھی اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

”بھیا مجھے سچ سچ بتا دو...... مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ کوئی غیر معمولی حادثہ ہو گیا ہے۔ شاید میری بیوی کی وفات سے بھی بڑا سانحہ...... میں سننے کے لیے تیار ہوں، تم بتاؤ تو سہی۔“

نبیل نے بولنا شروع کیا: ”بھائی احمد کیسے بتاؤں کیونکر بتاؤں...... عقل ماننے سے قاصر ہے۔ دل و دماغ تصدیق سے عاجز ہیں۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے۔ ہُوا یوں کہ آج صبح پولیس اسٹیشن سے فون آیا...... پولیس آفیسر نے مجھے فوراً بلوایا...... میں نے طلبی کا سبب پوچھا تو وہ

کہنے لگا کہ جب تم پولیس اسٹیشن آ ؤ گے تو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ میں فوراً پولیس اسٹیشن پہنچا۔ وہاں میں نے جو کچھ دیکھا...... کاش! میں نہ دیکھتا...... میں نے تمھارے اکلوتے اور لاڈلے بیٹے کو اس حالت میں دیکھا کہ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے...... خون کے دھبے لگے ہوئے تھے اور...... وہ پولیس آفیسر کے کمرے میں زمین پر اکڑوں بیٹھا تھا...... میں نے پولیس آفیسر سے پوچھا...... کہ آخر میں یہ کیا قیامت دیکھ رہا ہوں؟...... پولیس آفیسر نے میرے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔‘‘

پھر میری کھوئی کھوئی آنکھوں نے تمھارے بیٹے کی طرف دیکھا...... اس نے مجھے دیکھا...... تو ایک دم کھڑا ہو گیا، میرے سینے سے لگ گیا اور بے اختیار رونا شروع کر دیا...... وہ دھاڑیں مار مار کر روتا ہی چلا گیا...... میں نے پوچھا: بیٹے! بتاؤ تو سہی یہ تم کس حالت کو پہنچ گئے ہو؟ مگر وہ مسلسل روتا رہا۔...... میں نے پھر پولیس آفیسر سے پوچھا بتاؤ تو سہی...... ہوا کیا ہے؟...... میرے بار بار پوچھنے پر بالآخر پولیس آفیسر نے جواب دیا...... اس نے کہا...... تمھارا یہ بد بخت بھتیجا، یہ شہزادہ، یہ امیر زادہ ہیروئن پیتا ہے اور اس نے اپنی ماں کو قتل کر دیا ہے۔

احمد نے جب یہ کلمات سنے تو اس نے بڑی دلخراش چیخ ماری...... آہ!...... افسوس...... ہائے...... افسوس! میری زندگی اُجڑ گئی...... کیا یہ ممکن ہے کہ ایک بیٹے نے اپنی مشفق ماں کو قتل کر دیا ہو۔ یہ کیسے ہو گیا؟ اس کی ماں تو اس پر جان دیتی تھی۔ وہ تو اس کا اکلوتا لخت جگر تھا۔ اس کی آنکھوں کا نور اور دل کا سُرور تھا۔ وہ تو اس کے بغیر چند گھنٹے بھی نہیں گزارتی تھی۔ یہ اس کی زندگی کا سہارا تھا۔ اس کا خواب...... اس کا مستقبل تھا......اب نبیل نے احمد کو اس حادثے کی تفصیل بتانی شروع کی۔ تمھارے لاڈلے فرزند نے کچن کی چھری سے اپنی

ماں پر پے در پے قاتلانہ وار کیے یہاں تک کہ اس کی موت واقع ہو گئی...... پھر وہ پولیس اسٹیشن پہنچا اور صرف دو جملوں میں کہا...... میں فلاں کا بیٹا ہوں...... اور میں نے اپنی ماں کو قتل کر دیا ہے۔ تفتیشی آفیسر نے اس سے بہت سے سوالات کیے مگر اس نے کسی بھی سوال کا جواب دینے سے انکار کر دیا...... پولیس نے اس کی تلاشی لی...... تو اس کے کپڑوں سے ہیروئن کی پڑیا نکلی۔ اس کا میڈیکل چیک اپ کرایا میڈیکل رپورٹ سے تصدیق ہو گئی کہ وہ ہیروئن پیتا ہے۔"

اگلے دن پوسٹ مارٹم کی کارروائیوں کے بعد میت کو دفن کر دیا گیا۔ احمد نے اپنی بیوی کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا...... اس دوران پولیس والے اور صحافی اس پر سوالات کی بوچھاڑ کرتے رہے...... پورے شہر میں کہرام برپا تھا، کوئی عام آدمی ہوتا تو اخبارات صرف چند سطروں کی خبر دیتے۔ یہ تو ملک کا ممتاز صنعت کار، ارب پتی تھا جس کی بیوی کو اس کے بیٹے نے قتل کر دیا تھا۔ اخبارات نے پہلے صفحے پر اس خبر کو جلی سُرخیوں سے شائع کیا۔ ایک اخبار نے اپنے خاص ذرائع سے اس حادثے کی تفصیل شائع کی...... اس لڑکے کو ہیروئن خریدنے کے لیے رقم کی اشد ضرورت تھی، اس نے اپنی والدہ سے رقم مانگی۔ اس کی والدہ ایک ارب پتی کی بیوی تھی، اس نے اُسے رقم دینے سے انکار کیا تو وہ فوراً طیش میں آ گیا، اس نے کچن سے چھری اٹھائی، وہ نشے کی حالت میں تھا، پہلے تو اس نے والدہ کو ڈرایا دھمکایا...... اور جب اس نے مسلسل انکار کیا تو چھری کے پے در پے وار کر کے اُسے قتل کر دیا۔ اس کی والدہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ اس کا بیٹا اُسے قتل بھی کر سکتا ہے۔ اگر اُسے ادنیٰ سا بھی شبہ ہوتا تو وہ یقیناً رقم دے کر اپنی جان بچا لیتی۔

ماں کے جسم سے خون کے فوارے ابلتے دیکھے تو بیٹے کو جھٹکا لگا اور اُس کا نشہ ہرن ہو گیا

مگر اب اس کا ہوش میں آنا بے سُود تھا کیونکہ اب وہاں کچھ نہ تھا، اب وہاں اس کی ماں کی سرد لاش پڑی ہوئی تھی، چنانچہ اس نے اپنے آپ کو خود ہی پولیس کے حوالے کر دیا۔

اخبار نے مزید لکھا کہ اس حادثے کا سبب یہ ہے کہ ایک پڑھی لکھی فیملی جس کا سربراہ ایک معروف کمپنی کا مالک ہے، ارب پتی ہے، دنیا کے مختلف ممالک میں اس کے کاروبار، فیکٹریاں اور بینک بیلنس ہیں، دراصل اپنی فیملی پر توجہ نہ دے سکا۔ ایک سال پہلے اس کے بیٹے کو یونیورسٹی سے ہیروئن نوشی کے جرم میں نکال دیا گیا تھا۔

احمد نے اخبار میں لکھے ہوئے الفاظ بار بار پڑھے، اپنے آپ کو ٹٹولا کہ اس حادثے کا ذمہ دار وہ خود تو نہیں......

اور پھر باپ بیٹے کی حوالات میں ملاقات ہوئی۔ بڑی دردناک فضا تھی۔ ہیڈ وارڈن نے دروازہ کھولا...... باپ بیٹا آمنے سامنے...... طویل خاموشی...... ایک الم انگیز سانحہ...... ایک حسرت ناک ملاقات...... کیا کہیں، کیا بولیں، گفتگو کا آغاز کہاں سے ہو......؟

بالآخر برف ٹوٹی۔ بیٹے نے اپنی مُنتشر طاقتوں کو جمع کیا...... باپ سے ملاقات ہوئے کئی ماہ گزر چکے تھے، اٹک اٹک کر پوچھا: ”آپ بیرون ملک سے کب آئے؟“

باپ نے بمشکل جواب دیا...... ”دو دن پہلے۔“

بیٹا:...... ”واپس کب جائیں گے؟“

باپ: ”اس ملاقات کے فوراً بعد۔“

بیٹے نے بڑی حسرت اور ندامت سے پوچھا...... ”کہاں جائیں گے؟“

باپ نے اپنے آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے کہا: ”تمھاری پیاری ماں کے پاس۔“

……اور پھر دونوں دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

پھر اس کے بیٹے نے حادثے کی تفصیل سناتے ہوئے کہا: ''دو سال پہلے میں ہیروئن سے متعارف ہوا۔ میرے گمراہ دوستوں نے کہا……لو ہیروئن پیو، یہ جادو کی پڑیا ہے، اس سے تم اپنے تمام غم اور پریشانیاں بھول جاؤ گے، تمھیں جنسی طاقت ملے گی……سرور اور کیف آور نشہ تمھیں ستاروں سے آگے پہنچا دے گا۔……مگر جب میں نے ہیروئن پی لی تو اس کا نتیجہ بالکل مختلف تھا جوں جوں یہ زہر میری رگوں میں اُترا، میں اپنے آپ سے بیزار ہوتا چلا گیا، مسلسل تھکن اور غفلت کی نیند کا غلبہ میرا مقدر بن گیا۔……قوت ارادی ختم ہوگئی، حافظہ کمزور ہو گیا، ہمت ماند پڑ گئی، جسم کی طاقت ختم ہو گئی، شعور اُجڑ گیا، عقل جاتی رہی، پاگلوں سے بھی بدتر ہو گیا، اپنے بیگانے کی پہچان ہی معدوم ہو گئی۔……میرے ساتھی جو اس گھناؤنے کھیل میں میرے شریک کار تھے، ان کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہ تھی…… کتنے ہی ایسے تھے کہ ان کا کاروبار ختم ہو گیا، مسلسل نقصان کی وجہ سے وہ دیوالیہ ہو گئے جو ملازم پیشہ تھے، ان کی ملازمت چھوٹ گئی، جو کالجوں میں پڑھتے تھے، ان کی تعلیم ختم ہو گئی اور وہ کالج اور یونیورسٹی سے نکال دیے گئے……بس ہمیں ایک ہی چیز کی طلب تھی، ہمارے سامنے ایک ہی ہدف تھا۔ رقم کا حصول، جائز اور ناجائز کی ہر تمیز اُٹھا کر صرف پیسے کی طلب……تاکہ اس سے ہیروئن خرید سکیں……افسوس میں نے اپنی ماں کو دھوکا دیا، گھر سے قیمتی چیزیں چوری کیں، بے تحاشا جھوٹ بولے۔ بیچاری ماں مجھ پر اندھا اعتماد کرتی رہی، میرے جھوٹ کو سچ سمجھتی رہی۔ جب بھی مانگا اس نے انکار نہ کیا، میں اس کے ساتھ فراڈ ہی کرتا رہا۔ آخر ایک دن اس کے سامنے میری حقیقت کھل گئی۔ اسے معلوم ہو گیا کہ میں اس کی دی ہوئی رقم کا کیا کرتا ہوں۔ وہ بہت ناراض ہوئی، اس نے دھمکیاں دیں کہ……میں

تمھارے کرتوت تمھارے والد کو بتاؤں گی،...... اس نے مجھے بہت سمجھایا، محبت سے، پیار سے، خوشامد سے، کبھی گلے سے لگایا، کبھی میرے سر پر ہاتھ پھیر کر مجھے چُمکارا اور زندگی کی اونچ نیچ سمجھائی۔ اس نے مجھے بڑی دردمندی اور دل سوزی سے کہا...... تم ہسپتال میں داخل ہو جاؤ، میں تمھارا علاج کراتی ہوں،...... میں نے انکار کر دیا...... وقت کے ساتھ ساتھ میں نشے کا اور زیادہ رسیا ہوتا چلا گیا۔ ہیروئن خریدنے کے لیے مجھے اور زیادہ رقم کی ضرورت پیش آنے لگی مگر والدہ نے رقم دینا بند کر دی، اس کا رویہ سخت ہوتا گیا۔"

نوجوان تھوڑی دیر کے لیے رکا، خلا میں گُھورتا رہا، چند منٹ بعد پھر اس کی زبان چل پڑی...... "جس دن میں نے یہ گھناؤنا جرم کیا، اس روز مجھے اپنے علاوہ اپنے ساتھیوں کے لیے بھی ہیروئن کی اشد ضرورت تھی اور اس کے لیے رقم درکار تھی۔ میں نے والدہ سے ایک ہزار پونڈ مانگے...... میں نے جھوٹ بولا کہ میری گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، اس کی مرمت کرانی ہے مگر اسے خوب معلوم تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ اس نے رقم دینے سے انکار کر دیا۔ میرے ذہن میں ایک شیطانی منصوبہ اُبھرا۔ میں نے والدہ پر جھوٹی تہمت لگاتے ہوئے دھمکایا۔ دیکھو! اگر تم نے مجھے سیدھی طرح رقم نہ دی تو میں والد سے کہوں گا کہ تمھارے کسی غیر شخص سے ناجائز تعلقات ہیں۔ والدہ میری بکواس سن کر مشتعل ہو گئی۔ چیخ کر بولی:...... تمھیں یہ الزام لگاتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ میں تمھاری ماں ہوں، نِکل جاؤ، دُور ہو جاؤ میری نظروں سے...... اُس وقت مجھ پر ہیروئن کا نشہ پوری طرح چھایا ہوا تھا۔ اچانک مجھ پر ایک دورے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس لمحے میں نے اپنے تخیلاتی شیطانی منصوبے کو تصور ہی تصور میں گویا حقیقی رنگ میں دیکھنا شروع کر دیا۔ مجھ پر غفلت اور دیوانگی کی دُھند چھائی ہوئی تھی۔ میں نے اسی موہوم کیفیت میں اپنے تصور کے پردے

پر دیکھا کہ میری ماں واقعی کسی غیر مرد کے ساتھ غیر اخلاقی سرگرمیوں میں مبتلا ہے...... میں طیش میں آ گیا کہ ایسی خائن اور بدکار عورت کو اس دنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں، اب اسے مر جانا چاہیے، یہ موت کی سزاوار ہے کہ اس نے اپنے خاوند سے بے وفائی کی ہے...... اسی خیال کے زیر اثر میں کچن میں گھس گیا۔ گوشت کاٹنے والی چھری سامنے پڑی تھی، میں نے لپک کر چھری اٹھائی اور تیزی سے باہر نکلا، ماں بدستور غصے کی حالت میں بڑبڑا رہی تھی...... فوراً ایک ہزار پونڈ نکالو، ...... میں نے چھری اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا، اس نے پھر انکار کیا...... میں نے پوری طاقت سے اس پر چھری کا وار کیا، میرے ہوش و حواس اُڑ چکے تھے، پھر میں نے کئی وار کیے...... بار بار پے در پے...... میں نے اس کے مقدس بدن کو چھلنی کر دیا۔ وہ چیختی چلاتی رہی، سسکتی رہی، بلکتی رہی، مدد کے لیے پکارتی رہی...... حتی کہ اُس نے آخری ہچکی لی اور اس کی آواز ہمیشہ کے لیے ڈوب گئی۔

جونہی بیٹے نے یہ دردناک کہانی ختم کی...... والد نے نفرت اور غصے سے منہ پھیر لیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا حوالات سے باہر نکل گیا۔ جیلر نے حوالات کا دروازہ بند کیا۔ ادھر بیٹا پوری قوت سے چلاّیا: ''ابو...... اصل ذمے دار تم ہو...... دولت کے پجاری ابا جان! اس سانحے کی ذمہ داری تم پر ہے...... تم ہی اس کے ذمے دار ہو......'' نوجوان اسی ہذیانی حالت میں چیختا رہا اور اُس کی صدائیں پولیس اسٹیشن کی راہداریوں میں تحلیل ہوتی چلی گئیں۔

وہ رہ رہ کر کہتا تھا: ''اس جرم میں میرا والد برابر کا شریک ہے۔ اس نے میری تربیت پر کبھی توجہ ہی نہیں دی...... بربادی کا سبب تو وہ بنا۔ وہی بنا!''

اس نوجوان پر مقدمہ چلانے کی نوبت ہی نہیں آئی...... چند دن کے بعد وہ وحشت کے مارے پاگل ہوگیا۔ ڈاکٹروں نے اسے پاگل خانے بھجوا دیا۔ پاگل خانے میں اُسے

جو بھی ملتا وہ یہی کہتا: ”میرا باپ ذمہ دار ہے۔ میری ماں تو دنیا کی سب سے مقدس خاتون تھی۔“

قاہرہ میں دقی نام کا ایک محلّہ ہے۔ اس کے بیچ میں ایک خوبصورت سی مسجد ہے۔ قارئین کرام! کبھی آپ کو اس مسجد میں نماز پڑھنے کا اتفاق ہو تو وہاں آپ کو سفید لبادے میں ملبوس ایک شخص ملے گا...... سامنے رحل پر قرآن پاک رکھا ہوگا اور وہ اس کی تلاوت کر رہا ہوگا...... تلاوت کے بعد وہ ہاتھ اٹھاتا ہے اور لمبی دعا مانگتا ہے: ”یہ شخص احمد ہے وہی ارب پتی، مشہور بزنس مین اور دولت کا متوالا سابق صنعت کار!...... وہ اپنی ساری جائیداد ہیروئن کو ختم کرنے والے ادارے اینٹی نارکوٹکس کے نام وقف کر چکا ہے...... اپنا ٹھکانا مسجد میں بنا چکا ہے۔

کبھی اتفاق سے آپ اس کے ساتھ نماز ادا کریں تو وہ بڑی محبت سے ہاتھ ملائے گا، تھوڑا سا وقت مانگے گا، پھر تفصیل سے یہ سانحہ آپ کے گوش گزار کرے گا اور آپ سے اپنی بیوی کی مغفرت کی دعا کے لیے کہے گا۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سُنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
فَاعْتَبِرُوا یَاأُولِي الْأَبْصَارِ! [1]

---

[1] یہ واقعہ محمد بن صالح بن اسحاق کی کتاب ”قصص من الواقع“ (ص:7-21) میں درج ہے۔ انھوں نے وجیہ ابو ذکری کی کتاب ”المدمنون یعترفون“ سے تصرف کے ساتھ نقل کیا ہے۔

سچی توبہ

بنی اسرائیل کے ایک عابد نے ستر سال اللہ تعالیٰ کی اطاعت و بندگی میں بسر کیے۔ ایک رات وہ اپنے عبادت خانے میں عبادت گزاری میں مشغول تھا کہ اچانک ایک خوبصورت عورت عبادت خانے کے دروازے پر پہنچی، دستک دی اور عابد سے دروازہ کھلوانا چاہا۔ وہ رات بڑی سرد تھی، پھر بھی عابد نے اس عورت کو ناقابلِ توجہ سمجھا، ذرا بھی التفات نہ کیا، بس عبادت میں مگن رہا۔

عورت مجبور ہو کر واپس جانے لگی۔ عابد نے دروازہ کھول کر دیکھا تو اس عورت پر نگاہ پڑی۔ اُس کا حُسن اس غضب کا تھا کہ وہ اسے جی جان سے بھا گئی، اُسے بڑا جھٹکا لگا۔ بس اب کیا تھا جوں جوں وہ عورت کو واپس جاتا دیکھ رہا تھا اس کا دل اس کے دامِ محبت میں گرفتار ہوتا جاتا تھا۔ اُس کا دماغ عورت کے آنچل کی مہک سے معطر ہونے کے لیے بے تاب ہو گیا۔ عبادت و ریاضت کو بالائے طاق رکھا اور جھٹ اُس عورت کے پیچھے چل دیا۔ عورت کے قریب پہنچ کر دھیرے سے پوچھا: کہاں جا رہی ہو؟ عورت نے جواب دیا: جہاں مرضی چلی جاؤں۔ عابد بولا:

هَيْهَاتَ صَارَ الْمُرَادُ مُرِيدًا وَّالْأَحْرَارُ عَبِيدًا

”چھوڑو، اب کہاں جانا اور کیسا جانا؟ تم جس کی طلب میں آئی تھیں، وہ تو تمھارا دلدادہ ہو چکا، اب وہ آزاد ہوتے ہوئے بھی تمھاری غلامی قبول کرنے کو

تیار ہے۔“

عابد اس عورت کو بالآخر اپنے معبد میں لے گیا۔ وہ عورت اس کے ساتھ سات دن تک مقیم رہی۔ اب عابد کو ہوش آیا کہ اس نے کس طرح ستر برس کی عبادت کو صرف سات دن میں غارت کر دیا اور کس قدر گھناؤنے گناہ میں ملوث رہا، چنانچہ زار و قطار رونے لگا یہاں تک کہ اس پر بے ہوشی طاری ہوگئی اور وہ غش کھا کر گر پڑا۔ جب ہوش آیا تو عورت نے کہا: ”اے عابد! اللہ کی قسم! تو نے میرے علاوہ کسی اور سے ایسا کام نہیں کیا جسے اللہ کی نافرمانی کہا جائے۔ یہ تیری پہلی غلطی ہے اور میرا معاملہ بھی یہ ہے کہ میں نے بھی تیرے علاوہ کسی اور کے ساتھ کسی گناہ کا ارتکاب کر کے اللہ کی نافرمانی مول نہیں لی۔ میں تیرے چہرے پر نیکی و صلاح کا اثر دیکھتی ہوں۔ اگر تجھے تیرے پروردگار نے پناہ دی تو میرے لیے بھی معافی کی درخواست کرنا۔“

اس کے بعد وہ عابد اپنے معبد سے نکل گیا۔ اِدھر اُدھر سرگرداں پھرنے لگا، رات کو ایک کھنڈر میں پہنچا۔ وہاں دس اندھے رہتے تھے۔ ان کے قریب ہی ایک راہب رہتا تھا جو ہر رات ان اندھوں کے پاس دس روٹیاں بھیجا کرتا تھا، چنانچہ اس رات بھی راہب کا غلام حسبِ معمول اندھوں کے لیے دس روٹیاں لایا۔ وہ روٹیاں تقسیم کرنے لگا تو اس گناہ گار عابد نے بھی ہاتھ بڑھا دیا۔ ایک روٹی اسے بھی مل گئی۔ جب ایک اندھے کی روٹی کم پڑ گئی تو اس نے پوچھا:

أَيْنَ رَغِيفِي؟

”میری روٹی کدھر ہے؟“

غلام بولا: میں نے تو دس روٹیاں تمھارے درمیان تقسیم کر دیں۔ اندھے نے کہا: واہ جی واہ

کیا اب میں بھوکے پیٹ ہی رات گزاروں گا؟

یہ سن کر وہ عابد رونے لگا اور جو روٹی اس نے لے رکھی تھی، فوراً اس اندھے کے حوالے کر دی اور کہنے لگا: ''میں بھوکے پیٹ رات گزارنے کا زیادہ مستحق ہوں کیونکہ میں گناہ گار ہوں اور یہ اندھا اللہ تعالیٰ کا فرماں بردار ہے۔'' پھر وہ بھوکے پیٹ ہی سو گیا۔ اسی رات اس کی اجل آن پہنچی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی روح قبض کرنے کے لیے ملک الموت کو بھیجا اور وہ موت کے منہ میں چلا گیا۔ اب اس عابد کے بارے میں رحمت کے فرشتوں اور عذاب کے فرشتوں کے مابین اختلاف پیدا ہو گیا کہ اس شخص کو کہاں جانا چاہیے...... جہنم میں یا جنت میں؟

رحمت کے فرشتوں نے کہا: یہ آدمی اپنے گناہ سے فرار ہو کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جُستجو میں آیا ہے۔ عذاب کے فرشتوں نے کہا: نہیں، یہ تو بڑا گناہ گار آدمی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان فرشتوں کے پاس اُسی وقت وحی بھیجی کہ تم اس عابد کی ستر برس کی عبادت اور سات راتوں کے گناہوں کا وزن کرو۔ فرشتوں نے تعمیل کی، اس عابد کی ستر سالہ عبادت کو سات دن کی معصیت کے مقابلے میں تولا تو معصیت کا پلڑا عبادت کے پلڑے سے بھاری نکلا۔ اب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا: اس کی وہ نیکی میری بارگاہ میں شرف قبولیت حاصل کر چکی ہے جب اس نے روٹی اندھے کے حوالے کر دی تھی اور خود بھوکا سو گیا تھا، چنانچہ فیصلہ رحمت کے فرشتوں کے حق میں صادر ہو گیا اور عابد کی روح ان کے حوالے کر دی گئی۔ اس عابد کی توبہ سچی تھی، پس ربِ کریم نے اُسے شرفِ قبولیت سے نوازا۔[1]

---

[1] احلی الحکایات، موسیٰ بن راشد، ص: 48۔

نہلے پر دہلا

شام کے مشہور تابعی مکحول کا بیان ہے کہ حکیم لقمان کالے کلوٹے نوبی[1] غلام تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں حکمت و دانائی کا وافر حصہ عنایت فرمایا تھا۔ یہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ بنی اسرائیل کے ایک شخص نے انھیں ساڑھے تیس مثقال کے عوض خریدا تھا۔ حکیم لقمان اسی کے گھر کام کرتے تھے۔

حکیم لقمان کا آقا شطرنج کھیلنے کا بڑا شوقین تھا۔ وہ شطرنج کے ذریعے جوا کھیلا کرتا تھا۔ اس کے دروازے پر ایک نہر بہہ رہی تھی۔ ایک دن وہ اس شرط پر شطرنج کھیل رہا تھا کہ فریقین میں سے جو ہار جائے، وہ اس نہر کا پورا پانی پیے گا، بصورت دیگر ہارے ہوئے ساتھی کو جرمانہ کے طور پر فدیہ دینا پڑے گا جس کا تعین جیتنے والا ہی کرے گا۔ اتفاق یہ ہوا کہ حکیم لقمان کا آقا بازی ہار گیا۔

جیتنے والے ساتھی نے حکیم لقمان کے آقا سے کہا: تم کھیل ہار چکے ہو، اب شرط کے مطابق نہر کا پانی پیو یا فدیہ دو۔ آقا نے پوچھا: فدیے میں کیا چاہتے ہو؟

جیتنے والا بولا: فدیہ یہ ہے کہ میں تیری دونوں آنکھیں نکال دوں گا اور تیری ساری جائیداد پر قبضہ کرلوں گا۔

---

[1] نوبہ: مصر کے جنوبی حصے میں ایک وسیع و عریض خطہ ہے۔ حکیم لقمان وہیں کے رہنے والے تھے۔ اسی لیے انھیں ”نوبی“ کہا گیا۔“ (معجم البلدان: 357/5)

حکیم لقمان کے آقا نے کہا: مجھے فیصلے کے لیے ایک دن کا موقع دو۔

جیتنے والے نے ایک دن کی مہلت دے دی۔

حکیم لقمان کا آقا بہت رنجیدہ ہوا۔ وہ غمزدہ حالت میں بیٹھا تھا۔ شام کے وقت حکیم لقمان اپنی پیٹھ پر گٹھری لادے آئے تو دیکھا کہ ان کا آقا انتہائی رنج و غم کے عالم میں نڈھال ہے۔ حکیم لقمان نے آقا کو سلام کیا، پیٹھ سے بوجھ اتارا اور آقا کی خدمت میں بیٹھ گئے۔ ان کے آقا کا معمول تھا کہ جب بھی وہ اس کی خدمت میں حاضر ہوتے، وہ ان کی حکمت بھری باتیں سنتا اور محظوظ ہوتا مگر آج آقا منہ لٹکائے مایوس بیٹھا تھا۔

حکیم لقمان نے عرض کیا: آقا! کیا ماجرا ہے؟ آپ افسردہ کیوں بیٹھے ہیں؟

آقا نے غلام کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی اور اپنا رخ پھیر لیا۔

حکیم لقمان نے دوسری اور تیسری دفعہ اپنی بات دہرائی مگر آقا نے ان سے کوئی بات نہیں کی، بالآخر حکیم لقمان نے زور دے کر پوچھا: آقا! آخر آپ اس قدر گم صم کیوں بیٹھے ہیں؟ اپنے درد کا اظہار کیجیے اگر میں آپ کے درد کا مداوا نہیں بن سکتا تو اس درد میں شریک تو ضرور ہو سکتا ہوں بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کی سنگین پریشانی حل کرنے کا میرے پاس کوئی نسخہ نکل آئے جو آپ کے حق میں مفید ثابت ہو۔

آقا نے یہ بات سن کر انھیں اپنے شدید رنج و غم کا سبب بتلا دیا۔ پوری داستان سننے کے بعد حکیم لقمان نے تسلی دی: آپ بالکل شکستہ خاطر نہ ہوں۔ میرے پاس اس شرط سے بچ نکلنے کا طریقہ موجود ہے۔

آقا نے بے تابی سے پوچھا: وہ کون سا طریقہ ہے؟

حکیم لقمان نے سمجھایا: ”جب وہ جیتنے والا آدمی آپ کے پاس آئے اور کہے کہ اس نہر

کا پانی پیو تو آپ اس سے اطمینان سے پوچھیں کہ نہر کے دونوں کناروں کے درمیان والا پانی پیوں یا بہاؤ کی طرف کا پانی پیوں؟ آپ کا یہ سوال سن کر وہ لازماً یہ کہے گا کہ دونوں کناروں کے درمیانی حصے کا پانی پیو۔ جب وہ یہ کہے تو آپ اس سے فوراً کہیں: ٹھیک ہے، میں نہر کے دونوں کناروں کے درمیانی حصے کا پانی پیوں گا مگر پہلے تم بہاؤ کو روکو تا کہ میں پانی پی لوں...... اس طرح آپ پانی پینے کی شرط سے نکل جائیں گے کیونکہ آپ کا جیتنے والا ساتھی نہر کا بہاؤ نہیں روک سکتا اور جب وہ یہ کام نہیں کر سکے گا تو نہر کے دونوں کناروں کے درمیانی حصے کا پانی پینے پر اس کا اصرار باقی نہ رہ سکے گا، یوں آپ کو چھٹکارا مل جائے گا۔"

آقا کو دانشمند غلام کی ترکیب بڑی اچھی لگی اور اس کے دل کو قدرے سکون ملا۔ اگلے دن صبح اس کا ساتھی آیا۔ اُس نے مطالبہ کیا کہ میری شرط پوری کرو آقا نے کہا: بہت اچھا! پہلے یہ بتلاؤ کہ نہر کے دونوں کناروں کے درمیانی حصے کا پانی پیوں یا بہاؤ والے حصے کا؟

ساتھی نے کہا: کناروں کے درمیانی حصے کا پانی پیو۔

آقا نے کہا: بہت اچھا۔ اب تم یوں کرو کہ پہلے نہر کا بہاؤ روکو تا کہ میں تمھاری شرط پوری کر سکوں۔

ساتھی بولا: یہ تم کیا کہہ رہے ہو، کیا یہ میرے لیے ممکن ہے؟

آقا نے کہا: پھر تمھاری شرط بھی مفقود اور ہماری شرط بھی مفقود...... یوں یہ معاملہ بخیر و خوبی ختم ہو گیا۔

آقا بڑا خوش ہوا اور اس خوشی میں اس نے حکیم لقمان کو آزاد کر دیا۔[1]

---

[1] أخبار الأذكياء لابن الجوزي (45)، دار ابن حزم، لبنان.

لاجواب دلہن

عبدالعزیز کو نیند نہیں آ رہی تھی...... شدید سردی تھی...... طوفانی ہوا کے جھونکے دم بہ دم آ رہے تھے جن کی زد سے ہوٹل کی کھڑکیاں خود بخود کھل رہی اور بند ہو رہی تھیں...... یہ ہوٹل لندن میں دریا کے کنارے واقع تھا...... عبدالعزیز کی نگاہ دیوار پر لگی گھڑی پر پڑی۔ رات کے دو بج رہے تھے مگر نیند آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی...... وہ آنکھیں بند کر کے سونے کی بار بار کوشش کرتا رہا لیکن اُسے نیند نہیں آئی....

اس نے سوچا کیوں نہ ہوٹل سے باہر نکل کر قریبی سڑک پر کچھ دیر چہل قدمی کر لی جائے، ممکن ہے کچھ دیر ٹہلنے کے بعد نیند آ جائے۔

وہ ہوٹل کے کمرے سے نکلا۔ باہر شدید سردی تھی، برف باری ہو رہی تھی جس کی وجہ سے سڑک سفید ہو گئی تھی۔ آسمان سے چھوٹے چھوٹے نازک نازک برف کے گالے گر رہے تھے۔ اس نے ایک چھتری لی اور ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ وہ کئی ہفتوں سے اپنے ساتھ چھتری ضرور رکھتا تھا۔ وہ اپنے وطن میں بھی چھتری ساتھ لے کر نکلا کرتا تھا اور سورج کی تپش سے بچنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ جزیرۃ العرب کا رہنے والا تھا اور جزیرۃ العرب میں بھی اس مبارک مقام کا باشندہ تھا جہاں پہلی مرتبہ انسانیت کی تکمیل کے لیے وحی کا نزول ہوا تھا...... رسالت کا چشمہ وہیں سے پھوٹا تھا۔ ہاں، وہ مہبط وحی اور دنیا کی اُس سب سے زیادہ مقدس جگہ کا رہنے والا تھا جسے ''مکہ مکرمہ'' کے نام نامی سے جانا جاتا ہے......

وہ ہوٹل سے نکل کر چند قدم ہی چلا تھا کہ سامنے ایک پارک نظر آیا۔ اس نے اسی پارک میں چند لمحے گزارنے کا فیصلہ کیا، چنانچہ وہ پارک میں جا پہنچا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ اچانک اس کی نظر ایک انسانی لاش پر پڑی جو گھاس پر لاوارث پڑی ہوئی تھی!.....وہ چونک گیا...... اتنی رات گئے اس سنسان بیابان پارک میں ایک انسانی لاش!......کیا میں اس لاش کو اسی طرح اس کے حال پر چھوڑ دوں؟...... یہ کوئی لاش ہے یا زندہ فرد ہے؟......اگر پولیس اس بارے میں پوچھ بیٹھے تو میں کیا جواب دوں گا؟......

عبدالعزیز غیر شعوری طور پر ڈرتے ڈرتے لاش تک پہنچ گیا......لاش پر ہاتھ رکھا اور جانچا کہ یہ زندہ ہے یا مُردہ...... ہاتھ کے لگتے ہی اُسے لاش میں حرکت سی محسوس ہوئی۔ وہ آدمی زندہ تھا، مرا نہیں تھا......اس کے منہ سے شراب کی بدبو آرہی تھی......شرابِ خانہ خراب سے مدہوش ہو کر ہی وہ اتنی سرد رات میں اس پارک میں ایک لاوارث لاش کی طرح پڑا ہوا تھا......

عبدالعزیز نے اسے بمشکل اٹھایا اور اپنے ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کرتا رہا مگر وہ بری طرح نشے میں دُھت تھا۔ وہ شرابی کو لے کر روشنی میں پہنچا تو اس نے لب کشائی کی اور عربی زبان میں فحش گالیاں بکنے لگا:

’’مجرم عورت!......بیہودہ خائن لڑکی!......‘‘

عبدالعزیز نے اس سے پوچھ ہی لیا: ارے بھئی تم کہاں کے رہنے والے ہو؟

’’میں جدہ کا رہنے والا ہوں۔‘‘ مدہوش نے عالم مدہوشی ہی میں جواب دیا۔

جدہ کا!......عبدالعزیز کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔

میں مکہ مکرمہ کا رہنے والا ہوں۔ آخر وہ مجرم اور خائن لڑکی کون ہے جس کا تم بار بار نام لے رہے ہو...... عبدالعزیز نے اپنا تعارف کراتے ہوئے اس سے پوچھا۔ وہ عواطف ہے، وہ مجرم لڑکی ہے، وہ میری بیوی ہے۔ اس سنگدل نے مجھے گھر سے باہر رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ عبدالعزیز نے اس سے کہا کہ میں نے سامنے کے ہوٹل میں ایک کمرہ کرائے پر لے رکھا ہے...... آؤ، وہیں چلتے ہیں...... صبح تم جہاں جانا چاہو گے میں پہنچا دوں گا...... مدہوش نے جھوم کر ہامی بھر لی...... اور وہ دونوں ہوٹل کے کمرے میں آ گئے......

صبح کو عبدالعزیز اپنے کمرے میں داخل ہوا تو اپنے مہمان کو سوتا ہوا پایا۔ وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنے مہمان کو جگایا، چائے کی پیشکش کی...... مہمان نے خُمار بھری انگڑائی لی اور پھر دھیرے دھیرے بیدار ہوا۔ چند لمحوں تک کمرے کی فضا کا جائزہ لیتا رہا، پھر چونک کر بولا: میں اس ہوٹل میں؟ ...... مجھے یہاں کون لے آیا؟ ...... مجھے کیا ہو گیا تھا؟ ...... تم کون ہو؟ ...... میری عواطف کہاں ہے؟

عبدالعزیز نے نوجوان کو اطمینان دلایا، گزشتہ رات کے حالات سے آگاہ کیا...... نوجوان نے جب اپنی شب بیتی کی حقیقت سنی تو شرم کے مارے پانی پانی ہو گیا...... پھر اس نے عبدالعزیز سے اپنا تعارف کرایا۔

”میرا نام محمد ہے...... میں یہاں انگلینڈ میں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے آیا ہوں۔ میں ڈیڑھ سال پہلے یہاں آیا تھا...... مجھے امید ہے کہ گزشتہ رات تم نے مجھے جس حالت میں دیکھا تھا، اس پر پردہ ڈال دو گے...... اللہ تعالیٰ بھی ایک مسلمان کی پردہ پوشی کو محبوب رکھتا ہے......“

”واہ! ...... سبحان اللہ! ...... بہت خوب! ...... میرے بھائی! تمھیں لوگوں سے تو اتنا ڈر

ہے کہ پردہ پوشی کی التجا کررہے ہو مگر اس اللہ کا کوئی خوف نہیں جس نے تمھیں پیدا کیا ہے اور جو تمھاری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ تمھیں عام لوگوں کا کس قدر پاس ولحاظ ہے مگر اللہ تعالیٰ کا جو ہمارا سب سے بڑا محسن ہے، سِرے سے کوئی خیال ہی نہیں؟...... ہم چاہے مکہ میں ہوں، جدہ میں یا کسی اور مقام پر، وہ ہر جگہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔

"میرے نیک طینت بھائی! تم نے گزشتہ رات مجھے شدید سردی سے بچایا ہے اور مجھ پر بڑی مہربانی کی ہے۔ میرا گھر یہاں سے قریب ہی ہے، آؤ گھر چلتے ہیں، وہیں ناشتہ کریں گے...... وہاں میں تمھیں اپنی ساری داستان سناؤں گا...... وہاں تم میری بیوی عواطف سے میری مصالحت بھی کرا دینا...... کل رات تم نے میری جان بچائی۔ واللہ! تم میرے محسن ہو......"

عبدالعزیز نے نوجوان کی دعوت قبول کرنا اپنے لیے امر لازم جانا... ویسے بھی وہ اس نوجوان کے بارے میں مزید تفصیلات جاننا چاہتا تھا...... اس کی خواہش تھی کہ میں اس نوجوان کی اصلاح وہدایت کا ذریعہ بن جاؤں۔

عبدالعزیز اور محمد ہوٹل کے کمرے سے نکلے۔ اب دونوں کا رخ محمد کے گھر کی طرف تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ محمد کے دروازے پر جا پہنچے...... محمد نے دروازے پر دستک دی...... کون ہے؟...... گھر کے اندر سے محمد کی بیوی عواطف کی آواز آئی۔

عواطف! دروازہ کھولو، میں تمھارا شوہر محمد ہوں، میرے ساتھ ایک معزز مہمان بھی ہے...... عواطف نے فوراً برقعہ پہنا، چہرہ ڈھانپا اور آہستہ سے دروازہ کھول کر پیچھے ہٹ گئی...... اور وہ دونوں گھر کے اندر داخل ہو گئے......

عواطف کو قدرے تامل ہوا کہ آخر یہ نیا مہمان کون ہے؟...... مگر جلد ہی اس نے مہمان

کا چہرہ مہرہ دیکھ کر بھانپ لیا کہ آنے والا مہمان ایک صالح انسان ہے...... یہ کون ہے؟ شاید اسی نے تمھیں گزشتہ رات پناہ دی ہوگی؟......عواطف نے اپنے شوہر محمد کی طرف سوالیہ نگاہ سے دیکھتے ہوئے پوچھا:

جی ہاں، میں نے ہی گزشتہ رات تمھارے شوہر کو پناہ دی تھی...... یہ ایک پارک میں برف کے تودے پر مدہوش پڑا تھا...... رات اس نے میرے ہی کمرے میں بسر کی...... عبدالعزیز نے نہایت شائستگی سے بتایا۔

یہ بات سن کر عواطف بولی: یہ نیک کام انجام دینے کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ......اللہ کی قسم! اگر اس وقت محمد میرے پاس آتا تو میں ہرگز ہرگز دروازہ نہ کھولتی...... چونکہ آپ بھی ساتھ آئے تھے، اس لیے میں نے آپ کے اکرام میں دروازہ کھول دیا۔

محمد نے عواطف کو ناشتہ کی طرف توجہ دلائی اور وہ فوراً ناشتہ تیار کرنے چلی گئی......اور پھر تھوڑی ہی دیر میں دسترخوان پر ناشتہ چُن دیا گیا......عبدالعزیز اچھی طرح سمجھ گیا کہ محمد کی بیوی عواطف نہایت نیک طبع ہے، اسی وجہ سے اُس نے پورا ساتر لباس پہن رکھا ہے...... عبدالعزیز دسترخوان پر ناشتہ کر رہا تھا اور اپنے ضمیر سے مخاطب تھا:

''جب محمد کی بیوی عواطف اس قدر دیندار، بااخلاق، مہذب اور شریف ہے تو گزشتہ رات محمد اسے خائنہ اور مجرمہ کہہ کر گالیاں کیوں دے رہا تھا؟......آخر ان دونوں میاں بیوی کے مابین اس قدر شدید اختلاف کا سبب کیا ہے کہ محمد نے مجھ سے اس کے ساتھ مصالحت کرانے کی درخواست کردی ہے؟''

اس قسم کے بہت سے سوالات عبدالعزیز کے دل ودماغ میں مسلسل گردش کر رہے تھے......اسی دوران عواطف چائے لے کر دسترخوان پر آ گئی۔ اس کا شوہر محمد بولا: عواطف!

آؤ یہاں بیٹھو، اب ہم اپنے مکرم مہمان کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کرتے ہیں۔

محمد نے اپنی بیوی عواطف کو اپنے پاس بٹھایا اور گفتگو کا آغاز کیا:

''میں جو کچھ بیان کرنا چاہتا ہوں، اس کا تعلق ہمارے بچپن کے بیتے ہوئے زمانے سے ہے۔ عواطف میری چچازاد ہے۔ جب ہماری ولادت ہوئی اُسی وقت ہمارے گھرانے کے لوگ کہنے لگے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے پیدا ہوئے ہیں، ان کا آپس میں رشتہ کر دیا جائے گا...... پھر ہماری منگنی ہوگئی۔ پھر میں سیکنڈری سکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد برطانیہ چلا آیا۔

شروع شروع تو میں بہت ہی دیندار اور پنجگانہ نماز کا پابند رہا......ہم سبھی ساتھی نماز کا بڑا خیال رکھتے تھے......فسق وفجور اور شراب وشباب سے کوسوں دور تھے......

ایک زمانے تک ہماری زندگی کے ایام اسی ڈگر پر رہے۔ پھر میں بری صحبت کا شکار ہو گیا۔ اور غلط ماحول میں چلا گیا۔ میں کبھی کبھار دوستوں کی محفل میں شراب بھی پی لیتا تھا۔

میں شرابِ خانہ خراب کی بوتلیں پی کر جھومنے لگا اور اس کا چسکا اتنی شدت اختیار کر گیا کہ میری صحت کی چولیں ہل گئیں......امتحان ختم ہوا۔ میں موسمِ گرما کی چھٹیاں گزارنے کے لیے جدہ گیا......وہاں عواطف سے شادی کی، پھر اسے ساتھ لے کر یہاں برطانیہ چلا آیا۔''

یہاں آکر اس کی حالت بہت بدل گئی۔ کہاں مجھ سے محبت اور پیار کرنے والی عواطف اور اب اس کی حالت یہ ہے کہ مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ یہ مجھے ناپسند کرنے لگی ہے......

رفتہ رفتہ یہ حالت ہوگئی کہ یہ میری باتوں کی مخالفت بہت زور شور سے کرنے لگی بلکہ زبان درازی پر اتر آئی......اب اکثر ایسا ہوتا ہے کہ رات کو جب میں گھر واپس آتا ہوں تو یہ

میرے لیے دروازہ ہی نہیں کھولتی...... مجھے رات گھر سے باہر ہی گزارنا پڑتی ہے......۔''

اس مرحلے پر عواطف بول پڑی۔ کہنے لگی: ''شیخ عبدالعزیز! اب میں آپ کو اپنی کہانی سناتی ہوں:

محمد کا یہ کہنا بالکل برحق ہے کہ میں نے برطانیہ کی اس غیر موافق سرزمین پر جب سے قدم رکھا ہے، اس کی مخالفت شروع کر دی ہے...... سچی بات ہے، یہاں آنے کے بعد مجھ پر منکشف ہوا کہ میں اور محمد ایک دوسرے سے مختلف پگڈنڈیوں کے راہی ہیں۔ ہمارا ذوق و ظرف ایک دوسرے سے بالکل جُدا ہے...... ہم دونوں کے افکار اور تصورات و نظریات میں بعد المشرقین ہے۔

شیخ عبدالعزیز! محمد چاہتا ہے کہ میں نقاب اور برقعہ اُتار پھینکوں اور بے حیائی کا وہ نیم عریاں چیتھڑوں والا لباس پہنوں جو اِس حیاباختہ معاشرے میں مروج ہے...... میں تو اپنے مقدس وطن میں بھی مکمل باپردہ لباس پہنتی تھی اور آج اس فتنہ پرور سوسائٹی میں بھی میرا وہی ساتر لباس ہے جو آپ دیکھ رہے ہیں......

شیخ عبدالعزیز! کیا آپ یقین کریں گے کہ میرا شوہر محمد بار بار مجھ پر زور دیتا رہا کہ میں اس کی بات مان لوں۔ اس کے ساتھ رقص گاہوں، تھیٹروں، شراب خانوں اور فحاشی کے کلبوں میں چند دھجیوں کا عریاں لباس پہن کر شمعِ محفل بنوں...... اس نے مجھے بار بار ورغلایا کہ ہمیں ماحول کی رفتار کے ساتھ ساتھ چلنا چاہیے...... میں حیران ہوں کہ خاوند کی غیرت کہاں مرگئی۔ اس نے یہ ہلاکت گوارا کر لی کہ اس کی پاکدامن بیوی کسی غیر مرد کے ساتھ رقص کرے۔ افسوس! مغربی تہذیب ہمیں کتنی پستی میں دھکیلنا چاہتی ہے۔ کل تک یہ حال تھا کہ اپنے پیارے وطن میں کسی غیر مرد کی نظر بھی مجھ پر پڑ جاتی تو غیرت کے مارے

محمد کی رگوں میں بجلیاں کوندنے لگتیں، آج وہی محمد کیسی بے غیرتی کا مظاہرہ کر رہا ہے کہ اس اجنبی ملک میں اجنبی مردوں کے ساتھ مجھے رقص کرنے کی خود ترغیب دے رہا ہے!......

اس سے بھی زیادہ گھناؤنی اور لرزہ خیز بات یہ ہے کہ محمد اپنے بے شرم دوستوں اور ان کی واہیات بیویوں کو میرے گھر لانا چاہتا ہے......

شیخ عبدالعزیز! میں دوٹوک لفظوں میں واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ میں اپنے شوہر محمد کی صرف اسی وقت تک اطاعت کر سکتی ہوں جب تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات عالیہ سے تجاوز نہ کرے...... جب تک شوہر کی اطاعت میں اللہ کی نافرمانی حائل نہیں ہوگی، میں اس کی خدمت کے لیے ہر آن مستعد رہوں گی، وہ مجھے آگ کے شعلوں میں بھی جھونکے گا تو خوشی سے قربان ہو جاؤں گی۔ لیکن میں اُسے اپنی حیا، عفّت اور عصمت کا جنازہ نکالنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ میرے شوہر کو نوٹ کر لینا چاہیے کہ میں طاغوت کی باغی ہوں۔ میں شیطان سے ہمیشہ برسرِ پیکار رہوں گی۔ چاہے میرا شوہر مجھ سے ہمیشہ کے لیے ناراض ہو جائے مگر میں ایسا کام کبھی نہیں کروں گی جس کی وجہ سے میرا رب کریم مجھ سے رُوٹھ جائے۔ اللہ تعالیٰ کا حق شوہر کے حق سے کہیں زیادہ ہے...... میں شوہر کی خوشی کے لیے اپنے رب کو ناراض نہیں کر سکتی، اس کے برعکس میں اپنے رب کی خوشنودی کے لیے اپنے شرابی شوہر کو پائے حقارت سے ٹھکرا دوں گی۔

میں آج صاف صاف بتلا دینا چاہتی ہوں کہ جب سے میں نے اپنے شوہر محمد کو نماز ترک کرتے دیکھا ہے، اس وقت سے اب تک میں نے اسے اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیا...... کیونکہ میں جانتی ہوں کہ اللہ کے رسول ﷺ کے ارشاد گرامی کے مطابق تارکِ نماز سراسر کافر ہے...... ایک مسلمان عورت کو ہرگز زیبا نہیں کہ وہ اپنے آپ کو کسی کافر کے حوالے کر دے......

اتنا کہہ کر عواطف تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوگئی، پھر آنسو پونچھتے ہوئے بولی:

میں نے محمد کو راہِ راست پر لانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے...... ہر طریقہ آزمایا ہے تاکہ وہ شراب چھوڑ دے۔ مگر اس نے میری ہر کوشش ناکام بنا دی ہے اور میری ہر نصیحت ماننے سے انکار کر دیا ہے۔

جب میں نے دیکھا کہ میرے شوہر کی اخلاقی گراوٹ بڑھتی ہی جا رہی ہے تو میں نے اسے خبردار کر دیا کہ میں اس کے ساتھ اس گندے ماحول میں ہرگز نہیں رہ سکتی ...... میں واپس اپنے شہر جدہ جانا چاہتی ہوں...... میں اپنے گھر والوں کے ساتھ رہوں گی...... میں نے محمد کو کئی بار انتباہ کیا کہ اگر وہ شراب پی کر گھر آئے گا تو میں دروازہ بند کرلوں گی......

''گزشتہ رات دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو یہ کہنے لگا: آؤ! آج رات ہم ایک رقص گاہ میں چلتے ہیں...... وہاں میں سوسائٹی کی نامور رقاصاؤں اور فیشن کی شوقین خواتین سے تمھارا تعارف کراؤں گا...... میں نے محمد سے کہا: میرے سرتاج! گناہوں کی جگہ رات بسر کرنے کے بجائے کیوں نہ ہم اپنے گھر ہی رات گزاریں؟...... تمھیں معلوم ہے ایک مدت سے ہم دونوں اکٹھے بیٹھ بھی نہیں سکے۔

میری یہ بات سنتے ہی محمد غصے سے لال پیلا ہوگیا اور کہنے لگا: آخر تم کب تک رجعت پسند رہو گی؟......

اس کی یہ جاہلانہ اور گمراہ کن باتیں سن کر مجھے بڑا غصہ آیا۔ میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی۔ میں نے سختی سے کہا: تمھاری غیرت کہاں مرگئی ہے؟ کیا تمھیں اس تصور سے شرم نہیں آتی کہ میں کسی اجنبی مرد کے ساتھ رقص کروں؟...... میں تمھاری بیوی ہوں۔

میری باتیں سن کر محمد خاموش ہوگیا۔ اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا...... بس اس نے زور سے دروازہ بند کیا، مجھے گالیاں دیں اور چلا گیا...... اور میں رات بھر آنسو بہاتی رہی......

اس دوران غم کے مارے میرا سینہ پھٹا جا رہا تھا...... غیظ وغضب سے میرا ذہن بوجھل ہوگیا اور میرا دماغ تاریکیوں میں ڈوب گیا۔...... اللہ عزوجل کے دربار عالی کے سوا کوئی در کھلا نظر نہیں آیا...... میں اپنی جگہ سے اٹھی، وضو کیا اور ڈوبتی رات کے سناٹے میں اپنے پروردگار کے حضور کھڑی ہوگئی...... میں نے گڑگڑا کر دعا کی کہ اے اللہ! مجھے اس سخت آشوب اور آزمائش سے محفوظ رکھ...... جلد از جلد میرے لیے کشادگی کا سامان پیدا فرما...... اور مجھے میرے مقدس دین پر ثابت وقائم رکھ!......۔

رات کے دو بج رہے تھے...... میں کلام اللہ کی تلاوت کر رہی تھی...... اس وقت محمد نے دروازے پر دستک دی...... وہ شراب کے نشے میں مدہوش تھا...... میں سوچ میں پڑ گئی کہ دروازہ کھولوں یا نہ کھولوں۔ پھر میں نے ایک فیصلہ کیا' اور میں نے اپنے شوہر کو گرجدار آواز میں ڈانٹا۔ وہ دروازے کا پٹ تھامے کھڑا تھا......۔

ذلیل! شرابی! مدہوش! دیوانے! میرے گھر سے نکل جا!...... اب اس گھر میں تیرے داخلے کی کوئی گنجائش نہیں...... آج کے بعد میں تیرے لیے یہ دروازہ کبھی نہیں کھولوں گی ...... ہرگز نہیں کھولوں گی...... پھر میں نے زور سے دروازہ بند کر دیا...... میں نے سوچا کہ بے شک مجھے طلاق مل جائے۔ میں ایک بدکردار کی بیوی نہیں رہ سکتی۔ مجھے یہ جلد از جلد سعودی عرب بھجوا دے۔''

یہ کہہ کر عواطف بے اختیار رونے لگی...... ادھر اس کا شوہر محمد خاموش تماشائی کی طرح

اس کی باتیں سُنتا رہا۔ اس نے عواطف کی کسی بات کی تردید نہیں کی۔ اس کے پاس اپنے دفاع میں کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا...... یہ اس بات کی واضح دلیل تھی کہ عواطف نے جو کچھ بیان کیا تھا، وہ سو فیصد درست تھا۔ سارا قصور محمد ہی کا تھا۔

عبدالعزیز کی نگاہ میں عواطف ایک عظیم مثالی خاتون کی حیثیت اختیار کر چکی تھی...... وہ فرطِ مسرت سے جُھوم اُٹھا۔ اس کی نگاہ ماضی کی دُھند سے آگے نکل کر قرنِ اول میں جا پہنچی۔ اسے عواطف کی شخصیت میں سلف کی نیکوکار اور صاحبِ عزیمت خواتین کا عکس نظر آنے لگا۔...... عبدالعزیز اپنے جذباتِ مسرت پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر وہ کوشش کے باوجود اپنے اشکِ رواں پر قابو نہ پا سکا...... یہ خوشی کے آنسو تھے...... عواطف کے حق میں!...... اس محترم خاتون کے ایمان کی محکمی اور عزیمت و استقامت سے جگمگاتی ہوئی زندگی سے متاثر ہو کر اس کی آنکھیں آنسوؤں کا نذرانہ پیش کر رہی تھیں!

عبدالعزیز کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے اور کیا نہ کہے۔ اسی دوران محمد کی آواز گونجی:

”شیخ عبدالعزیز! اب تم ہی ہم دونوں کے لیے فیصلہ سنا دو۔ ہم تمھارے فیصلے پر راضی رہیں گے۔“

عبدالعزیز نے کہا:

”میں کیا فیصلہ سناؤں؟...... تمھاری زندگی کے سارے پردے چھلنی ہو گئے۔ سارے نقاب اُٹھ گئے۔ تمھاری صاحب ایمان و عمل اور لائقِ تعظیم بیوی نے تمھارے کردار کی کتاب کے سارے اوراق کھول دیے۔ کوئی الجھاؤ اور کوئی پیچیدگی باقی نہیں رہی۔ اب تمھیں اپنی زندگی میں بنیادی تبدیلی پیدا کرنا ہو گی۔ یا تو تم اپنے کرتوتوں سے توبہ کرو،

سچے اور کھرے مسلمان بن جاؤ اور اچھے شوہر کی طرح عواطف کے ساتھ زندگی بسر کرو ورنہ اپنی مومنہ بیوی کو طلاق دے دو تا کہ وہ اپنے گھر والوں کے پاس واپس چلی جائے......اس کے علاوہ تیسری کوئی صورت نہیں......

محمد کا سر جُھک گیا۔ زبان گُنگ ہوگئی، کاٹو تو لہو نہیں۔ آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ وہ کچھ دیر اسی طرح سکتے کی حالت میں رہا......کبھی خلا میں گُھورتا، کبھی زمین کی طرف نگاہ جُھکا لیتا۔ اُس کی آنکھیں پگھلتی اور آنسو برساتی رہیں......پھر جیسے اس کی سوئی ہوئی خودشناسی بیدار ہوگئی ہو......یکا یک اس نے اپنا سر اٹھایا اور سسک کر بولا:

”میری عظیم بیوی عواطف!...... میں اتنے دنوں سے مریض تھا...... نشے کا عادی ہو چکا تھا......بلاشبہ تم نے مجھے اسلامی آداب کی روشنی دکھلائی...... میں گمراہی کی راہ پر تھا، تم نے مجھے ہدایت کی راہ دکھائی...... میں مدہوش تھا، تم نے میرے حواس بحال کر دیے...... میں تباہی کے سمندر میں ڈوبنے والا تھا، تم نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے غرق ہونے سے بچا لیا......تم نے مجھے اتنا قیمتی سبق دیا ہے کہ میں اسے زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتا...... جب تم نے مجھے سرد طوفانی رات میں گھر میں داخل نہیں ہونے دیا اور مجھے حقارت سے دھتکارا تو بلاشبہ تم میرے معاملے میں سخت دل تھیں مگر سچی بات یہ ہے کہ وہ وقت تھا ہی ایسا کہ تم میرے ساتھ نرمی کے بجائے سخت رویہ اختیار کرتیں......نرمی کے ساتھ ایسا گرم رویہ بھی بسا اوقات پرانے مرض کے ازالے کے لیے تیر بہدف ثابت ہوتا ہے......لو میں آج اور ابھی تمھارے اور شیخ عبدالعزیز کے سامنے اللہ تعالیٰ سے عہد کرتا ہوں کہ میں نے آج سے ہمیشہ کے لیے شراب چھوڑ دی...... میں ہر وہ کام ترک کرنے کا وعدہ کرتا ہوں جس سے میرا پروردگار ناراض ہوتا ہے...... میری قیمتی بیوی عواطف!...... مجھ سے تم جیسی عظیم بیوی کی جدائی

برداشت نہیں ہوسکتی...... تم بڑی خوشی سے میرے ساتھ رہو...... آج کے بعد میں کبھی نماز نہیں چھوڑوں گا اور اپنے ایمان واخلاق کو سنوارنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کروں گا......''

شیخ عبدالعزیز کو یقین ہو چلا تھا کہ اب عواطف اور اس کے شوہر محمد میں مصالحت ہو چکی ہے، چنانچہ اس نے ان کے پاس مزید ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا۔ محمد نے انتہائی گرمجوشی کے ساتھ اسے الوداع کہا، پھر اس کی زندگی میں انقلاب آ گیا اور دونوں میاں بیوی ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگے۔

عبدالعزیز واپس ہوٹل آ گیا۔ وہ وقتاً فوقتاً محمد سے ٹیلیفون پر رابطہ کرتا رہا۔ ایک دن اسے معلوم ہوا کہ محمد ہسپتال میں داخل ہے، وہ عیادت کی غرض سے ہسپتال گیا اور اس نے محمد کی مزاج پُرسی کی۔ عواطف اپنے شوہر کا ہاتھ تھامے اسے بڑی محبت اور ہمدردی سے دیکھ رہی تھی۔ وہ کامل پردے میں تھی...... عبدالعزیز نے عواطف سے محمد کے بارے میں پوچھا۔ عواطف نے بتایا کہ بلاشبہ محمد نے اپنے وعدے کا لحاظ رکھا اور اب وہ اخلاق وکردار کی بلندی پر ہے...... کچھ دنوں پہلے جس محمد کو میں نے دیکھا تھا وہ کوئی اور چیز تھی، اب وہ یکسر بدل گیا ہے اور انتہائی دیندار بن چکا ہے...... حتیٰ کہ ہسپتال میں بھی اس نے نماز ترک نہیں کی...... آخر میں عواطف نے نہایت احترام سے عبدالعزیز کا شکریہ بھی ادا کیا......[1]

---

[1] ابوالقعقاع محمد بن صالح بن اسحاق نے اپنی کتاب "قصص من الواقع" (ص 156-169) میں اس واقعے کو مجاہد الصواف کی کتاب "أعلى الخمر أُفطر" سے نقل کیا ہے اور اس میں بہت تصرف سے کام لیا ہے۔ میں نے ابوالقعقاع کی کتاب کی مدد سے اسے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے تاکہ اردو دان حضرات بالخصوص ہماری محترم خواتین اس سے استفادہ کریں۔

جہنم سے فرار

اس واقعے کا راوی محمد صغیر بیان کرتا ہے:

میں جس زمانے کا ذکر کر رہا ہوں، اس وقت میں چھوٹا سا تھا، بہت ہی چھوٹا...... مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ میں نے جب بھی اپنے والد محترم کو دیکھا، نہایت پریشان حال دیکھا۔ مضطرب، لاچار، ہمیشہ کسی گہری سوچ میں مبتلا، ان کے لبوں پر شاید ہی کبھی مسکراہٹ آئی ہو۔ ان کے چہرے پر آئے دن مردنی چھاتی جا رہی تھی۔

میں جب بھی اسکول سے واپس آتا، والد کو انجیل مقدس کے وہ حصے سناتا جو میں اسکول سے یاد کر کے آتا تھا۔

اسپینی زبان کے کلمات بھی سناتا تھا جو میں نئے نئے سیکھ کر آتا تھا۔ میرا والد کچھ دیر میری گفتگو سنتا، پھر گھر کے آخری کمرے میں چلا جاتا۔ ہاں، وہی کمرہ جس میں کسی کو جانے کی اجازت نہ تھی...... پراسرار کمرہ!

وہ وہاں خاصی دیر تک رہتا۔ معلوم نہیں وہ وہاں کیا کرتا تھا۔ میرا والد جب کمرے سے نکلتا، میں اسے غور سے دیکھتا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہوتیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کافی دیر تک روتا رہا ہے۔ بعض اوقات وہ مجھے سامنے بٹھا کر تکتا رہتا تھا۔ اس کے ہونٹ ہلتے تھے اور بعض کلمات زبان سے ادا ہوتے تھے مگر وہ میری سمجھ میں نہیں آتے تھے، سمجھ میں آتے بھی کیسے؟ میں اس وقت چھوٹا تھا نا، بہت چھوٹا۔ سو میرا والد مجھ سے کچھ کہے بغیر اٹھ

جاتا اور دور نکل جاتا۔

میری والدہ مجھے اسکول چھوڑنے میرے ساتھ جاتی تھی۔ وہ بھی ہمیشہ پریشان رہتی، اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوتیں۔ جب میں اسکول سے آتا تو مجھے اپنے سینے سے یوں چمٹا لیتی گویا میں ایک مدت سے بچھڑا ہوا تھا۔ میرے بوسے لیتی اور وہ مجھے پیار کرتے کبھی نہ تھکتی تھی۔

میرے والدین بعض اوقات مجھ سے علیحدہ ہوتے تو عجیب سی زبان میں پُراسرار گفتگو کرتے تھے۔ یہ زبان یقیناً اسپینی زبان نہیں تھی۔ جب میں ان کے پاس جاتا، وہ فوراً گفتگو کا رخ بدل کر اسپینی زبان میں گفتگو کرنے لگتے۔ مجھے ان کی حرکات پر بڑا تعجب ہوتا تھا۔ بھلا مجھ سے کچھ چھپانے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا میں ان کا بیٹا نہیں ہوں؟ ممکن ہے میں ان کا حقیقی بیٹا نہیں ہوں۔ میں یہ بات کبھی کبھی سوچتا اور بہت روتا۔

اس طرح میرا ایک خاص مزاج بن گیا۔ ہاں، خاص مزاج، دوسرے بچوں سے بہت مختلف۔ میں چھوٹی عمر ہی میں بے حد سنجیدہ ہو گیا۔ کھیل کود سے نفرت تھی۔ کم ہی باہر نکلتا تھا۔ میری عمر کے بچے سڑکوں پر، گلیوں میں کھیلتے کودتے رہتے تھے مگر میں گھر سے باہر نہیں جاتا تھا۔ میں اکیلا بیٹھ کر سوچتا رہتا تھا۔ گھر کے حالات پر غور و فکر کرتا تھا۔ مجھے ان سوالات کا جواب درکار تھا جو میرے ذہن میں ہر وقت ہلچل مچائے رکھتے تھے حتی کہ میری ٹیچر ''خوری'' آ جاتی۔ وہ میرا بازو پکڑ کر کھینچتی کہ چلو یسوع مسیح کی عبادت کے لیے کلیسا چلتے ہیں۔

مجھے وہ دن نہیں بھولتا جب میرا نیا بھائی اس دنیا میں آیا۔ عموماً جب کسی کے ہاں نومولود آتا ہے تو سارے گھرانے میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ میرا پیارا سا بھائی، وہ بڑا ہی خوبصورت تھا۔ سفید رنگ، خوبصورت نقش و نگار۔ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا مگر میں نے

دیکھا کہ میری والدہ رو رہی ہیں۔ والد کو بھی میرے بھائی کی پیدائش کی کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ کے بجائے اکتاہٹ تھی، پھر میں نے دیکھا کہ میرا والد پاؤں پٹکتا ہوا ''خوری'' کی طرف چلا گیا۔ اسے لے کر آیا تا کہ وہ ''بچے کو بپتسمہ دے۔'' خوری آئی تو وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے آیا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا، پریشان حال، نہایت غمزدہ، اسے نومولود کی آمد کی کوئی خوشی نہ تھی۔

پھر وہ دن آیا جب ہمارے ہاں ''ایسٹر'' کا جشن تھا۔ یہ عیسائیوں کا مشہور تہوار ہوتا ہے۔ سارا غرناطہ بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ شہر میں زبردست شور و غل تھا، بہت بڑا جلوس تھا۔ الحمراء کی فصیلوں سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اس کے میناروں پر قدِ آدم صلیبیں نصب تھیں۔

ایک دن والد نے مجھے آدھی رات کو جگا دیا، پورا گھر سویا ہوا تھا وہ خاموشی سے مجھے اس کمرے میں لے گیا جہاں راتوں کو عبادت کیا کرتا تھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ گو کہ میں چھوٹا تھا مگر گھر کے ماحول نے مجھے خاصا بڑا کر دیا تھا۔ میں بڑے اضطراب کے ساتھ خوف زدگی کی حالت میں والد کے ساتھ ساتھ اگلے کمرے میں جا رہا تھا۔ ہم وہاں پہنچے تو والد نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ اب وہ چراغ تلاش کر رہا تھا۔ جب والد نے چراغ جلایا تو میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔

یہ وہی پراسرار کمرہ تھا جسے دیکھنے کا میں مدتوں سے مشتاق تھا، میرا خیال تھا کہ وہ طرح طرح کے نوادر و غرائب سے بھرا ہوگا مگر یہ تو بالکل خالی تھا۔ بس ایک طرف میز پر ایک کتاب رکھی ہوئی تھی، دیوار پر تلوار لٹک رہی تھی، ایک طرف مسند تھی۔ والد نے مجھے اس مسند پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، پھر وہ خود بھی اسی مسند پر ایک طرف بیٹھ گیا۔ خاصی دیر تک ہم دونوں خاموش رہے۔

میرا والد مجھے عجیب وغریب نظروں سے دیکھتا رہا۔ رات کا اندھیرا، پراسرار ماحول، میں خوف زدہ تھا، والد نے آگے بڑھ کر بڑے پیار سے میرا ہاتھ پکڑا اور بولا:

میرے پیارے بیٹے! تمھاری عمر 10 سال سے تجاوز کر چکی ہے۔ اب تم جوان ہو چلے ہو۔ آج میں تمھیں ایک ایسے راز سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں جسے آج تک تم سے چھپاتا آیا ہوں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ تم بھی اس راز کو راز ہی رہنے دو؟ میرے پیارے بیٹے! اس راز کو مکمل طور پر چھپائے رکھنا۔ اپنی والدہ سے، اپنے عزیز و اقارب، دوستوں اور دیگر سب لوگوں سے چھپائے رکھنا، ہرگز کسی کو نہ بتانا۔ اگر تم نے کسی کو اس راز کا ذرا سا بھی اشارہ دے دیا تو خفیہ پولیس والے تمھارے باپ کی بوٹی بوٹی کر دیں گے۔

جب میں نے خفیہ پولیس والوں کا نام سنا تو مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی۔ ہر چند میں چھوٹا سا تھا مگر خوب جانتا تھا کہ یہ خفیہ والے کیا ہوتے ہیں۔ میں آئے دن ان کے ظلم وستم کے مناظر دیکھتا تھا۔ اسکول سے آتے ہوئے بارہا میں نے ان کا وحشیانہ ستم دیکھا۔ لوگوں کو سولی پر جھولتا دیکھا، جلتی ہوئی لاشیں دیکھیں، عورتوں کی بے حرمتی دیکھی، ان کے خاک آلود تڑپتے ہوئے بدن دیکھے۔ میرے سامنے یکے بعد دیگرے سارے مناظر گھوم گئے۔ میں پہلے ہی خاموش تھا، اب بالکل گم صم ہو گیا۔

والد نے مجھے مخاطب کیا...... میرے سوال کا جواب کیوں نہیں دیتے؟ کیا تم میرا راز چھپا لو گے؟

میں نے کہا: جی ہاں کیوں نہیں؟ ضرور چھپاؤں گا۔

والد نے کہا: کیا تمام لوگوں سے حتی کہ اپنی والدہ سے بھی؟

میں نے جواب دیا: بالکل، والدہ سے بھی۔

پھر اس نے کہا: اچھا! ذرا میرے قریب ہو جاؤ۔ کان اچھی طرح کھول لو۔ میں اپنی آواز بہت دھیمی رکھنا چاہتا ہوں، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ اگر میری باتیں خفیہ والوں نے سن لیں تو وہ مجھے زندہ جلا دیں گے۔

میں اپنی جگہ سے کھسک کر والد کے قریب ہو گیا اور کہا: میں سننے کے لیے تیار ہوں۔

والد نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی کتاب کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا:

میرے بیٹے! کیا تمھیں معلوم ہے یہ کون سی کتاب ہے؟

میں نے کہا: نہیں۔

والد نے کہا: یہ اللہ کی کتاب ہے۔

میں نے وضاحت چاہی: کیا یہ وہی کتاب مقدس ہے جو یسوع مسیح لے کر آئے تھے؟

میرا باپ ذرا مضطرب ہوا، پھر کہنے لگا:

نہیں، یہ قرآن کریم ہے۔ یہ نہایت مقدس کتاب ہے۔ اسے اللہ رب العزت نے نازل فرمایا ہے۔ وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، وہ ساری مخلوق سے بے نیاز ہے۔ اس نے کسی کو جنا نہ وہ کسی سے جنا گیا۔ اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ اس نے یہ کتاب دنیائے انسانیت کی سب سے افضل اور عظیم شخصیت سید الانبیاء محمد بن عبداللہ ﷺ پر نازل فرمائی۔‘‘

دہشت کے مارے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔

والد نے مزید کہا: یہ کتاب اسلام کا سرچشمہ ہے، اسلام کا جس کی اللہ نے اپنے نبی محمد ﷺ کے ذریعے تکمیل فرمائی۔ وہ جگہ یہاں سے دور ہے، سمندروں کے اُس پار۔ صحراؤں سے دور...... وادیوں سے دور...... مکہ مکرّمہ میں اس کا آغاز ہوا...... ایک ایسی قوم میں جو سرکش تھی، باغی تھی، مشرک تھی، جاہل تھی۔ اس مقدس کتاب نے انھیں توحید کی دولت سے نوازا۔

اتحاد کی نعمت سے مالا مال کیا اور ساری دنیا کا امام بنا دیا۔

اللہ تعالیٰ نے انھیں قوت، علم اور ترقی عطا فرمائی۔ یوں وہ قوم راہ راست پر آ گئی۔ ایک رب کو ماننے والی بن گئی، پھر اس نے تقویٰ کا راستہ اپنایا اور اپنا ایمان مضبوط کیا تو ساری دنیا ان کے قدموں تلے آتی چلی گئی۔ وہ مشرق و مغرب کو فتح کرتے کرتے یہاں اس جزیرہ نما میں آ گئے، یہاں اسپین میں۔ یہاں کا حاکم بڑا ظالم اور جابر تھا۔ یہاں کے عوام نہایت مفلس اور قلاش تھے۔ ان میں علم اور تمدن نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ عرب کے باسیوں نے اس ظالم اور جابر حاکم کو قتل کیا۔ سفاک حکومت کا خاتمہ کیا۔ عادلانہ اور منصفانہ نظام قائم کیا۔ لوگوں کو چین اور سکون مہیا کیا، انھیں علم سکھایا، تمدن دیا اور پھر ایک لمبی مدت تک یہاں حکومت کی۔ جانتے ہو کتنے سال تک؟ آٹھ سو سال تک اسپین پر ان مسلمانوں ہی کی حکومت کا پرچم لہراتا رہا۔ مسلمانوں نے اس خطۂ ارض کو دنیا کا سب سے زیادہ خوبصورت علاقہ بنا دیا۔ یہاں ایسی عمارتیں تعمیر کیں کہ دنیا میں ان کی مثال نہیں ملتی۔

ہاں میرے بیٹے سنو! ہم عرب مسلمان ہیں۔

میں اپنی زبان پر قابو نہ رکھ سکا۔ دہشت اور حیرت کے مارے میرا عجیب حال ہو گیا۔ باپ نے پرجوش لہجے میں پوچھا: اب بتاؤ ہم کون ہیں؟. میں نے تقریباً چلا کر کہا: ہم عرب مسلمان ہیں۔

ہاں میرے بیٹے! یہی وہ راز ہے جو میں تمھیں بتانا چاہتا تھا۔

ہاں! ہم وہ ہیں جو اس ملک کے حاکم تھے...... یہ جو محلات تمھیں نظر آتے ہیں، یہ ہمارے ہی بزرگوں نے بنائے ہیں۔ ان ایوانوں کی ایک ایک اینٹ میں ہمارے اسلافِ کرام کی ہنرمندیوں کا کمال اور محنت کا پسینہ جذب ہے۔ اب ان پر ہمارے دشمنوں نے

قبضہ کر لیا ہے۔ کبھی ان فلک بوس میناروں سے مؤذن کی مقدس صدا گونجا کرتی تھی۔ آج ان میناروں سے ناقوس کی صدائیں آتی ہیں۔ ہم نے بڑی خوبصورت مساجد تعمیر کیں جن میں پانچوں وقت مسلمان اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہوتے تھے۔ ان کی محرابوں سے کلام اللہ کی نورانی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ اب انھیں گرجا گھروں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اب یہاں پادری اور بشپ انجیل پڑھتے اور پڑھاتے ہیں۔

ہاں میرے بیٹے سنو! ہم مسلمان عرب ہیں۔ اسپین کی زمین کے ایک ایک چپے پر ہمارے اسلاف کے نقوش چمک رہے ہیں۔ ہمارے آباء و اجداد نے اس سرزمین کو اپنے خون پسینے سے سینچا ہے۔ اس سرزمین کے ذروں میں ہمارے شہداء کا خون جذب ہے...... ہاں! یہ جو خوبصورت شہر اور حسین بستیاں تمھیں نظر آتی ہیں، ہماری ہی تعمیر کردہ ہیں...... یہ بڑے بڑے پل ہم نے تعمیر کیے۔ یہ سڑکیں ہم نے بنائیں۔ یہ خوبصورت باغ، قطار در قطار درخت یہ سب کچھ ہمارے ہی بزرگوں کی محنت کی مستند نشانیاں ہیں۔

مگر چالیس سال گزرے...... کیا تم سن رہے ہو؟...... میرا والد کہہ رہا تھا...... چالیس سال گزر گئے ہیں، ہمارا ایک حکمران ...... ابو عبداللہ صغیر...... جو ملت اسلامیہ کا خائن تھا...... جس نے قوم اور اسلام کے ساتھ غداری کی...... جو اس ملک کا آخری مسلم حکمران تھا...... جس نے اسپینیوں کے جھوٹے وعدوں پر اعتبار کر لیا۔ اس نے غرناطہ کی چابیاں ان کے حوالے کر دیں۔ اپنے آباء و اجداد کے مدفن انھیں سونپ دیے۔ ان کے محلات اور آبادیاں دشمنوں کے سپرد کر دیں اور خود ذلیل و خوار ہو کر مراکش روانہ ہو گیا تاکہ وہاں مر جائے۔ ان لوگوں نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ مسلمانوں کو فکر و عمل کی آزادی ہو گی۔ ان کے ساتھ انصاف ہو گا۔ انھیں جینے کا حق دیا جائے گا۔ انھیں مذہبی آزادی حاصل ہو گی۔

پھر جب حکومت ان کے ہاتھ میں آ گئی تو انھوں نے خیانت کی۔ سارے وعدے پس پشت ڈال دیے اور ’’دیوانِ تفتیش‘‘ (Inquisition Bureau) کے نام سے ایک خفیہ محکمہ قائم کر دیا۔ ہمیں زبردستی عیسائی بنایا گیا۔ اپنی زبان ترک کرنے پر مجبور کیا گیا۔ ہم سے ہماری اولادیں چھین لی گئیں تا کہ ان کی نشو ونما عیسائی طریقے کے مطابق کی جا سکے۔ اسی لیے تم نے دیکھا، ہم خفیہ طریقے سے عبادت کرتے ہیں۔ تم دیکھتے ہو کہ ہم ہر وقت پریشان اور غم زدہ رہتے ہیں، آخر کیوں؟ اس لیے کہ ہماری اولاد کو زبردستی عیسائی بنا لیا گیا ہے جس کی وجہ سے ہمارے سینوں میں گھاؤ پڑ گئے ہیں۔

چالیس سال گزر چکے، ہم یہ عذاب برداشت کر رہے ہیں۔ اگر سنگلاخ پہاڑوں پر بھی یہ ظلم وستم ڈھائے جاتے تو وہ بھی ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ ہم اس وقت سے اللہ کی مدد کے منتظر ہیں کہ ظلم کی یہ سیاہ رات کب ختم ہو گی؟ ہم مایوس نہیں، ہرگز نہیں کیونکہ ہمارے دین میں مایوسی حرام ہے۔ ہمارا دین قوت کا دین ہے، صبر اور جہاد کا دین ہے۔

میرے بیٹے! یہی وہ راز تھا جو میں تمھیں بتانا چاہتا تھا۔ اسے بہرحال چھپا کر رکھنا، کسی فرد بشر پر ظاہر نہ کرنا۔ اچھی طرح جان لو کہ تمھارے والد کی زندگی اب تمھارے ہونٹوں کی بندش پر موقوف ہے۔ اللہ کی قسم! میں موت سے خوف زدہ نہیں، میں تو اپنے رب سے ملاقات کا آرزومند ہوں مگر میں کچھ عرصہ زندہ رہنا چاہتا ہوں تا کہ تمھیں تمھارے دین کی زبان سکھا سکوں، تمھارا دین بچا سکوں، تمھیں کفر کے اندھیروں سے نکال کر نور ایمان کی طرف لے جاؤں...... میرے بیٹے! رات ڈوب رہی ہے، ستارے آنکھیں میچ رہے ہیں۔ اب اٹھو...... اپنے بستر پر چلے جاؤ...... سو جاؤ میرے لعل!

اس کے بعد میری کیفیت ہی بدل گئی۔ میں جب بھی حمراء کے محلات کو دیکھتا یا غرناطہ

کے سر بفلک میناروں پر نظر ڈالتا تو میرے دل کی کیفیت متغیر ہو جاتی۔ کبھی تو ان محلات سے محبت بڑھ جاتی اور کبھی نفرت ہو جاتی...... میں بار بار وہاں کے چکر کاٹتا تھا اور انھیں دیکھ کر کہتا تھا:

اے الحمراء!...... اے مسلمانوں کی عظمت کے امین!...... کیا تو اپنے بنانے والوں کو بھول گیا ہے؟ اپنے ان دوستوں کو جنھوں نے تمھیں بڑی محبت اور پیار سے تعمیر کیا۔ اپنے خون پسینے کی کمائی تم پر صرف کی، کیا ان کے درد بھول گئے ہو؟ کیا ان حکمرانوں کو بھول گئے جو تمھارے بالا خانوں میں چہل قدمی کرتے تھے، تمھاری مسندوں میں تکیے لگا کر بیٹھتے تھے، جو بڑی عزت و اکرام والے تھے؟ کیا تمھیں ناقوس کی ان گھنٹیوں سے پیار ہو گیا ہے؟ کیا تمھیں ان پادریوں سے محبت ہو گئی ہے؟ تم اپنے علمائے کرام کو بھول چکے ہو؟ میں پہروں کبھی اپنے آپ سے اور کبھی الحمراء کی پتھریلی دیواروں سے باتیں کرتا رہتا۔ کبھی میں خوفزدہ ہو جاتا جیسے یہ در و دیوار مجھے پیس ڈالیں گے۔

پھر میں ڈر کے مارے اردگرد دیکھتا، کہیں کوئی جاسوس میرا پیچھا تو نہیں کر رہا، پھر میں گھر کی طرف بھاگتا...... عربی زبان سیکھنے کے لیے۔ میرا والد ہی میرا معلم تھا۔ وہ مجھے عربی زبان سکھاتا۔ میں اس کے حروف لکھتا۔ اس کے بولنے کا طریقہ اور سلیقہ سیکھتا، اس کے قواعد معلوم کرتا، پھر میں...... وضو کا طریقہ...... نماز...... روزے...... دیگر ارکان اسلام سیکھتا چلا گیا...... اور اس پر اسرار کمرے میں خفیہ طور پر اپنے والد کی امامت میں نماز پڑھنے لگا۔

والد کو یہ خوف دامن گیر رہتا تھا کہ کہیں میں اس کا راز فاش نہ کر دوں۔ میری والدہ میرا امتحان لیتی اور اکثر پوچھا کرتی تھی:

تمھارا والد تمھیں کیا پڑھاتا رہتا ہے؟

میں جواباً کہتا: کچھ بھی نہیں۔

وہ کہتی: مجھے سب خبر ہے۔ مجھ سے کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں۔

میں کہتا: نہیں کچھ بھی نہیں۔ آپ کو خواہ مخواہ شک ہے۔

پھر وہ وقت آیا جب مجھے عربی زبان پر عبور حاصل ہو گیا۔ میں قرآن پاک کو سمجھ گیا، اسے پڑھنے لگا۔ میرے والد کا ایک دوست تھا...... دینی بھائی، دوسرے لفظوں میں میرا چچا۔ ہم تینوں اکٹھے ہوتے، عبادت کرتے اور قرآن کی تلاوت کرتے۔ اب میں اسلام کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کر چکا تھا۔

خفیہ پولیس والوں کی سرگرمیوں میں تیزی آتی جا رہی تھی۔ ان کا ایک ہی کام تھا: بچے کھچے مسلمان عربوں کو تلاش کرنا اور انھیں تشدد کا نشانہ بنانا۔ یہ روز کا معمول تھا کہ بیس تیس افراد کو بلا ناغہ سولی پر لٹکا دیا جاتا تھا، نجانے کتنے مسلمان تھے جنھیں آئے دن زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ سینکڑوں بے قصور مسلمانوں کو جیلوں میں بدترین سزائیں دی جاتی تھیں۔ ان کے ناخن اکھاڑ دیے جاتے تھے۔ کبھی ٹھنڈے اور کبھی گرم پانی میں ڈبکیاں دی جاتی تھیں۔ ان پر کھولتا ہوا پانی ڈالا جاتا تھا، ان کے جسم جھلس جاتے تھے۔ ان کے قدموں کے نیچے جلتے ہوئے کوئلے بچھا دیے جاتے تھے، انگلیاں کاٹ کر ان کے کباب بنائے جاتے تھے اور پھر زبردستی انھی کو کھلائے جاتے تھے، کوڑوں سے اتنا مارا جاتا کہ گوشت اُدھڑ جاتا اور خون کے فوارے پھوٹ پڑتے تھے۔

ظلم و تشدد کا یہ دور طویل ہوتا چلا گیا۔ اس میں دن بہ دن اضافہ ہی ہوتا رہا۔ ظلم و ستم کی ایسی لرزہ خیز داستانیں رقم کی گئیں کہ تاریخ عالم میں ان کی مثال نہیں ملتی۔

ایک دن والد نے مجھے بلایا......

کہنے لگا: بیٹا یوں لگتا ہے کہ میری موت قریب آ چکی ہے۔ میں خفیہ ایجنسیوں کی نگاہوں میں آ چکا ہوں۔ میری تمنا ہے کہ میں ان کے ہاتھوں شہادت پا جاؤں تا کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت عطا فرما دیں۔ میری ساری تگ ودو کا مقصد یہی تھا کہ تمھیں کسی طرح کفر کے اندھیروں سے نکال کر سیدھے راستے پر چلا سکوں اور یہ عظیم امانت تمھارے حوالے کر جاؤں۔ میرے بیٹے! اگر مجھے کچھ ہو گیا تو پھر اپنے اس چچا کی اطاعت کرنا جو ہمارے ساتھ نمازوں میں شریک ہوتا ہے۔

دن گزرتے گئے، ایک سیاہ اور پراسرار رات کو میرا چچا آیا، وہی میرے والد کا دوست۔ اس نے مجھے حکم دیا کہ میں اس کے ساتھ نکل چلوں۔ اللہ نے مدد کی، ہم وہاں سے فرار ہو گئے۔ مراکش کی طرف چل دیے، مسلمانوں کے ملک کی طرف۔ میں نے چچا سے پوچھا کہ میری امی اور میرے ابو جان......؟

اس نے میرا ہاتھ زور سے پکڑ کر جھٹکا دیا اور کہا: کیا تمھارے والد نے تمھیں میری اطاعت کا حکم نہیں دیا تھا؟

میں مجبوراً اس کے ساتھ چلتا رہا حتی کہ ہم غرناطہ سے دور نکل گئے۔ جب رات کی تاریکی چھٹ گئی اور ہم خطرے سے دور ہو گئے تو وہ مجھ سے کہنے لگا:

اِصْبِرْ يَا بُنَيَّ......فَقَدْ كَتَبَ اللّٰهُ لِوَالِدَيْكَ الْمُؤْمِنَيْنِ السَّعَادَةَ عَلٰى يَدِ دِيوَانِ التَّفْتِيشِ

”میرے بیٹے! صبر کرو۔ تمھارے والدین کو اللہ تعالیٰ نے دیوان تفتیش والوں کے ہاتھوں دائمی سعادت (شہادت) بخشی، اب وہ جنت کے راہی بن چکے ہیں۔“

پھر ہم چھپتے چھپاتے مراکش کے ساحل پر پہنچ گئے۔

قارئین کرام! کیا آپ جانتے ہیں کہ یہی وہ بچہ ہے جو اسلام کا نامور مصنف بنا جسے تاریخ ''محمد بن عبد الرافع اندلسی'' کے نام سے جانتی ہے۔ آپ نے 1052 ہجری میں وفات پائی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ان کی تصانیف سے فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ [1]

---

[1] ماخوذ از قصص من التاريخ، علي طنطاوي.

مسلمانوں نے اسپین یا اندلس 92ھ /711ء میں طارق بن زیاد کی قیادت میں فتح کیا اور آٹھ سو سال وہاں حکومت کی مگران کے باہمی نفاق کے باعث بالآخر ہسپانوی عیسائی ان پر غالب آگئے۔ 636 ہجری میں قرطبہ کا سقوط ہوا اور 897ھ / 1492ء میں مسلمانوں کا آخری حصار غرناطہ بھی ان سے چھن گیا۔ اس کے بعد سوا سو سال تک مسلمانان اندلس پادریوں کے زیرنگرانی دیوان تفتیش کے ہاتھوں وحشیانہ عذاب اور آزمائش سے گزرتے رہے حتیٰ کہ اسپین سے مسلمانوں کا صفایا ہو گیا۔

تاک جھانک کا خمیازہ

عضد الدولہ کے دربار میں ایک ترکی نوجوان کام کرتا تھا۔ اس کے ہمسائے میں ایک شریف گھرانہ آباد تھا۔ میاں بیوی نئے نئے شادی کے بندھن میں بندھے تھے۔ دیوار سے دیوار ملی ہوئی تھی۔ اتفاق کی بات، دیوار سے ایک اینٹ گر پڑی یا اس ترکی نوجوان نے قصداً نکال لی، بہرحال دیوار میں سوراخ ہو گیا۔ اس ترکی نے روزنِ دیوار سے جھانک کر دیکھا۔ اسے ایک نہایت خوبصورت عورت نظر آئی۔ اب اُسے دید و باز دید کا ایسا چسکا پڑا کہ وہ پہروں سوراخ سے اُس عورت کو دیکھتا رہتا۔ شروع شروع میں تو عورت کو پتا نہ چلا کہ کوئی اُسے دیکھتا ہے، البتہ رفتہ رفتہ اُسے معلوم ہو گیا کہ ترکی ہمسایہ اُسے چوری چھپے دیکھتا رہتا ہے۔ عورت پاک دامن تھی، اس نے اپنے خاوند سے شکایت کی کہ یہ ترکی مجھے روزانہ روزنِ دیوار سے جھانکتا رہتا ہے۔ اس مکان میں میرے سوا کوئی اور نہیں ہے، اس لیے لوگوں کو شک گزرے گا کہ میری اس سے شناسائی ہے اور میں اس سے باتیں کرتی ہوں گی، سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے چھٹکارے کے لیے کیا کروں؟

خاوند کو جب یہ مذموم حرکت معلوم ہوئی تو اسے بڑا غصہ آیا کہ اس کی عزت پر ڈاکہ ڈالا جا رہا ہے، اس نے فوراً ایک منصوبہ بنایا اور اپنی بیوی سے کہا: گھبرانے کی ضرورت نہیں، ایسا کرو کہ اس کے نام ایک رقعہ لکھو اور اسی روزن سے اس کی طرف پھینک دو۔ رقعے کا مضمون یہ ہونا چاہیے: ”نوجوان! فضول کھڑے ہونے اور روزن سے مجھے چوری چھپے تکتے

رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تم یوں کرو کہ عشاء کے بعد جب اندھیرا چھا جائے اور لوگ سو جائیں تو تم چپکے سے میرے دروازے پر آ جانا، ہلکی سی دستک دینا، میں تمھارے لیے خاموشی سے دروازہ کھول دوں گی۔'' عورت نے یہ مضمون لکھ کر نوجوان کی طرف روزن سے رُقعہ پھینک دیا۔ نوجوان نے فوراً رقعہ پڑھا، خوشی سے جھوم اٹھا اور رات ہونے کا بے تابی سے انتظار کرنے لگا۔

ادھر خاتون کے شوہر نے گھر کے دروازے کے پیچھے گہرا گڑھا کھودا اور عشاء کے وقت ترکی نوجوان کی گھات میں بیٹھ گیا۔ سورج غروب ہوا۔ چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ عشاء کے وقت نوجوان عورت کے دروازے پر جا پہنچا اور احتیاط سے دستک دی، دروازہ دھیرے سے کھل گیا۔ نوجوان نے جونہی اندر قدم رکھا۔ شوہر نے زور سے لات ماری اور اسے گڑھے میں گرا دیا۔ پھر میاں بیوی نے مل کر اوپر سے مٹی ڈال دی۔

چند دنوں تک تو اس ترکی نوجوان کے بارے میں کسی نے کوئی بات نہیں کی مگر جب وہ متواتر کئی دن تک نظر نہ آیا تو عضد الدولہ کو اس کا دھیان آیا۔ اس نے اپنے مقربین سے اس کے بارے میں استفسار کیا تو اسے بتایا گیا کہ وہ کئی دنوں سے بغیر اطلاع کے ڈیوٹی سے غائب ہے۔

عضد الدولہ کو اچانک ترکی نوجوان کے غائب ہو جانے پر بڑی تشویش ہوئی۔ وہ اس معاملے کی تفتیش کرنے لگا۔ اس نے اس کی رہائش گاہ کے قریب والی مسجد کے مؤذن کو بلا بھیجا۔ مؤذن کو سرکاری دربار سے بلاوا آیا تو یہ خبر آنِ واحد میں پورے محلے میں پھیل گئی کہ مؤذن کو خلیفہ نے طلب کیا ہے۔ مؤذن حاضرِ خدمت ہوا۔ بظاہر عضد الدولہ مؤذن سے سختی سے پیش آیا، تاہم اس نے جیب سے سو دینار نکالے اور کہنے لگا:

هٰذِهِ مِائَةُ دِينَارٍ ، خُذْهَا وَامْتَثِلْ مَا آمُرُكَ

’’یہ سو دینار لو اور تمھیں جو حکم دوں اس کی تعمیل کرو۔‘‘

مؤذن نے عرض کیا: حکم دیجیے، فوری تعمیل ہو گی۔

عضد الدولہ نے حکم دیا کہ جب تم واپس جاؤ تو عشاء کی اذان دے کر مسجد کے اندر بیٹھ جانا۔ سب سے پہلے جو شخص آئے اور میری نسبت پوچھے کہ میں نے تمھیں کیوں طلب کیا تھا تو صبح اس کے بارے میں آ کر مطلع کرنا۔

مؤذن واپس آیا اور عضد الدولہ کے حکم کے مطابق اذان دے کر مسجد میں بیٹھ گیا۔ اذان سنتے ہی ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا، یہ وہی آدمی تھا جس کی بیوی پر ترکی نوجوان بری نگاہ رکھے ہوا تھا اور جسے اس نے اپنے دروازے کے پاس گڑھے میں دفن کر دیا تھا، مسجد میں داخل ہوتے ہی اس نے مؤذن سے پوچھا:

قَلْبِي إِلَيْكَ وَلِأَيِّ شَيْءٍ أَرَادَ مِنْكَ عَضُدُ الدَّوْلَةِ؟

’’میرا دل تمھاری ہی طرف لگا ہوا تھا، بتاؤ! خلیفہ نے تمھیں کیوں بلوایا اور وہ تم سے کیا معلوم کرنا چاہتا تھا؟‘‘

مؤذن نے بتایا: کوئی خاص بات نہیں، عضد الدولہ نے مجھ سے اچھی ہی بات کی ہے۔

صبح ہوتے ہی مؤذن مسجد سے نکلا اور عضد الدولہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس آدمی کے بارے میں اطلاع دی۔ عضد الدولہ نے فوراً اس آدمی کو بلا بھیجا۔ کچھ دیر بعد وہ آدمی عضد الدولہ کے دربار میں حاضر ہو گیا، وہ گھبرایا ہوا تھا۔ عضد الدولہ نے اسے دیکھتے ہی پوچھا: ترکی نوجوان کا کیا قصہ ہے؟

وہ بولا: حضور! آپ نے اس ترکی نوجوان کے بارے میں پوچھ ہی لیا ہے تو میں آپ کو

بالکل سچ بتلاتا ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ میری بیوی پردہ نشین اور پاک دامن خاتون ہے۔ یہ نوجوان ہمارا پڑوسی تھا۔ وہ مکان کی دیوار سے اسے دیکھتا رہتا تھا اور ورغلانے کی کوشش کررہا تھا۔ دیوار کے ساتھ صرف میرا ہی گھر ہے اور اس میں صرف میری بیوی ہی رہتی ہے، اس لیے وہ اس بات سے بہت پریشان تھی کہ اگر کسی کو اس کی تاک جھانک کا حال معلوم ہوگیا تو وہ یہی سمجھے گا کہ وہ بھی اس نوجوان کی خباثت میں برابر کی شریک ہے۔ یہ میری عزت پر حملہ تھا، میں برداشت نہ کرسکا، لہٰذا میں نے اُسے ٹھکانے لگادیا...... اس شخص نے مختصر طور پر تُرکی نوجوان کو گڑھے میں دفن کی کرنے روداد بھی سنادی۔

عضدالدولہ نے اس کی ساری گفتگو سننے کے بعد فرمایا:

اِذْهَبْ فِي دَعَةِ اللّٰه ، فَمَا سَمِعَ النَّاسُ وَلَا قُلْنَا

”جاؤ۔ اللہ کے سپرد! نہ لوگوں کو اس بات کی کوئی خبر ہوئی، نہ ہم یہ راز افشا کریں گے۔“[1]

---

[1] دیکھیے ابن جوزی کی تالیف ”کتاب الأذکیاء“ص:90،91۔

اللہ کی نافرمانی کے خسارے

ع ......سب کچھ لُٹا کے ہوش میں آئے تو کیا کیا؟

ہماری زندگی کے ایام انتہائی خوشگواری کے ساتھ بسر ہو رہے تھے۔ ہم دونوں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے کاموں میں ایک دوسرے کے معاون تھے۔ قناعت پسندی ہمارا اصول تھا اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی ہمارا اشعار اور مطمحِ نظر۔

ہماری شیر خوار بچی گھر کا روشن چراغ تھی۔ اس کی میٹھی میٹھی آواز ہمارے کانوں میں رس گھولتی رہتی تھی۔ وہ ایک ایسی کلی تھی جو ربِ کریم کے فضل سے ہمارے آنگن میں کِھل اُٹھی۔

ہمارا معمول تھا کہ جب رات کی تاریکیاں اپنی کمندیں ڈال دیتیں اور ساری دنیا نیند کے مزے لے رہی ہوتی تو بچی کو پلنگ پر سوتا چھوڑ کر میں اپنے سرتاج کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوتی، پھر ہم دونوں میاں بیوی اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور تسبیح میں لگ جاتے، پھر میرا شوہر نماز پڑھتا اور میں اس کے پیچھے کھڑی ہو کر مقتدی کی حیثیت سے نماز پڑھتی۔ میرا شوہر انتہائی دلکش آواز میں ترتیل کے ساتھ قرآن پاک کی تلاوت کرتا۔ اس کی آواز اس قدر دل پذیر اور اثر انگیز تھی کہ میری آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو جاتے تھے۔

ایک دن نجانے کیوں میرے دل میں دنیا کا لالچ آ گیا۔ میں نے اپنے شوہر کے سامنے تجویز رکھی کہ کیوں نہ ہم سودی کاروبار میں اپنے لیے چند حصے خرید لیں تاکہ ہماری آمدنی میں دن دگنی رات چوگنی ترقی ہو اور اپنے بچوں کے لیے کچھ سرمایہ جمع کر سکیں۔

شوہر راضی ہوگیا اور ہم نے اپنا پورا مال سودی کاروبار میں لگا دیا حتی کہ میری منگنی کا وہ زیور بھی اس میں شامل کر دیا جو میرے شوہر نے مجھے بطور تحفہ عنایت کیا تھا۔

مگر ہوا یہ کہ ہم نے جس کاروبار میں اپنے لیے حصے خرید رکھے تھے، کساد بازاری کی وجہ سے اس میں خاصا خسارہ ہوگیا، پھر وہ وقت آیا کہ ہم تباہی کے دہانے پر پہنچ گئے۔ ہماری ساری دولت بتدریج ختم ہوتی گئی۔ اب کیا تھا، آہستہ آہستہ ہم مقروض ہو گئے اور ادائیگیوں کے بوجھ سے ہماری کمر ٹوٹنے لگی۔

کچھ دنوں بعد قرض کا اتنا بھاری بوجھ لد گیا کہ اس کی ادائیگی کے تصور سے بھی ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اس وقت ہمیں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر پختہ یقین ہوگیا:

﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ﴾

”اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقے کو بڑھاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کسی ناشکرے گنہگار سے محبت نہیں کرتا۔“[1]

ایک روز ہم پریشان بیٹھے تھے۔ رات کا وقت تھا۔ گھر میں کھانے کے لیے کچھ نہ تھا۔ اچانک مایوسی اور بیزاری کی حالت میں کسی بات پر شوہر سے میرا جھگڑا ہوگیا، میں نے اسے طلاق دینے کو کہا۔ وہ غصے میں چیخ اٹھا: جا تجھے طلاق، جا تجھے طلاق...... جا تجھے طلاق! میں رو پڑی اور میری ننھی سی بچی بھی زاروقطار رونے لگی۔ بچی کے آنسوؤں نے ہمیں اس دن کی یاد تازہ کرادی جب ہمیں اللہ تعالیٰ کی اطاعت و بندگی نے اکٹھا کیا تھا اور آج معصیت و نافرمانی نے ہمیں ایک دوسرے سے جُدا کر دیا۔

---

[1] البقرة 2:276.

يَوْمَانِ جَمَعَتْنَا الطَّاعَةُ وَفَرَّقَتْنَا الْمَعْصِيَةُ .

”وہ دونوں دن ناقابل فراموش ہیں۔ ایک دن وہ جس میں اطاعت الٰہی کی برکت نے ہمیں اکٹھا کیا اور دوسرا دن وہ جب معصیت الٰہی کی نحوست نے ہمیں جُدا کر دیا۔“

یہ کبھی نہ ہو گا!

''فقادو'' ایتھوپیا کا مشہور پادری تھا۔ وہ مسلسل اور انتھک کوشش سے اپنے خاندان کے بہت سے لوگوں کو عیسائی بنا چکا تھا اور جگہ جگہ عیسائیت کی دعوت پہنچا رہا تھا۔ اِس وجہ سے اس کا چرچا دور دور تک ہونے لگا اور اس کا نام اس کے خاندان والوں کے لیے باعث عزت بن گیا۔

فقادو نے دین مسیحی کی تعلیمات میں تحقیق کی اور باریک سے باریک مسائل سے آگہی حاصل کر لی، چنانچہ اس کا شمار بڑے عیسائی علماء میں ہونے لگا اور ایک بڑے پادری کی حیثیت سے اس کی ایک پہچان بن گئی۔ اس کی اچھی شہرت اور علمی قابلیت کے باعث جاہ ومال نے اس کی قدم بوسی کی اور وہ براعظم افریقہ کے نصارٰی میں ایک عظیم شخصیت کی حیثیت سے معروف ہو گیا۔

فقادو پادری نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ وہ سورۂ اخلاص کی تلاوت کر رہا ہے:

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۙ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾

''آپ کہہ دیجیے کہ وہ اللہ تعالیٰ ایک ہی ہے، اللہ بے نیاز ہے، نہ اس سے کوئی پیدا ہوا، نہ وہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے۔''[1]

---

[1] الإخلاص 112:1-4.

فقادو یہ خواب دیکھ کر چونک پڑا۔ دل ہی دل میں کہنے لگا: یہ کوئی معمولی خواب نہیں ہے۔ وہ اپنی ذہانت وفطانت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس خواب کی تعبیر پر غور کرنے لگا اور اس کے مطلب ومقصد کی جستجو میں لگ گیا مگر اس کے خواب کا کوئی تشفی بخش جواب نہ بن پڑا۔ اس نے رابطہ عالم اسلامی (Muslims World League) کے مقامی دفتر سے رابطہ کیا تاکہ اسے اس خواب کی مناسب تعبیر معلوم ہو جائے جسے دیکھنے کے بعد وہ پل بھر کے لیے بھی چین سے نہیں بیٹھا تھا اور اسی سوچ میں سرگرداں تھا کہ آخر خواب میں سورۂ اخلاص پڑھنے کا مطلب کیا ہوسکتا ہے؟

اللہ تعالیٰ کے کرم سے فقادو کو رابطہ عالم اسلامی کے دفتر سے مطلوبہ متاع مل گئی۔ دفتر کے منیجر نے اس کے خواب کی یہ خوش آئند تعبیر بتلائی کہ اللہ تعالیٰ فقادو کو اندھیرے سے نکال کر ہدایت کی روشنی سے نوازنا چاہتا ہے۔

دنیا کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے رابطہ عالم اسلامی کے دفاتر کے کارکنوں کا دستور یہ ہے کہ وہ دعوت الی اللہ کی نشر واشاعت اور لوگوں کی اللہ کے دین کی طرف رہنمائی کرنے میں تن من دھن کی بازی لگائے رہتے ہیں، دعوت وتبلیغ کے ایسے ہی مختلف پروگراموں میں فقادو نے شرکت کی جس کے نتیجے میں وہ اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا اور اس کا نام "فقادو" کی بجائے "محمد سعید" رکھ دیا گیا۔

دنیائے عیسائیت میں اس مردِ مومن کی اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے قبولِ اسلام نے عیسائیوں کے چرچ کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں اور انھوں نے اسے اپنے مذہب کے لیے ایک زبردست دھچکا تصور کیا۔ عیسائیوں نے لاکھ کوشش کی کہ وہ اپنے مذہبی پیشوا کو، جو اب دائرہ اسلام میں داخل ہو چکا تھا، دین اسلام سے برگشتہ کر

کے عیسائیت کی دنیا میں واپس بلالیں لیکن ان کی ساری کوششیں بے سُود ثابت ہوئیں۔

محمد سعید کا دائرہ اسلام میں داخل ہونا مسلمانوں کے حق میں بڑا ہی مفید ثابت ہوا کیونکہ محمد سعید کی اتباع میں دوسرے بہت سے غیر مسلم بھی اسلام کو گلے لگانے لگے بلکہ محمد سعید کے عیسائی پیروکار بھی اُس سے دلی لگاؤ کے باعث اُس کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ ایک پوری کی پوری بستی دائرۂ اسلام میں داخل ہوگئی۔

جب چرچ کے متعصب پادریوں کو اپنے پرانے ساتھی محمد سعید سے کچھ زیادہ ہی خطرہ محسوس ہونے لگا اور انھیں یقین ہوگیا کہ محمد سعید اب ایک پکا سچا مسلمان بن چکا ہے اور اسے دین اسلام سے پھیر کر عیسائیت کی طرف دوبارہ واپس لانا ناممکن ہے تو انھوں نے محمد سعید سے ہولناک انتقام لینے کا فیصلہ کرلیا۔

ایتھوپیا کے رابطہ عالم اسلامی کے ارکان نے یہ صورتِ حال دیکھی تو انھوں نے مکہ مکرمہ کے رابطہ عالم اسلامی کے سیکریٹریٹ سے رابطہ قائم کر کے محمد سعید کے لیے سعودی عرب کا ویزا طلب کیا۔

محمد سعید کو عربی زبان سے ذرا بھی واقفیت نہیں تھی لیکن رابطہ عالم اسلامی کے تعاون سے ان کا داخلہ ام القریٰ یونیورسٹی (مکہ مکرمہ) کے شعبہ عربی میں ہوگیا، مکہ مکرمہ ہی میں ان کے اور ان کے اہل خانہ کے لیے ایک رہائشی مکان کا بندوبست کر دیا گیا اور ان کے اخراجات کے لیے مناسب وظیفہ بھی مقرر کر دیا گیا۔

محمد سعید کو اللہ تعالیٰ نے بلا کی ذہانت بخشی تھی، تھوڑی سی مدت ہی میں انھوں نے عربی زبان کے قواعد واصول سے واقفیت حاصل کر لی اور تحقیقات اسلامی میں ان کی دوررس نگاہ بہت جلد کامیاب ہوگئی۔ انھوں نے تعلیمات علوم نبویہ میں مہارت پیدا کی اور ان کی

اسلامی معلومات بہتر سے بہتر ہوتی گئیں۔ اس مدت میں انھوں نے قرآن کریم کی چند سورتیں بھی یاد کرلیں۔ وہ بہت نرم دل ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر ہدایت کی روشنی چمکا کر جو احسان وانعام فرمایا تھا، اسے یاد کر کے وہ خوشی کے آنسو بہاتے رہتے۔

اسی دوران ایک اور واقعہ رُونما ہوا۔ ایتھوپیا کے چرچ کے نگرانِ اعلیٰ کی بیٹی مسلمان ہوگئی اور مکہ مکرمہ پہنچی۔ وہ ایک نوجوان اور حسین وجمیل لڑکی تھی۔ وہ شیخ سعید سے ملی اور اپنی رام کہانی اس طرح سنائی: ''میرے والد کو جب معلوم ہوا کہ میں اسلام قبول کرلوں گی تو اس نے مجھ پرکڑی پابندیاں لگائیں، گھر میں قید کر دیا اور مجھ پر بے حد مظالم ڈھائے۔ میں کسی نہ کسی طرح وہاں سے نکل بھاگی۔ اب یہاں آگئی ہوں۔ مجھے پناہ درکار ہے ورنہ وہ لوگ مجھے قتل کر دیں گے۔'' اس کی داستان بڑی لمبی تھی۔

محمد سعید اس کی دکھ بھری کہانی سے متاثر ہوا۔ اُس نے اس کی مدد کا وعدہ کرلیا۔ چند ماہ بعد اس لڑکی نے محمد سعید سے درخواست کی کہ وہ داعیہ بننا چاہتی ہے، لہٰذا اسے ضروری دینی تعلیم دی جائے۔ وہ نوجوان ہی نہیں، خوبصورت بھی تھی۔ اس نے رو رو کر کہا: مجھے میرے خاندان والوں سے بچایئے کیونکہ وہ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں۔

وہ جدہ میں اکیلی تھی۔ ایک دن اس نے محمد سعید سے التجا کی: ''آپ مجھ سے شادی کر لیں اور اسلامی تعلیم دیں۔ ہم دونوں دعوت کا کام کریں گے۔'' بالآخر اِس لڑکی کی تمنا پوری ہوئی اور محمد سعید نے اس سے شادی کر لی اور اس کی رہائش کا بندوبست جدہ ہی میں کر دیا۔ ان کی پہلی بیوی جو انھی کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہوئی تھی، مکہ مکرمہ میں ان کے ساتھ موجود تھی۔

یہ ایک خوفناک سازش تھی، محمد سعید کو اپنے خلاف اس سازش کا قطعاً علم نہ تھا۔ دراصل

جب ایتھوپیا کے پادری اسے دوبارہ اپنے دین میں داخل کرنے میں ناکام ہو گئے تو اسی وقت سے انھوں نے محمد سعید کو موت کے گھاٹ اتارنے کی سازشیں شروع کر دی تھیں۔ انھوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ چاہے وہ کسی بھی ملک میں چلا جائے، ہم اسے لازماً قتل کر کے رہیں گے۔

چنانچہ اسی ہدف کے حصول کے لیے یہ انوکھی سازش کی گئی۔ یہ عیسائی لڑکی ایڈز کے موذی مرض میں مبتلا تھی۔ اسے تیار کیا گیا کہ وہ اس سازش کی تکمیل میں اہم کردار ادا کرے اور ایڈز کا قاتل وائرس محمد سعید اور اس کی بیوی تک پہنچا دے۔ اسے مذہب کا واسطہ دیا گیا کہ تمھیں تو اب بہر حال مرنا ہی ہے کیونکہ مرض تمھارے جسم میں تیزی سے پھیل رہا ہے، بس اب تم اس دنیا سے جاتے جاتے یہ ''نیک'' کام کر جاؤ کہ عیسائیت چھوڑنے والے ایک شخص سے انتقام لیتی جاؤ۔

نیک دل اور ہمدرد محمد سعید ان کی سازش کا شکار ہو گیا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد یہ مہلک مرض اس کے اپنے جسم ہی میں نہیں بلکہ اس کی بیوی کے وجود میں بھی منتقل ہو گیا۔ بعد ازاں ایک دن وہ لڑکی چپکے سے ایتھوپیا بھاگ گئی۔

اس خطرناک مرض نے محمد سعید اور ان کی بیوی کو مزید جینے کی مہلت نہیں دی۔ چند مہینے بعد ان کی بیوی اللہ کو پیاری ہو گئی اور محمد سعید کا جسم بھی آہستہ آہستہ لاغر ہوتا گیا بالآخر انھوں نے بھی دم توڑ دیا اور مکہ مکرمہ میں دفن کر دیے گئے۔

اللہ تعالیٰ سے ہماری دعا ہے کہ وہ محمد سعید اور ان کی اہلیہ پر ہر آن اپنی رحمت نازل فرمائے اور انھیں جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے بالکل سچ فرمایا ہے:

﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ﴾

"آپ سے یہود و نصاریٰ کبھی راضی نہیں ہوں گے جب تک کہ آپ ان کے دین کو اختیار نہ کر لیں۔"[1]

مجلّہ رابطۃ العالم الاسلامی سے ماخوذ۔ آج دنیا بھر کے مسلمان اِلّا ماشاء اللہ یہود و نصاریٰ کی رِیس کر رہے ہیں۔ سر سید اور مصطفیٰ کمال سے لے کر آج تک ہمارے اکثر مغرب زدہ لیڈر اور حکمران یہ ترغیب دیتے آ رہے ہیں کہ ہمیں زمانے اور زندگی کی رفتار کے ساتھ ساتھ چلنا چاہیے۔ رواداری اور روشن خیالی کا رویہ اپنانا چاہیے اور مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگ جانا چاہیے...... کبھی آپ نے ٹھنڈے دل سے سوچا کہ آخر ہمیں یہود و نصاریٰ کے لچھنوں کی تقلید نے کیا دیا ہے؟ ہماری مملکتیں چھین لی گئیں، ہمارے تخت و تاج لُٹ گئے، ہماری فرخندہ اختری مٹی میں مل گئی۔ ہماری یک جہتی پارہ پارہ ہوگئی، ہماری عظمت کے مینار گر گئے، ہماری قوت کے سفینے ڈوب گئے، ہماری روایات دُھندلا گئیں، ہماری تہذیب ماند پڑ گئی۔ طاغوتی قوتوں نے ہمارا محاصرہ کر لیا ہے۔ آج ہم پر بم برس رہے ہیں، ہماری بستیاں جھلس رہی ہیں، جا بجا لاشیں تڑپ رہی ہیں، ہر طرف خون بہہ رہا ہے، ہمارے قدرتی وسائل پر ڈاکہ پڑ چکا ہے۔ ہماری لہلہاتی ہوئی کھیتیاں سُوکھ رہی ہیں۔ کہیں قلاشی ہے، کہیں قحط ہمارے دریاؤں کا سوکھتا ہوا پانی ہمارے کرتوتوں کو کوس رہا ہے۔ اب ذوالجلال ہم سے روٹھ گیا ہے، بارشیں نہیں ہو رہیں، ہماری بستیوں کا سکون اُجڑ گیا ہے، بدامنی اور غارتگری کا راج ہے۔ مایوسی کی دھند میں لپٹے ہوئے لوگ خودکشیاں کر رہے ہیں۔ اس کے باوجود ہم عبرت نہیں پکڑتے، دینِ حنیف کی تعلیماتِ مقدسہ پر عمل نہیں کرتے، ہم بدستور یہود و ہنود اور دیگر طاغوتی طاقتوں ہی کی تہذیب کے پرستار ہیں۔ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہود و نصاری کی پیروی سے ہم کامیاب ہو جائیں گے تو نوٹ کر لیجیے کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ مغربی تہذیب کی نقالی کر کے مسلمان ہمیشہ خسارے ہی میں رہیں گے۔ ؎

مڑ، بھاگ اور دوڑ آ، طاقت ابھی ہے پاؤں میں
آرام و راحت، زندگی، سب کچھ ہے رب کی چھاؤں میں

---

[1] البقرة 2:120.

بہار ہو کہ خزاں لا إلٰہ إلا اللّٰہ !

ڈاکٹروں کا قافلہ 9 افراد پر مشتمل تھا۔ ان میں 3 طاقتور قلی اور ایک گائیڈ بھی شامل تھا، یہ قافلہ افریقہ کے جنگلوں میں سفر کر رہا تھا۔ راستہ پیچیدہ تھا، جگہ جگہ خاردار جھاڑیاں حائل ہو رہی تھیں۔ لمبے لمبے درخت تھے، جنگل سے کہیں بندروں اور کہیں مختلف پرندوں اور دیگر حیوانات کی آوازیں آ رہی تھیں۔ قافلے کے سربراہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن کی خواہش تھی کہ وہ مغرب سے پہلے پہلے ''کارو'' بستی پہنچ جائیں۔ وہاں انھیں دعوت دین کا فریضہ بھی انجام دینا تھا اور لوگوں کو علاج معالجے کی سہولت بھی مہیا کرنی تھی۔

''کارو'' بستی تک کوئی سڑک نہیں جاتی تھی۔ دائیں بائیں پہاڑ ان کا راستہ روکے کھڑے تھے۔ ان کا رہنما ایک لمبا نیزہ لیے آگے آگے چل رہا تھا۔ قلیوں نے ادویات اور دوسرا سامان اٹھا رکھا تھا۔ یہ اسی علاقے کے رہنے والے تھے۔ جنگلوں میں سفر کرنا اور سامان اٹھا کر چلنا ان کے معمول کا حصہ تھا۔

اچانک ڈاکٹر عبدالرحمٰن نے اپنے مترجم ''کونا'' سے سرگوشی کی: ہمیں مزید کتنا چلنا ہوگا؟ کونا نے اپنا سانس درست کرتے ہوئے کہا کہ تھوڑا سا صبر اور کر لیں، ہم خاصا فاصلہ طے کر آئے ہیں۔ اب منزل زیادہ دُور نہیں ہے۔

غرض قافلے کے افراد کبھی رکتے کبھی چلتے، گاہے دم لیتے آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف رواں تھے۔ ان کے چہروں سے تھکن کے آثار نمایاں تھے۔ قافلے کے مترجم ''کونا''

کو کچھ ہی عرصہ پہلے افریقی بخار نے آ دبوچا تھا۔ گو کہ اب وہ تندرست ہو چکا تھا مگر ابھی نقاہت باقی تھی۔

یکا یک، گائیڈ نے زور سے نعرہ لگایا: وہ رہی ہماری منزل! وہ سامنے کارو بستی نظر آ رہی ہے۔ قافلے والوں میں ہمت اور طاقت آ گئی، وہ اور تیزی سے آگے بڑھے...... مگر جوں جوں وہ آگے بڑھتے گئے، گاؤں دور ہوتا گیا۔ دراصل یہ سراب تھا جس کے وہ شکار ہوئے تھے۔ بہر حال ایک تھکا دینے والے سفر کے بعد اسی سراب میں اس قافلے کے استقبال کے لیے اچانک چار نوجوان نمودار ہوئے۔ انھوں نے افریقہ کی روایتی تلواریں، تیر اور نیزے تھام رکھے تھے۔ گائیڈ رک گیا۔ لمبے تڑنگے نوجوان آگے بڑھے، انھوں نے قافلے کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا اور بتایا کہ ہم آپ کو کارو قبیلہ کی طرف سے خوش آمدید کہنے کے لیے آئے ہیں، ہمارے ساتھ چلیں۔ کچھ سامان انھوں نے اٹھا لیا اور قافلہ بستی کی طرف چل دیا۔ جیسے جیسے وہ بستی کے قریب ہوتے گئے، بستی سے دم بہ دم ڈھول پیٹنے کی آوازیں آنا شروع ہوئیں اور ان کی رفتار کے ساتھ ساتھ بلند ہوتی چلی گئیں۔

وہ بستی کے پاس پہنچے۔ لکڑی کے ایک بڑے دروازے کے سامنے انھیں رکنا پڑا۔ گاؤں کے مکین اسی دروازے سے باہر جاتے اور اندر داخل ہوتے تھے۔ دروازہ کھلا، لوگوں نے قافلے کا زور دار استقبال کیا۔ ڈھول کی آواز اور بلند ہو گئی۔ اس میں گانے کی آواز بھی شامل تھی۔ قافلہ آگے بڑھا تو دیکھا کہ نوجوانوں کا ایک گروہ حبشی رقص کر رہا تھا۔ گاؤں کے لوگ ان کے ارد گرد جمع تھے۔ درمیان میں ایک لمبا مضبوط بانس گڑا ہوا تھا۔ اس پر چمڑے کا ایک تھیلا لٹک رہا تھا۔ لوگوں کی آوازیں بلند ہوتی گئیں۔ وہ لوگ یہ الفاظ کہہ رہے تھے: ہا ہو ہا ہو ہا ہو...... لا ہو...... لا ہو...... لا ہو...... دم دم...... دوم دم، دمدم

دمدم دو مدم ہاہو ہاہو ہاہو لاہو...... لاہو......بستی کے لوگوں نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف کر لیے۔ وہ دائیں بائیں جھوم رہے تھے۔ ان میں عورتیں، بچے، نوجوان اور بوڑھے سبھی شامل تھے۔

ڈاکٹر اور ان کے ساتھی شدید تھکن کے باوجود یہ منظر بڑے تعجب اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ ''کارو'' کوئی بڑی بستی نہیں تھی۔ چھوٹا سا گاؤں تھا جس کے باسیوں کی تعداد دو سو سے زیادہ نہیں تھی۔ ان کی رہائش بڑی معمولی سی تھی۔ سرکنڈوں سے بنے ہوئے گول کمرے، ان کے اوپر مخروطی چھتیں پڑی ہوئی تھیں تاکہ بارش کا پانی نیچے بہہ جائے۔ چھت کو بانس کے ساتھ سہارا دیا گیا تھا۔ اسی کے ساتھ سرکنڈے باندھ کر ان گھروں کو مضبوط بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن نے بستی کا دورہ کیا۔ غربت اور درماندگی کے مناظر ان کے سامنے تھے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ انھیں اس قسم کی بستی اور ماحول دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ کہنے لگے: یا اللہ! تیری قدرت بھی عجیب ہے۔ دنیا کے بعض خطوں کے لوگ اتنے امیر ہیں کہ انھیں اپنی دولت کا اندازہ نہیں، ان کے محلات اور کوٹھیاں بے شمار ہیں اور یہاں صورتحال یہ ہے کہ برائے نام سرکنڈوں کا گھر میسر ہے جو آندھی اور بارش برداشت کرنے کی بھی سکت نہیں رکھتا۔

اچانک آسمان پر بجلی چمکی، انھوں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا، کالے کالے بادل جھوم رہے تھے، پھر زوردار بارش شروع ہوگئی۔ بارش کے دوران بستی کے لوگوں کا جوش وخروش بڑھ گیا۔ اب وہ اور زیادہ زور زور سے ماہو لاہو اور دم دم کی صدائیں بلند کرنے لگے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن کا خیال تھا کہ اتنے زور کی بارش ان کے رقص کو تہ و بالا کر دے گی مگر اس کے

برعکس ان کا رقص اور زیادہ تیز ہوگیا۔ اسی دوران استقبال کرنے والے افراد نے انھیں اشارہ کیا کہ آیئے! سردارِ قبیلہ سے ملاقات کیجیے ...... قبیلے کا سردار بھی یہ رقص دیکھ رہا تھا۔ اس کے لیے انھوں نے خصوصی جگہ بنائی ہوئی تھی۔ وہ اس کے پاس پہنچے تو اس نے بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ سردار کی عمر اسی سال سے متجاوز تھی، اس کے سر کے بال اور بھویں تک سفید ہو چکی تھیں۔ وہ اپنے پرانے مگر مضبوط عصا کے سہارے کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا: ہم آپ کو بستی کا رو میں آنے پر خوش آمدید کہتے ہیں۔ آپ لوگوں کا یہاں آنا ہمارے لیے نہایت مبارک ثابت ہوا ہے...... مدت سے بارش نہیں ہوئی تھی، آپ لوگوں کے آنے سے بارش نازل ہوئی ہے۔ ہم تو گزشتہ تین روز سے آپ لوگوں کا انتظار کر رہے تھے، تشریف رکھیں۔ وفد کا مترجم ''کونا'' وفد کے ارکان کے لیے ترجمہ کر رہا تھا۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن نے جوابی طور پر السلام علیکم کا تحفہ پیش کیا اور کہا: یہ میڈیکل وفد آپ لوگوں کے علاج معالجے اور اسلام سکھانے کے لیے آپ کے گاؤں آیا ہے۔ ہمارا ایک ساتھی بیمار ہوگیا تھا، اس لیے آنے میں تاخیر ہوگئی ورنہ ہم پہلے ہی پہنچ جاتے...... الحمدللہ اب وہ کافی بہتر ہے۔

اب وہ تھوڑے فاصلے پر نصب خیمے میں چلے گئے، یہ خیمہ اس میڈیکل وفد کے لیے لگایا گیا تھا۔ بارش کم ہو چکی تھی اور لوگوں کا شور و غوغا بھی مدھم ہو گیا تھا۔ انھوں نے خیمے میں اپنی ادویات قرینے سے لگائیں۔ لوگوں کی آمد شروع ہوگئی اور وہ اسی وقت علاج معالجے میں مصروف ہو گئے۔ چھوٹے بڑے، بوڑھے، عورتیں اور مرد آتے گئے۔ وفد کے ارکان ان کا معاینہ کرنے، انھیں ادویات اور ہدایات دینے میں مشغول رہے۔ مغرب کا وقت ہونے کو آیا، وفد کا ایک رکن خیمے کے کنارے کھڑا ہوگیا۔ اس نے بلند آواز سے اذان

دی۔ میڈیکل وفد کے ارکان نے باجماعت نماز ادا کی۔ بستی کے لوگوں نے پہلی دفعہ یہ دلکش منظر دیکھا کہ ایک شخص بطور امام آگے کھڑا ہے اور وفد کے ارکان پیچھے صف باندھے کھڑے ہیں اور نماز ادا کر رہے ہیں۔ یہ منظر دیکھنے والوں میں بستی کا رئیس بھی شامل تھا۔ اسے یہ منظر دیکھ کر گویا کوئی بھولی بسری چیز یاد آ گئی۔ وہ سمجھا شاید یہ لوگ بارش کے خدا کی پوجا کر رہے ہیں اور اس کے سامنے جھکے ہوئے ہیں۔ وہ قرآن کی آیات کی تلاوت سن رہا تھا مگر اس کا مطلب سمجھنے سے قاصر تھا۔

میڈیکل وفد کی آمد کی خوشی میں رات کو کھانے کی دعوت تھی، تمام بستی کے افراد مدعو تھے۔ چند گھنٹے پہلے جہاں رقص کی محفل برپا تھی، اب وہاں لکڑیاں جلا کر لوہے کی ایک سلاخ پر ایک گائے کو ذبح کر کے لٹکایا گیا تھا۔ انگاروں سے گائے کا گوشت پک گیا۔ چاروں طرف خوشبو پھیل گئی۔ گائے کا گوشت بڑا لذیذ تھا۔ تیز اور لمبی چھری سے کاٹ کاٹ کر کھایا جا رہا تھا۔

سب لوگ کھانے میں مشغول تھے کہ اچانک ڈاکٹر عبدالرحمٰن نے مترجم کی وساطت سے رئیس قبیلہ سے پوچھا: جب ہم اس بستی میں داخل ہوئے تو اس وقت رقص کی محفل برپا تھی، وہ کس مناسبت سے تھی اور یہ لوگ کیوں ناچ اور گا رہے تھے؟

رئیس قبیلہ نے آسمان کی طرف دیکھا، پھر ایک ستون سے لٹکے ہوئے چمڑے کے تھیلے کی طرف دیکھا اور کہنے لگا: یہ محفل، رقص کی تقریب تھی، اسے ہم ''بارانی رقص'' کہتے ہیں۔

وہ تھوڑی دیر رکا اور کہنے لگا: آپ کو معلوم ہے، ہماری کھیتی باڑی کا انحصار بارش پر ہے۔ بروقت بارش ہو جائے تو ہماری کھیتیاں لہلہاتی ہیں۔ اور بارش نہ ہو تو پھر خشک سالی ہوتی ہے اور قحط کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، چنانچہ جب بارش ہونے میں تاخیر ہو جائے تو ہم

ناچتے ہیں، اس رقص کے ذریعے بارش طلب کرتے ہیں، اس عمل کو ہم بارانی رقص کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن نے پہلو بدلا، رئیس قبیلہ کی طرف غور سے دیکھا اور پوچھا: لوگ جب یہ رقص کرتے ہیں تو کیا بارش نازل ہوتی ہے؟

رئیس قبیلہ نے ایک مرتبہ پھر چمڑے کے تھیلے کی طرف دیکھا جو قریب ہی ایک ستون کے ساتھ لٹک رہا تھا اور بولا: ہاں بارش ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر کو بڑا تعجب ہوا، انھوں نے ایک بار پھر زور دے کر سوال کیا: کیا ہر مرتبہ......؟

رئیس قبیلہ کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے کہا: جی ہاں! ہر مرتبہ بارش ہوئی ہے......لیکن میرے عزیز! تمھیں یہ جان کر تعجب ہوگا کہ رقص کرنے سے بارش نہیں ہوئی بلکہ بارش ہونے کا اصل سبب تو اس بیل کے چمڑے والے تھیلے میں چھپا ہوا ہے۔ اس نے بڑے احترام کے ساتھ اُسی تھیلے کو دیکھا جو ستون سے لٹک رہا تھا۔

ڈاکٹروں نے بھی اس تھیلے کی طرف نگاہ دوڑائی اور تعجب سے پوچھا: لیکن اس بیل کے چمڑے کا......اس تھیلے کا......بارش سے کیا تعلق ہے......؟ یہ تو آپ بڑی عجیب بات کر رہے ہیں؟ آخر اس میں ایسا کون سا بھید چھپا ہوا ہے کہ اس تھیلے کی وجہ سے بارش ہو جاتی ہے؟

''کونا'' جو مترجم کے فرائض سرانجام دے رہا تھا، وہ بھی تعجب سے پہلو بدل رہا تھا اور بڑے شوق سے یہ داستان سن رہا تھا۔ جب رئیس قبیلہ نے ان کا یہ شوق اور عالمِ حیرت دیکھا تو اپنی جگہ سے اٹھا، چار پانچ ہٹے کٹے نوجوانوں کو تھیلے کی طرف بھیجا اور اپنی زبان میں بڑبڑایا۔ نوجوان اس تھیلے کی طرف بڑھے اور اپنے مضبوط ہاتھوں سے نیچے اتار لائے۔ تھیلا خاصا بڑا اور وزنی معلوم ہوتا تھا۔ انھوں نے اسے چاروں طرف سے پکڑا

اور رئیس قبیلہ کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ تمام حاضرین کی نگاہیں اسی تھیلے پر جمی ہوئی تھیں کہ نہ جانے اس کے اندر کیا ہے؟

''یہ کیا ہے؟'' ڈاکٹر نے فوراً پوچھا...... اس سوال کے جواب میں رئیسِ قبیلہ نے ایک نوجوان کو تھیلا کھولنے کا حکم دیا تو بیل کے چمڑے والے تھیلے سے کتابیں برآمد ہوئیں۔

ڈاکٹر نے رئیس قبیلہ کی طرف دیکھا، حیرت کے مارے اس کی آنکھوں کی پتلیاں گردش کرنے لگیں۔

رئیس قبیلہ مسکرا دیا، پھر گویا اپنے ماضی میں کھو گیا، اس نے پہلو بدلا اور کہنے لگا: سنو میرے عزیز! ہم ان کتابوں کی زبان نہیں جانتے، نہ ہم انھیں پڑھنا جانتے ہیں۔ لیکن ہم ان کا احترام کرتے ہیں۔ یہ ہمارے پاس ہمارے باپ دادا کے زمانے سے چلی آ رہی ہیں۔ ان کے نزدیک بھی یہ کتابیں نہایت مقدس اور محترم تھیں۔ ان سے سینہ بسینہ ایک روایت چلی آ رہی ہے، وہ یہ کہ ان کتابوں میں جو زبان لکھی ہوئی ہے، ہم اس زبان کے ذریعے بارش کے رب کو پکارتے ہیں اور اس سے مدد طلب کرتے ہیں۔ جب بھی کوئی مشکل پیش آتی ہے یا بارش نہیں ہوتی، ہم انھی کتابوں کے رب کو پکارتے ہیں۔

کئی سو سال بیت چکے، ہماری اس بستی میں ایک بڑا ہی مبارک شخص آیا تھا، اس نے اس بستی میں دیر تک قیام کیا۔ وہ لوگوں کو بارش کے رب کی عبادت کے طریقے بتاتا تھا۔ وہ سمجھاتا تھا کہ کوئی مشکل وقت آئے یا بارش نہ ہو تو کیا کرنا چاہیے۔ اس کے پاس یہی کتابیں تھیں۔ جب وہ اس بستی سے روانہ ہوا تو یہ کتابیں یہیں چھوڑ گیا۔ ہم اپنے آباء و اجداد کی اس وراثت کو اب تک سنبھالے بیٹھے ہیں۔ ہمیں ان کتابوں کی عبارتوں اور اس میں موجود مضامین کا کوئی علم نہیں، سوائے اس کے کہ ان کتابوں میں بارش کے رب کو

پکارنے کا طریقہ موجود ہے اور ہمیں سینہ بسینہ منتقل ہونے والے بعض کلمات یاد ہیں جنھیں ہم بارانی رقص کے وقت ادا کرتے، پڑھتے اور گاتے ہیں۔

ڈاکٹر نے جب یہ گفتگو سنی تو اس پر عجیب سرشاری طاری ہوگئی۔ وہ دیوانہ وار ان کتابوں کو دیکھنے لگا۔ جوں جوں وہ ان کے اوراق پلٹتا جا رہا تھا، اس پر ہیبت و حیرت کی ملی جلی کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے ان کتابوں کو جلتی ہوئی آگ کے قریب کیا تاکہ اس کی روشنی میں دیکھ سکے کہ یہ کون سی زبان ہے؟ اور ان میں کیا لکھا ہوا ہے؟ تاکہ راز سے پردہ اٹھ سکے، پھر جونہی ایک کتاب کی عبارت پر نظر پڑی، وہ یک دم چونک اٹھا اور بے ساختہ بولا: ارے یہ کیا...... یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ واہ! یہ تو قرآنِ کریم کے الفاظ ہیں۔ الف...... لام...... میم۔

یہ تو عربی حروف ہیں۔ ہاں یہ تو عربی زبان کی کتابیں ہیں۔ اب اس نے ایک ایک کر کے کتابیں دیکھنی شروع کیں اور سکتے کے عالم میں بول اٹھا...... ارے! یہ تو دینی کتابیں ہیں! یہ تو اسلام کی تعلیمات پر مبنی ہیں۔ یہ تو حدیث کی کتابیں ہیں!

پھر اس نے اوراق کا ایک مجموعہ اٹھایا اور انھیں دیکھتا چلا گیا۔ اچھا یہ تو قرآن ہے۔ ارے مکمل قرآن...... اچھا اس بستی میں سینکڑوں سال پہلے آنے والا...... تبلیغ کرنے والا...... اور ان لوگوں کو مسلمان کرنے والا...... دراصل ایک عربی مسلمان تھا۔ سنو...... ارے سنو! وہ رئیس قبیلہ سے مخاطب ہوا: ہمارے مسلمان آباء و اجداد سینکڑوں سال پہلے تمھاری بستی میں آئے تھے۔ تم لوگوں کو اسلام، قرآن، حدیث، صحیح عقیدہ اور نیک اعمال سکھلانے کے لیے۔

ہاں! ہمارے بزرگ اس سرزمین پر اس وقت آئے تھے جب نقل و حمل کے ذرائع

بالکل مفقود تھے، نہ ہوائی جہاز، نہ ٹرین، نہ کاریں، نہ بسیں …… کچھ نہ تھا۔ بس سمندروں میں کشتیاں چلتی تھیں …… گھوڑے تھے …… صحراؤں میں اونٹ تھے …… یا پھر بیل گاڑیاں۔ دور و نزدیک کے راہی انھی سواریوں پر اسی طرح قافلے بنا کر نکلتے تھے اور اپنی اپنی منزل کی طرف تن بہ تقدیر چلتے جاتے تھے۔ اور ہاں وہ اکثر پیدل ہی سفر کیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر کو احساس ہی نہ ہوا کہ وہ وفورِ جذبات میں مترجم کو متوجہ کیے بغیر تقریر کیے جا رہا ہے۔ رئیس قبیلہ اور دوسرے مقامی لوگ مبہوت ہو کر اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر کی گفتگو کا ایک حرف بھی ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ ڈاکٹر کا مترجم ''کونا'' بھی اس خوشخبری سے مسرور اور متحیر تھا۔ وہ اس گفتگو کا ترجمہ کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک رئیس قبیلہ آگے بڑھا، اس نے ڈاکٹر کو گلے لگا لیا اور پھر میڈیکل مشن کے بقایا افراد کو گلے لگاتے ہوئے کہنے لگا: میں نے کہا نہیں تھا کہ تم لوگوں کو بارش کے رب نے ہماری طرف بھیجا ہے۔ یہ بارش کے رب کی طرف سے ایک عطیہ ہے کہ تم لوگ ہماری بستی میں آئے ہو۔

اب ''کونا'' نے مقامی زبان میں تھیلے سے برآمد ہونے والی کتابوں کے اصل راز سے پردہ اٹھایا اور رئیس قبیلہ اور دیگر مقامی لوگوں کو اس راز سے آگاہ کیا تو ان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ انھیں یہ جان کر انتہائی مسرت نصیب ہوئی کہ اس بستی کے آباء و اجداد مسلمان تھے۔ اور یہ کتابیں لانے والا ان کی ہدایت کا باعث بنا تھا۔ لوگ جگہ جگہ آپس میں ٹولیوں کی صورت میں پرجوش گفتگو کر رہے تھے، اسلام کے بارے میں …… اس کی حقانیت کے بارے میں …… بارش کے رب کے بارے میں …… بقول شاعر ؎

بے غم حُبِ تو صد حیف زعمرے کہ گزشت
کاش ازیں پیش گرفتارِ غمت خواہم بود!

وہ اظہارِ ملال کر رہے تھے کہ ہم اسلام سے اتنی دیر کیوں غافل رہے؟ اور پھر صبح کا سورج اس بستی کے لیے سعادتوں، رفعتوں، خوشیوں اور رب العزت کی رضا کا پیغام لایا کہ اس روز یہ بستی لا إله إلا الله محمّد رسول الله کی ایمان افروز صداؤں سے گونج رہی تھی۔

چاہ کن راہ چاہ در پیش

یہ پہلی عالمی جنگ 1914ء سے پہلے کا واقعہ ہے۔

ایک تاجر تجارت کی غرض سے شام کے شہر حلب کی جانب روانہ ہوا۔ راستے میں طوفانِ بادوباراں نے آلیا۔ برف باری کی شدت سے سڑکیں بند ہوگئیں۔ اس زمانے میں اس شہر میں ہوٹل وغیرہ نہیں تھے کہ مسافر وہاں کا رخ کرتے۔ عموماً واقف کاروں یا رشتہ داروں کے ہاں قیام ہوتا یا پھر کسی بھی اجنبی شخص کا دروازہ کھٹکھٹایا جاتا اوراس سے رات رہنے کے لیے کہا جاتا تو وہ نہ صرف اپنا دروازہ کھول دیتا بلکہ کھانا بھی کھلاتا تھا۔ یہ دستور ایک مدت تک چلتا رہا بلکہ آج بھی دیہات اور قصبوں میں یہی دستور باقی ہے اور مہمان کا حق سمجھا جاتا ہے کہ اگر وہ گاؤں میں آئے تو اس کی مہمان نوازی کی جائے۔

اس تاجر نے ایک گھر کے دروازے پر دستک دی، گھر والوں نے دروازہ کھولا۔ اس نے بتایا کہ وہ مسافر ہے، رات گزارنا چاہتا ہے۔ گھر والوں نے اسے خوش آمدید کہا، اپنے گھر کے دریچے کھول دیے۔ یہ چھوٹا سا گھر تھا۔ اس میں میاں بیوی اور ان کا اکلوتا نوجوان بیٹا رہتا تھا۔ دو کمروں میں سے ایک میں ان کا بیٹا اور دوسرے میں اس کے والدین سوجاتے تھے۔ دن کے وقت یہی کمرے کھانے پینے اور بیٹھنے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ گھر والوں نے مہمان کو بٹھایا، کھانا پیش کیا اور پھر اس کے پاس بیٹھ کر گفتگو شروع کر دی۔ تاجر نیک دل آدمی تھا۔ اس نے میزبانوں کو تفصیل سے اپنے حالات سے آگاہ کیا

اور بتایا کہ اس کے پاس ایک خطیر رقم موجود ہے جسے وہ مالِ تجارت خریدنے کے لیے لایا ہے۔ رات دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ یہ گفتگو میزبان کی بیوی بھی سن رہی تھی، اسے پتہ چل گیا کہ ہمارے مہمان کے پاس بھاری رقم موجود ہے۔

سوتے وقت اہل خانہ نے مہمان کے لیے نئے بستر کا اہتمام کیا۔ اس پر مہمان لیٹ گیا، دوسرے کونے میں ان کا بیٹا لیٹ گیا۔

بیوی نے اچانک خاوند کے کان میں سرگوشی کی:

ہم آخر کب تک فقر وفاقہ کی زندگی گزارتے رہیں گے۔ ہمارا مہمان مالدار آدمی ہے۔ ایک بڑی رقم اس کی جیب میں موجود ہے، ہمیں رقم کی شدید ضرورت ہے۔ اگر ہم چاہیں تو راتوں رات امیر بن سکتے ہیں...... مگر وہ کیسے؟ خاوند نے پوچھا۔

اس وقت ایسا نادر موقع ہے جو شاید کبھی نہ آئے۔ اس کی بیوی نے ورغلایا: آؤ ہم اس مہمان کو قتل کر دیں جتنا مال اس کے پاس ہے، قابو کر لیں اور لاش ٹھکانے لگا دیں۔ اس طوفانِ بادو باراں کے موسم میں کسی کو کچھ پتہ بھی نہ چل سکے گا۔ کسی کو بھی معلوم نہیں کہ ہمارے گھر میں مہمان موجود ہے۔ رات اندھیری اور سرد ہے، لاش کو ٹھکانے لگانا کوئی مشکل نہیں۔ ہم راتوں رات بہت مالدار بن جائیں گے۔

اس کا خاوند پہلے تو انکار کرتا رہا کہ مہمان کے ساتھ ایسا ظلم کرنا بڑی وحشیانہ حرکت ہے مگر اس کی بیوی اس کا حوصلہ بڑھا رہی تھی، ادھر شیطان بھی زور لگا رہا تھا۔ ہم اپنی شدید ضرورت کی وجہ سے ایسا کر رہے ہیں۔ خون کرنا ہماری خواہش نہیں مگر بھوک کا علاج تو بہرحال کرنا ہوگا۔ اس کی بیوی اُسے اسی طرح کے جھوٹے دلائل سے قائل کرتی رہی۔ بالآخر وہ اس کی باتوں میں آ گیا۔ اب وہ اپنے مہمان کو قتل کرنے اور اس کا مال

چھیننے کی پلاننگ کرنے لگا۔

رات آدمی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ سردی کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ برف باری کا طوفان جاری تھا اور ادھر میاں بیوی خنجر تیز کر رہے تھے۔ بیوی شوہر کو حوصلہ بھی دیتی جا رہی تھی۔ وہ بالآخر اپنے بیٹے اور مہمان کے کمرے میں داخل ہوا۔ بیوی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے کے بائیں رخ مڑا جہاں اس نے اپنے ہاتھوں سے مہمان کے لیے نیا بستر بچھایا تھا۔ کمرے میں شدید اندھیرا تھا۔ اس نے بستر ٹٹولا، پھر اندازے سے گردن تلاش کی اور خنجر چلا دیا۔ جس طرح بکری ذبح کی جاتی ہے اس طرح اسے ذبح کر دیا۔ اس کی بیوی لپک کر آگے بڑھی اور لاش اٹھانے میں اس کی مدد کی۔

دونوں میاں بیوی دروازے پر لاش کھینچ کر لائے تو اچانک بجلی چمکی اور یکا یک ان کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ یہ لاش ان کے اکلوتے بیٹے کی تھی۔ انھوں نے اپنے ہی ہاتھوں اپنے بیٹے کو ذبح کر دیا تھا۔ میاں بیوی کے حلق سے دل ہلا دینے والی چیخیں نکلیں اور دونوں بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ چیخیں سن کر مہمان بھی جاگ اُٹھا اور ان کے ہمسائے بھی بھاگے بھاگے آئے۔ انھوں نے ان پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے تو انھیں ہوش آیا۔ پولیس کو اطلاع ملی، وہ فوراً پہنچ گئی۔ تھوڑی سی تفتیش کے بعد پولیس والے اصل حقائق تک پہنچ گئے۔ قصہ یہ ہوا کہ جب رات کو اس کا والد مہمان کو الوداع کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا تو مہمان اور اس کا بیٹا خاصی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس دوران اچانک لڑکے پر نیند نے غلبہ پا لیا اور وہ باتیں کرتے کرتے مہمان ہی کے بستر پر سو گیا۔ مہمان نے اُسے جگانا مناسب نہ سمجھا، وہ چپکے سے اٹھا اور اس لڑکے کے بستر پر آ کر سو گیا۔

جب میزبان اسے قتل کرنے آیا تو اسے یقین تھا کہ وہ جسے قتل کر رہا ہے، وہ مہمان ہی

ہے۔ اس دھوکے میں اس نے اپنا ہی بیٹا قتل کر ڈالا۔ ہمسایوں نے اگلے دن اس نوجوان کو دفن کر دیا اور اس کے ماں باپ جیل خانے کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیے گئے۔

اس طرح ان لالچی میاں بیوی کو اپنے کیے کی سزا مل گئی۔ یہ تو تھی ان کے لیے دنیاوی سزا، آخرت میں بارگاہِ الٰہی میں جوابدہی کا کٹھن ترین مرحلہ ابھی باقی تھا۔

ع...... چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی!

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

قریش مکہ کے دل رسول اکرم ﷺ کے خلاف دل غیظ وغضب سے بھرے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ کے صحابۂ کرام بھی ان کی شدید نفرت کا شکار تھے۔ دشمنانِ دین اپنے لوگوں کو رسولِ اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ کے خلاف ورغلاتے رہتے تھے۔ جتنے مُنہ اُتنی باتیں۔ کوئی کہتا: محمد کو قتل کر دیا جائے۔ کوئی کہتا: سخت سزا دی جائے۔ کوئی مشورہ دیتا کہ جب بھی محمد ﷺ دعوتِ اسلام دیں تو خوب شور مچایا جائے تاکہ کوئی ان کی بات ہی نہ سننے پائے...... اس قسم کی باتوں کے علاوہ کفارِ مشرکین طعنہ وتشنیع اور گالی گلوچ سے بھی اکثر کام لیتے تھے۔

رسول اکرم ﷺ کے خلاف حقد وحسد کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ قریش کے ذی اثر لوگ آپ ﷺ کو قتل کر دینے کے درپے تھے۔ حضرت عمر بن خطاب ؓ کا بھی یہی حال تھا۔ جب انھیں رسول اکرم ﷺ کی دعوت برداشت نہیں ہوئی تو وہ بھی آپے سے باہر ہو گئے اور آپ ﷺ کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کی قسم کھالی، پھر تلوار سنبھالی، ترکش کندھے پر رکھا اور رسول اکرم ﷺ کا کام تمام کرنے کی نیت سے گھر سے روانہ ہوئے۔

آیئے حضرت عمر بن خطاب ؓ ہی کی زبانی یہ واقعہ سنتے ہیں:

میں رسول اکرم ﷺ کو قتل کرنے کی نیت سے اپنی تلوار لٹکائے اور ترکش کندھے پر رکھے چلا جا رہا تھا۔ میرا ارادہ محمد ﷺ کے ٹھکانے کی طرف تھا۔ اتفاق سے راستے میں نعیم بن عبداللہ سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اسلام قبول کر چکے تھے مگر انھوں

نے اپنی قوم کے خوف سے اپنے اسلام کا اظہار نہیں کیا تھا۔ انھوں نے مجھ سے کہا:

أَيْنَ تَذْهَبُ يَا ابْنَ الْخَطَّابِ؟

''ابن خطاب! کدھر چلے؟''

میں نے کہا:

أُرِيدُ هٰذَا الصَّابِئَ الَّذِي فَرَّقَ أَمْرَ قُرَيْشٍ وَسَفَّهَ أَحْلَامَهَا وَعَابَ دِينَهَا وَسَبَّ آلِهَتَهَا فَأَقْتُلُهُ

''میں اس بے دین کی طرف جا رہا ہوں جس نے قریش کا معاملہ سنگین کر دیا ہے (ان میں اختلاف پیدا کر دیا ہے)، ان کے خواب چکنا چور کر دیے ہیں، ان کے دین کو عیب لگا دیا ہے اور ان کے معبودوں کو گالیاں دی ہیں، اس لیے میں اس کا کام تمام کرنے جا رہا ہوں۔''

نعیم بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے مُجھ سے کہا: اللہ کی قسم اے عمر! تمھیں تمھارے نفس کے عُجب نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ محمد کو قتل کرنے کے بعد چین سے رہو گے؟ سرزمین مکہ پر دندناتے پھرو گے اور بنی عبد مناف تمھیں یونہی آزاد چھوڑ دیں گے؟ آخر تم پہلے اپنے گھرانے کی فکر کیوں نہیں کرتے، انھیں کیوں نہیں سدھارتے؟ تم خواہ مخواہ محمد کے پیچھے کیوں پڑ گئے؟

میں نے پوچھا: میرے گھرانے سے تمھاری کیا مراد ہے؟

نعیم بن عبد اللہ: تمھاری بہن فاطمہ اور تمھارے بہنوئی سعید بن زید رضی اللہ عنہما...... ان دونوں نے بھی اسلام قبول کر لیا ہے اور محمد ﷺ کی پیروی کرنے لگے ہیں۔ تمھیں پہلے اپنے گھر کی خبر لینی چاہیے، بعد میں محمد ﷺ کی!

نعیم بن عبداللہ ؓ نے عمر بن خطاب ؓ کو یہ اطلاع اس لیے دی کہ وہ عمر بن خطاب ؓ کے تیور دیکھ کر ان کی بری نیت بھانپ گئے تھے، چنانچہ انھوں نے عمر بن خطاب ؓ کا رخ محمد ﷺ سے پھیر کر ان کے اپنے گھرانے کی طرف کر دیا۔

عمر بن خطاب ؓ طیش میں آ کر اپنی بہن کے گھر کی طرف چل دیے۔ بہن کے گھر پہنچے اور دروازے پر دستک دی، اس وقت ان کے گھر میں حضرت خباب بن ارت ؓ موجود تھے۔ انھوں نے عمر بن خطاب ؓ کی آواز سنی تو فوراً اُٹھے اور گھر کے ایک کونے میں چھپ گئے۔ ادھر فاطمہ بنت خطاب ؓ نے وہ صحیفہ جو خباب بن ارت ؓ لے کر آئے تھے اور انھیں پڑھا رہے تھے، چُھپا دیا۔ عمر بن خطاب ؓ دروازے ہی پر خباب بن ارت ؓ کی قراءت سن چکے تھے۔ جونہی دروازہ کُھلا، وہ گھر میں داخل ہوئے اور پوچھا:

مَا هَذِهِ الْهِينَةُ الَّتِي سَمِعْتُ

”یہ بھینی بھینی آواز کس کی تھی جو میں نے سنی ہے؟“

سعید بن زید ؓ نے کہا: نہیں، آپ نے کوئی آواز نہیں سنی، یہ محض آپ کا وہم ہے۔

عمر بن خطاب ؓ نے فوراً کہا:

بَلٰى وَاللّٰهِ! لَقَدْ أُخْبِرْتُ أَنَّكُمَا تَابَعْتُمَا مُحَمَّدًا عَلٰى دِينِهِ

”ہاں، اللہ کی قسم! مجھے بتایا گیا ہے کہ تم دونوں نے محمد ﷺ کا دین قبول کر لیا ہے۔“

یہ کہہ کر عمر بن خطاب ؓ نے اپنے بہنوئی کا گریبان کھینچا اور ان کی پٹائی شروع کر دی۔ ان کی بہن فاطمہ بنت خطاب ؓ شوہر کو بچانے آگے بڑھیں تو عمر بن خطاب ؓ نے انھیں بھی نہ بخشا۔ اتنا مارا کہ وہ زخمی ہو گئیں۔ انھوں نے بھائی کا یہ تشدد دیکھا تو بلند آہنگی سے کہا:

نَعَمْ ، لَقَدْ أَسْلَمْنَا وَآمَنَّا فَاصْنَعْ مَا بَدَا لَكَ

”ہاں ہاں! (کان کھول کر سن لو) ہم دونوں نے اسلام قبول کر لیا ہے اور اللہ پر ایمان لے آئے ہیں، ہمارے ساتھ جو چاہو کر لو (اب ہمارے دل سے اسلام ہرگز نہیں نکل سکتا)۔“

یہ ایک صاحب ایمان جری خاتون کی صدائے حق تھی جو بجلی کی طرح کڑکی اور عمر بن خطاب ؓ کو جھنجوڑ کر رکھ گئی۔ جب انھوں نے اپنی بہن کے جسم سے خون کی بوندیں ٹپکتی دیکھیں تو ان کا غُصہ ہرن ہو گیا اور اپنی جارحیت پر شرم محسوس کرنے لگے۔ بہن کے ایمانی جملے سے اُن پر کپکپی طاری ہو گئی...... سیدہ فاطمہ بنت خطاب ؓ کو کیا معلوم تھا کہ اُن کے حرفِ حق نے عمر کے دل میں کتنے بڑے انقلاب کے شعلے بھڑکا دیے ہیں۔

تو می دانی کہ سوز قراءتِ تو؟
دگرگوں کرد تقدیر عمر را!

اب عمر خفت سے بھیگے ہوئے لہجے میں ہمشیرہ محترمہ سے مخاطب ہوئے:

أَعْطِينِي هٰذِهِ الصَّحِيفَةَ الَّتِي سَمِعْتُكُمْ تَقْرَؤُونَ آنِفًا أَنْظُرْ مَا هٰذَا الَّذِي جَاءَ بِهِ مُحَمَّدٌ؟

”ذرا مجھے وہ صحیفہ تو دکھلاؤ جسے میں نے تم لوگوں کو ابھی پڑھتے سنا ہے، میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ آخر محمد ﷺ کون سی کتاب لائے ہیں؟“

عمر بن خطاب ؓ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ انھوں نے صحیفہ دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو بہن نے فرمایا:

إِنَّا نَخْشَاكَ عَلَيْهَا

”ہمیں اس صحیفے کے بارے میں تم سے خدشہ ہے (مبادا تم اس کی بے حرمتی کر بیٹھو)۔“

عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ڈرنے کی ضرورت نہیں، اپنے معبودوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اس صحیفے کا کچھ نہیں بگاڑوں گا، بس اسے پڑھوں گا اور تمھیں لوٹا دوں گا۔

بہن نے بھائی کی زبان سے یہ الفاظ سنے تو دل ہی میں یہ تمنا دامنگیر ہوئی کہ کاش! عمر رضی اللہ عنہ اسلام قبول کر لیں، چنانچہ انھوں نے کہا:

يَا أَخِي! أَنْتَ نَجِسٌ عَلَى شِرْكِكَ وَإِنَّهُ لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ

”میرے بھائی! تم اپنے شرک کی نجاست پر قائم رہنے کی وجہ سے ناپاک ہو۔ قرآن کو تو صرف پاک لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔“

بہن کی بات سن کر عمر رضی اللہ عنہ فوراً اٹھے، غسل کیا اور بہن کے پاس واپس آئے، اب انھوں نے انھیں صحیفہ دے دیا۔ یہ سورۂ طٰہٰ تھی۔ عمر رضی اللہ عنہ نے سورۂ طٰہٰ کی ابتدائی آیات ہی پڑھی تھیں کہ بے ساختہ پکار اُٹھے:

مَا أَحْسَنَ هٰذَا الْكَلَامَ وَأَكْرَمَهُ!

”یہ کلام کتنا اچھا اور کس قدر پاکیزہ ہے!“

اپنی ہمشیرہ محترمہ کی معیت میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما کے گنتی کے یہ چند لمحات کتنے محمود و مسعود تھے جنھوں نے اُن کے دل کی دنیا زیر و زبر کر کے تاریخ کا دھارا بدل ڈالا...... اب عمر پہلے والے عمر نہ تھے۔ اب وہ قبولِ حق کے لیے مائل ہو چکے تھے۔[1]

بہن کے ایک ہی ایمانی جملے نے عمر بن خطاب کی شہ زوری چت کر دی۔ وہ انتہائی

---

[1] دیکھیے السيرة الشامية :2/495.

بہادر ہونے کے باوجود بہن کے کلمات صداقت کے آگے ڈھیر ہو گئے۔ ہاں، وہ حروفِ عزم واستقلال بہن کی زبان سے اس وقت نکلے تھے جب بھائی کے ہاتھوں مار کھانے کے بعد وہ لہولہان ہوگئی تھیں۔ اس حالت میں بھی بہن کی حرارتِ ایمانی نے بھائی کے دل میں شمعِ اسلام روشن کردی۔ ہاں! وہ جملے یہ تھے:

> ”اے عمر! جو چاہو کرلو، جتنا چاہو ہمیں مار لو، جس طرح چاہو ہمیں ستاؤ مگر...... اسلام ہمارے دلوں میں راسخ ہو چکا ہے، اب وہ ہمارے دل سے کبھی نہیں نکل سکتا۔“ [1]

---

[1] البدء والتاريخ 89/5، البداية والنهاية 80/3 وغيرهما۔

اچھی تربیت کا صحیح طریقہ

اس کی عمر ابھی بیس سال سے آگے نہیں بڑھی تھی...... دولت وثروت کی گود میں اس کی پرورش و پرداخت ہوئی تھی...... دنیا کی کوئی نعمت ایسی نہ تھی جو اُسے میسر نہ آئی ہو۔...... اپنی زندگی میں اس نے کبھی معمولی سی تکلیف کا منہ بھی نہ دیکھا تھا...... وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا...... چار بہنوں کے بعد اس کی ولادت ہوئی تھی، اس لیے والدین کی طرف سے اسے بہت لاڈ پیار ملتا تھا...... اس کے والدین نے اس کا نام عادل رکھا۔

عادل اب انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کر چکا تھا...... ایک دن اس کے والد نے اسے اپنے پاس بٹھالیا اور کہنے لگا:

”بیٹے! میں جو کچھ کہوں، اسے دھیان سے سنو اور اس کے مطابق عمل کرو......

میری دلی تمنا ہے کہ اپنی زندگی میں تمھیں اپنے ساتھ کاروبار کرتا دیکھوں...... میرا خیال ہے یونیورسٹی میں تمھارے داخلے کا کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ...... کیونکہ یونیورسٹی کی ڈگری لیکر بھی تم اس کے مطابق کام نہیں کر سکو گے...... چونکہ میری تجارت اور میرا کاروبار تمھارے انتظار میں ہے......

عادل تھوڑی دیر سر جھکائے سوچتا رہا...... پھر بولا:

”ابا جان! آخر میں آپ کی باتوں سے اتفاق کیوں نہ کروں گا...... خود اپنے ہی بھلے کے لیے آپ کے ارشادات ماننے میں بھلا کیا حرج ہے؟...... جب مجھے اپنے کاروبار کا

ذمہ دار بننا ہی ہے تو مجھے اس کے اصول وضوابط اور حقیقت ضرور سمجھنی چاہیے......

تم مجھے اپنی حتمی رائے بتاؤ عادل!...... (والد نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔)

میں آپ کے ارشادات سے پوری طرح متفق ہوں، اللہ تعالیٰ تمھیں برکت دے۔

(......عادل نے سنجیدگی سے کہا۔)

عادل کی موافقت سے والد کو بڑی خوشی ہوئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی ساری تمناؤں کا دیرینہ خواب پورا ہو گیا...... والد اپنے بیٹے کی ہر خواہش منٹوں میں پوری کر دیتا تھا......۔

عادل اب اپنے والد کے ساتھ کاروبار میں شامل ہو چکا تھا......اُس نے باپ کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا...... وہ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک مختلف شہروں میں اپنے کاروبار کے سلسلے میں جانے لگا......ایک دن سفر سے واپسی پر وہ اپنے خالہ زاد ماجد کے گھر پہنچا...... جو اس کا سب سے قریبی دوست تھا۔ اس کی خالہ نے دروازہ کھولا اور کہنے لگی: ماجد اپنے کمرے میں تنہا پڑا ہوا ہے......لیکن میرے بیٹے عادل! میں تمھیں بتا دوں کہ ماجد پہلے سے بہت بدل چکا ہے۔

یہ سنتے ہی عادل کا رنگ بدل گیا۔ اس نے فوراً پوچھا: آخر وہ کیسے بدل گیا خالہ؟

خالہ نے جواب دیا: وہ کئی دن سے اپنے کمرے میں تنہا پڑا ہوا ہے، کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں......۔

عادل ہنس پڑا۔ کہنے لگا: خالہ! پریشانی کی کوئی بات نہیں......ان شاء اللہ میں اسے اصلی ڈگر پر لاتا ہوں۔ یہ کہہ کر عادل اپنے جگری ساتھی ماجد کے کمرے میں داخل ہوا...... دونوں انتہائی شوق سے ملے اور محوِ گفتگو ہو گئے۔ اچانک عادل نے دیکھا کہ ماجد کی حالت

غیر ہو رہی ہے۔

ماجد یہ کیا ہو گیا، تمھیں کون سا مرض چمٹ گیا ہے؟......

وہ ڈوبتے ڈولتے لہجے میں بولا: اس دراز میں انجکشن رکھا ہوا ہے۔ فوراً نکالو اور مجھے لگا دو......

ماجد انجکشن لگنے کے بعد اپنی طبعی حالت پر آ گیا۔

آخر یہ کون سا مرض لاحق ہو گیا ہے؟...... یہ کس بیماری کا انجکشن ہے؟......عادل نے حیرت سے پوچھا۔

دراصل یہ روگ ہیروئن پینے کی وجہ سے لگا ہے...... عادل! ہیروئن انسان کے لیے ایسی موت ہے جو بظاہر موج و مستی کے دامن میں چھپی رہتی ہے...... عادل! میں تمھیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم کبھی ہیروئن مت پینا ورنہ تمھارا بھی وہی حشر ہو گا جو میرا ہوا ہے!...... میں ایسے دور سے گزر رہا ہوں جس کا بیان طاقت سے باہر ہے...... میری زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔

ماجد کی بات سن کر عادل نے کندھے اُچکائے اور بڑی شانِ بے نیازی سے کہا: ایسی چیزیں مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچاتیں، یہ تو میرے لیے معمولی سی بات ہے، میں نے کئی دفعہ حشیش کا چسکا لیا ہے، مجھے تو آج تک کچھ نہیں ہوا......

ماجد نے کہا: بھئی! حشیش کا اثر ہیروئن سے مختلف ہے...... ہیروئن انسان کو قتل کر دیتی ہے...... عادل نے ماجد کی بات کو نا قابلِ توجہ سمجھا اور دراز سے ہیروئن نکال کر پینے لگا...... چند ہی لمحے گزرے تھے کہ اس نے کروٹ لی اور بے ہوش ہو گیا......تھوڑی دیر بعد جب وہ

ہوش میں آیا تو ماجد نے اسے پھر ہیروئن سے دور رہنے کی تلقین کی......۔

دوسرے دن عادل ماجد کے گھر گیا...... ماجد کے پاس اس کے دوستوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی...... وہ سب ہیروئن پینے میں منہمک تھے...... عادل نے ان کے ساتھ گزشتہ روز کی لذت لینی چاہی۔ چنانچہ وہ بھی ہیروئن پینے میں مصروف ہو گیا......

اچانک ایک دن عادل کو اطلاع ملی کہ ماجد اور اس کا تمام گروپ گرفتار ہو گیا ہے۔

اس کو ہیروئن فروخت کرنے والے نئے گروہ کا علم ہو گیا۔ اور جب ان کو معلوم ہوا کہ یہ امیر کاروباری ہے تو اسے نہایت مہنگی ہیروئن فروخت کرنے لگے۔

ماجد کچھ ہی مدت بعد جیل سے رہا ہو کر گھر آ گیا...... جیل سے آتے ہی اسے ہیروئن اور حشیش پینے کی وجہ سے ایسا مرض لاحق ہوا کہ وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر موت کے گھاٹ اُتر گیا...... ماجد کی وفات سے عادل کو بڑا دھچکا لگا...... کیونکہ ماجد اس کا بہت ہی قریبی دوست تھا...... اب عادل بھی بیمار رہنے لگا اور پھر وہ اپنے علاج کے لیے مصر کے دارالحکومت قاہرہ چلا گیا...... وہاں ڈاکٹروں نے اس کا اچھی طرح علاج کیا اور وہ شفایاب ہو کر وطن لوٹ آیا......

عادل اب نشہ آور چیزوں سے کلی طور پر سبکدوش ہو چکا تھا...... جب بھی اس کے خیالوں کا رخ نشے کی طرف بڑھنے لگتا، وہ فوراً چونکتا اور اپنے خیالوں کو جھٹک دیتا...... عادل کا والد اس کی اس حرکت سے یکسر بے خبر تھا...... ایک دفعہ اس نے کاروبار کے سلسلے میں اپنے بیٹے کو یورپ بھیجا...... اس ملک میں جہاں کی سوسائٹی مادر پدر آزاد ہے...... عادل کا وہاں ایک ایسے گروہ سے تعارف ہوا جس کے ارکان ہیروئن پیتے تھے انہوں نے اسے بھی اس کی دعوت دی۔ ان کا کہنا تھا کہ تھوڑی بہت پی لو، تمھیں کوئی

نقصان نہیں پہنچے گا، تم اسے پی کر تو دیکھو کہ کتنا مزہ آتا ہے...... اگر پسند آئے تو استعمال کرنا ورنہ ترک کر دینا......

عادل ان کی باتوں کی حقیقت خوب سمجھتا تھا...... عادل نے خود کو ہیروئن کے استعمال سے کچھ دن تک بچائے رکھا مگر کب تک؟ برے دوستوں کی باتیں اس کے دل و دماغ میں سرایت کر ہی گئیں، چنانچہ اس نے پھر ہیروئن پینی شروع کر دی۔ اس کے نتیجے میں اس کی حالت بگڑتی چلی گئی ...... اب وہ ہیروئن کے بغیر رہ نہیں سکتا تھا...... دوستوں نے جب عادل کی یہ صورتحال دیکھی تو انھوں نے اس کے خلاف ایک سازش کی۔ اس کی لاکھوں کی رقم چوری کر لی ...... اور وہاں سے بھاگ گئے......

عادل کو ہوش آیا تو وہ لٹ چکا تھا...... جب وہ مقررہ پروگرام کے مطابق واپس نہیں آیا تو اس کے والدین کو بڑی تشویش لاحق ہوئی، چنانچہ اس کا والد اس کی تلاش میں یورپ گیا...... جب وہ متعلقہ شہر پہنچ کر اُس کمرے میں گیا جہاں اس کا بیٹا ٹھہرا ہوا تھا تو یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ عادل نشے میں لت پت پڑا ہے...... اس کی شکل بگڑ چکی ہے، بدن کا رنگ و روپ اُجڑ چکا ہے اور صحت کی چولیں ہل چکی ہیں......

یہ منظر دیکھ کر والد کو ناقابلِ بیان صدمہ ہوا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے...... وہ بیٹے کو لے کر واپس وطن آیا ایک اچھے ہاسپٹل میں علاج کے لیے داخل کرایا...... اللہ کے فضل اور پھر ڈاکٹروں کی کوشش سے وہ شفایاب ہو گیا۔

اس واقعے سے عادل کے والدین کی آنکھیں کھل گئیں اور انھیں ایسا سبق حاصل ہوا جسے وہ زندگی بھر نہ بھلا سکے...... انھیں اب محسوس ہوا کہ اولاد کو بھاری رقم دے کر اور اس پر اندھا اعتماد کر کے اس کی اچھی تربیت نہیں کی جا سکتی...... خاص طور پر نوجوانوں کو ان کی

ضرورت سے زیادہ پیسہ دینا اور ان کا دھیان نہ رکھنا ایسی حماقت ہے جس کی بعض اوقات تلافی بھی نہیں ہو پاتی۔ یہ فیاضی ان کو گڑھے میں دھکا دینے کے مترادف ہے...... اولاد کی اچھی تربیت کے لیے ضروری ہے کہ اسے محدود بجٹ دیا جائے، اس کے لیل ونہار پر کڑی نظر رکھی جائے اور اس کی حرکات وسکنات غور سے جانچی جائیں تاکہ وہ بری صحبت کا شکار نہ ہونے پائے......۔

عادل شفایاب ہو کر ہاسپٹل سے نکلا تو اس کے والدین نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور ایک نیک لڑکی تلاش کر کے اس کی شادی کر دی، تاکہ وہ منحرف لوگوں کا راستہ اختیار نہ کر سکے...... اب بیٹے کے ساتھ ان کا برتاؤ بدل گیا۔ اب وہ اپنے بیٹے کو جو کچھ دیتے تھے وہ حسبِ ضرورت ہی دیتے تھے۔ وہ اس کی نگرانی بھی کرتے تھے اور اس کے ساتھ نرمی اور نوازش سے بھی پیش آتے تھے...... اچھی تربیت کا یہی مناسب اور مؤثر طریقہ ہے......۔[1]

---

[1] قصص من الواقع، ص:171-177۔

خلیفہ منصور کو خالد برمکی کا مشورہ

خلیفہ منصور [1] نے جب علاقہ ہاشمیہ کو دارالخلافت کے لیے ناکافی پایا تو اسے ایک وسیع اور پرفضا جگہ کی جستجو ہوئی۔ نوشیرواں کا ''باغ داذ'' اپنے مختصر نام ''بغداد'' سے مشہور تھا۔ خلیفہ کو یہ باغ متعدد ملکی مصلحتوں اور آب و ہوا کے اعتدال کی وجہ سے بہت پسند آیا، چنانچہ اب ملک بھر سے معمار اور ماہر کاریگر طلب کیے گئے۔

خلیفہ کی طبیعت میں کفایت شعاری کنجوسی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی، اس لیے چند ایک مصاحبین کے مشورے سے قرار پایا کہ نوشیرواں عادل کے شاہی محلات جو مدائن میں موجود ہیں اور بطورِ خاص ایوان کسریٰ، جو نہایت وسیع عمارت ہے، سب کو مسمار کر کے انھی کی اینٹوں سے بغداد کی تعمیر شروع کی جائے۔

خالد برمکی [2] خلیفہ کا وزیر تھا۔ اس نے ادب سے عرض کیا: امیر المومنین! آپ کا یہ حکم

---

[1] خلیفہ منصور بڑا دلیر اور مدبر حکمران تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اچھی حکومت کے چار ستون ہیں۔ (الف) ایسے قاضی جو صرف اللہ رب العزت سے ڈریں، حق و انصاف سے فیصلے کریں اور عدل کے معاملے میں کسی سے رعایت نہ کریں۔ (ب) مضبوط پولیس جو کمزور اور بے بس لوگوں کی مدد کرے۔ (ج) مالیہ وصول کرنے والے افسر جو جانچ تول کر دمڑی دمڑی وصول کریں۔ (د) وقائع نگار، یعنی اخبار نویس جو سلطنت کے گوشے گوشے سے صحیح اطلاعات بھیجتے رہیں۔ وہ 158 ہجری میں حج کے لیے نکلا، مکہ مکرمہ کے قریب پہنچا ہی تھا کہ بحالتِ احرام وفات پا گیا۔ بغداد کی داغ بیل ڈالنا اس کا بڑا اہم کارنامہ ہے۔ اُسی کے زمانے میں یہ شہر علمائے کرام کا مرکز بن گیا تھا۔

[2] برامکہ دراصل بدھ مت کے پیروکار تھے۔ بلخ کے رہنے والے تھے۔ خالد کا باپ مسلمان ہو گیا۔ بعض مؤرخین نے انھیں آتش پرست بتایا ہے جو صحیح نہیں۔ خالد برامکہ خاندان کا فرد فرید تھا۔ نہایت دور اندیش ◂◂

نامناسب ہے۔ کئی اسباب کی وجہ سے ایوانِ کسریٰ کو ڈھا دینا صحیح نہ ہوگا۔ آثارِ قدیمہ مجسم تاریخ ہوتے ہیں۔ فتوحاتِ اسلام کے حوالے سے ایوانِ کسری کی ایک خاص اہمیت ہے۔ اسے دیکھ کر دورِ خلافت راشدہ کی یاد تازہ ہوجاتی ہے اور رسول اللہ ﷺ کے اس معجزے کی تصدیق بھی ہوتی ہے جو آپ ﷺ کی ولادت کے وقت ظہور میں آیا تھا۔ اس معاملے کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ نوشیرواں اور خسرو پرویز نے ایوانِ کسریٰ نہایت مضبوط بنیادوں پر بنوایا تھا۔ زمانہ اور زندگی کتنی ہی کروٹیں بدل چکے، کتنے طوفان، کتنے سیلاب اور کتنے زلزلے آئے ہیں مگر ایوانِ کسری کی محکمی میں آج تک کوئی فرق نہیں آیا۔ آپ اسے مسمار کرنے پر جتنی رقم خرچ کریں گے، اتنی رقم میں تو ایک نیا عالی شان محل تعمیر ہوسکتا ہے۔ مزید برآں آپ اسے ڈھا دیں گے تو لوگ صدمہ محسوس کریں گے اور آپ کے بارے میں خوش رائے نہیں رہیں گے۔

خلیفہ نے اس دانش مندانہ مشورے پر کوئی توجہ نہ دی اور ایوانِ کسریٰ کو ڈھانے کا حکم دے دیا۔ ابھی ایوان کا ایک گوشہ (سفید محل) ہی توڑنا شروع کیا تھا کہ تھوڑے ہی دنوں کے حساب کتاب نے منصور پر ثابت کر دیا کہ جس قدر مزدوری ڈھانے پر خرچ ہو رہی ہے اس سے نصف مالیت کا سامان بھی دستیاب نہیں ہو رہا۔ آخر اس نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور ایوان کی توڑ پھوڑ بند کرا دی۔

◄◄ اور صاحب علم و فضل تھا۔ برامکہ کو 170 ہجری میں عروج حاصل ہوا۔ وہ پورے 17 برس تک سلطنت عباسی کے سیاہ و سفید کے مختار رہے۔ یحیی برمکی سمیت اس خاندان کے اکثر افراد نہایت عالم فاضل تھے۔ اہل بیت رضی اللہ عنہم سے بدرجہ غایت عقیدت رکھتے تھے۔ ہارون الرشید ان سے خوفزدہ ہوگیا۔ اور دیگر عباسی خاندان کے لوگ بھی یہ باور کرنے لگے کہ برامکہ کسی بھی وقت عباسیوں کا پتا کاٹ کر اہل بیت کو مسند خلافت پر بٹھا دیں گے۔ عباسی خاندان کا یہی شبہ برامکہ کے زوال کا باعث بنا۔

خالد نے پھر عرض کیا: میں التوا کے خلاف ہوں، کام بدستور جاری رہنا چاہیے اور سارا ایوان مسمار کر دینا چاہیے۔

منصور نے کہا: پہلے تمھاری رائے مختلف تھی۔ اب تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟ خالد نے کہا: جناب والا! میں نے پہلے انہدام سے اس لیے منع کیا تھا کہ ملوک عجم کی یادگار قائم رہنے سے جہاں ان کے ماضی کی ہیبت وشوکت کا اظہار ہوتا ہے، وہاں یہ عمارتیں زبان حال سے یہ بھی بتاتی ہیں کہ جس قوم نے اس پر فتح پائی ہے، وہ عجم والوں سے زیادہ زبردست اور طاقتور ہے اور اب جو میں کہتا ہوں کہ ایوان گرادیا جائے تو اس میں یہ حکمت ہے کہ جب آئندہ نسلیں عمارت کے ایک حصے کو ٹوٹا پھوٹا دیکھیں گی تو کہیں گی کہ عمارت اس قدر مستحکم تھی کہ آپ کی حکومت اسے توڑنے کی بھی سکت نہیں رکھتی تھی، حالانکہ بنانے سے توڑنا آسان ہے، اس لیے اس شکستہ عمارت کو دیکھ کر لوگ ملوکِ فارس کی تعظیم اور شاہانِ اسلام کی توہین کرتے رہیں گے۔

منصور نے اس مشورے پر بھی عمل نہ کیا اور ٹوٹی پھوٹی عمارت کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ لیکن وزیر نے مناسب مشورہ دینے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔[1]

---

[1] ناقابل فراموش واقعات 145۔ تالیف محمد دین فوق۔

بارگاہ الٰہی میں جوابدہی کا احساس

قاضی ابو یوسف کے مرض الموت میں ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلے:

'اللہ کی قسم! میں نے کبھی زنا کا ارتکاب نہیں کیا، اللہ کی قسم! میں نے فیصلہ دینے میں کبھی بھی ظلم وزیادتی سے کام نہیں لیا اور نہ ہی میں اپنے بارے میں کسی بات سے خوف کرتا ہوں؛ البتہ ایک بات کا خدشہ ضرور ہے جو مجھ سے سرزد ہو گئی تھی'۔

کسی نے پوچھا: ''آخر وہ کونسی غلطی ہے؟''۔

کہنے لگے: دراصل بات یہ ہے کہ ایک روز میں شکایات کے اوراق ترتیب دے رہا تھا کہ مجھے ایک نصرانی کا شکوہ نامہ نظر آیا۔ اس نے خلیفہ ہارون رشید پر ظلم کا دعویٰ کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہارون رشید نے اس کی ایک جاگیر پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے۔ میں نے نصرانی کو بلوایا اور پوچھا: جس جاگیر کا تم نے دعویٰ کیا ہے ابھی وہ کس کے قبضے میں ہے؟

نصرانی: امیر المومنین ہارون رشید کے قبضے میں!!

قاضی ابو یوسف: اس جاگیر کی آمدنی کون لیتا ہے؟

نصرانی: امیر المومنین!!

چنانچہ میں نے اس کا شکوہ بھی دوسرے لوگوں کے اوراق کے ساتھ رکھ لیا۔

دوسرے دن جب عدالت کا دروازہ کھلا تو میں نے اپنی نشست سنبھالی اور یکے بعد دیگرے ان لوگوں کا نام پکارنے لگا جن کے نام میرے اوراق میں درج تھے۔ نصرانی کا نام بھی آیا اور میں نے اسے پکارا۔ وہ جب عدالت کے سامنے حاضر ہوا تو میں نے امیر المومنین کے خلاف اس کا شکایت نامہ پڑھا۔

امیر المومنین نے اپنے خلاف مقدمہ سن کر کہا: نصرانی نے جس جاگیر کا ذکر کیا ہے وہ تو ہم نے اپنے دادا ابوجعفر منصور سے وراثت میں پائی ہے۔

میں نصرانی کی طرف متوجہ ہوا اور کہا:

''امیر المومنین نے جو کچھ کہا ہے اسے تم نے سن لیا، کیا تمہارے مقدمے کی تائید میں کوئی گواہ ہے؟''۔

نصرانی گویا ہوا: میرے مقدمے پر کوئی گواہ تو نہیں ہے؛ البتہ آپ امیر المومنین سے قسم اٹھوائیں کہ یہ جاگیر انھیں کی ہے۔

میں نے امیر المومنین سے پوچھا: کیا آپ قسم کھانے کو تیار ہیں؟!

امیر المومنین نے کہا: ہاں، میں قسم کھانے کو تیار ہوں۔

پھر امیر المومنین نے بھرے مجمع میں قسم کھائی اور نصرانی اپنے گھر لوٹ گیا۔

قاضی ابویوسف نے کہا:

''صرف اسی بات سے مجھے اپنے بارے میں خدشہ ہے''۔

حاضرین نے پوچھا:

''بھلا اس سلسلے میں خدشے کی کونسی بات ہے، جبکہ آپ کے اوپر جو کچھ واجب تھا اسے آپ نے انجام دے دیا؟''۔

قاضی ابویوسف نے کہا:

''امیر المومنین کو مدعی کے مدمقابل نہ بٹھانے کے سبب!''[1]۔

---

[1] دیکھئے: حسن التقاضي، للكوثري (67-68)۔

جھوٹی توبہ

جام مرا توبہ شکن، توبہ مری جام شکن
سامنے ڈھیر ہے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کا

منصور بن عمار کا بیان ہے: میرا ایک دوست تھا جو گناہوں میں ملوث تھا۔ اس نے توبہ کر لی، پھر میں نے دیکھا کہ وہ بڑی پابندی سے اطاعت و بندگی کے اعمال بجا لاتا اور تہجد گزار بھی بن گیا۔

ایک دن میری اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ میرے پوچھنے پر لوگوں نے بتایا کہ وہ بیمار ہے۔ میں اس کے گھر پہنچا، دستک دی تو اس کی بیٹی نکلی، اس نے پوچھا:

کس سے ملنا ہے؟ میں نے بتایا: فلاں آدمی سے۔

لڑکی نے اپنے والد سے میرے لیے اجازت طلب کی۔ جب میں گھر میں داخل ہوا تو وہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر سیاہی چھا گئی تھی، آنکھیں آنسو برسا رہی تھیں اور ہونٹ پھول گئے تھے۔ میں دہشت زدہ ہو گیا۔ عرض کیا: برادرِ من! کثرت سے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھو۔

اس نے دزدیدہ نگاہوں سے میری طرف تاکا، پھر اس پر غشی طاری ہو گئی۔ میں نے دوبارہ کہا:

برادرِ من! زیادہ سے زیادہ کلمہ طیبہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا ورد کرو۔ اسی طرح میں نے

تیسری مرتبہ پھر کلمہ پڑھنے کی تلقین کی۔

اس نے آنکھیں کھولیں اور بڑی حسرت سے بولا: بھئی منصور! میرے اور اس کلمے کے درمیان رکاوٹ کھڑی کر دی گئی ہے۔ میں نے لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ إِلَّا بِاللّٰہِ پڑھا اور پوچھا:

بھئی آخران نمازوں، روزوں اور تہجد وشب بیداری کا کیا ہوا؟

وہ بولا:

یہ سب کچھ غیر اللہ کے لیے تھا۔ میری توبہ دکھلاوے کی تھی۔ میں یہ سب اس لیے کرتا تھا تاکہ لوگوں کے درمیان موضوعِ سخن بنا رہوں اور وہ میرا چرچا کرتے رہیں۔ مجھے یاد کرتے رہیں۔ یہ سب کچھ میں نے لوگوں کے دکھلاوے کے لیے کیا تھا۔ جب میں تنہا ہوتا تو دروازہ بند کرتا، پردہ گراتا، شراب نوشی کرتا اور اپنے پروردگار کی نافرمانی میں مگن ہو جاتا تھا۔

مدتوں میرے یہی کرتوت رہے حتیٰ کہ مجھے بیماری نے آ پکڑا اور میں ہلاکت کے دہانے پر پہنچ گیا۔ میں نے اپنی بیٹی سے قرآن پاک طلب کیا اور اللہ تعالیٰ کے کلامِ حق کی قسم کھا کر شفایاب ہونے کی دعا مانگی اور اللہ رب العزت کی بارگاہ میں وعدہ کیا کہ اب ہرگز کسی قسم کا گناہ نہیں کروں گا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مجھے شفایاب کر دیا۔

جب اللہ تعالیٰ نے مجھے شفا عنایت کر دی تو میں پھر اپنی پرانی ڈگر پر چل پڑا اور لہو و لعب اور لذات وخواہشات میں ڈوب گیا۔ شیطان نے بھی مجھے تھپکی دی۔ میری گمراہیوں کو بڑھاوا دیا، اس نے میرے اور پروردگار کے درمیان کیا گیا عہد و پیمان ردی کی ٹوکری میں ڈلوا دیا اور میں دیر تک طرح طرح کے گناہوں کی طغیانیوں میں ڈبکیاں لگاتا رہا۔

یکا یک مجھے پھر بیماری نے آ دبوچا اور میں مرنے کے قریب ہو گیا۔ میرے اہلِ خانہ نے میرے حکم کے مطابق حسبِ معمول گھر کے بیچ میں میرا بستر لگا دیا۔ میں نے قرآن کریم منگوایا اس کی تلاوت کی اور اسے اٹھا کر بآ وازِ بلند یہ دعا کی:

الٰہی! اس قرآن پاک میں موجود تیرے محرمات کی قسم کھا کر عہد کرتا ہوں، اگر تو نے مجھے صحت بخش دی تو اب میں ہرگز برائیوں میں ملوث نہیں ہوں گا۔

اللہ تعالیٰ نے میری دعا سن لی۔ میری توبہ قبول فرمائی اور مجھے صحت و عافیت سے نواز دیا۔ لیکن افسوس اپنی پستی اور عہد شکنی پر! کہ اس رب کریم کی بار بار مہربانی کے باوجود میں پھر لہو ولعب اور لذّات وخواہشات کے گرداب میں ڈوب گیا۔ نوبت بایں جا رسید کہ آج اس دردناک مرض میں مبتلا ہو چکا ہوں۔ حسبِ عادت میرے اہل خانہ نے بیچ گھر میں میرا بستر لگا دیا ہے جیسا کہ تم بچشم خود دیکھ رہے ہو۔ میں نے پھر قرآن منگوایا، تلاوت کرنے لگا لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔

مجھے یقین ہو گیا کہ اللہ رب العزت مجھ پر سخت غضبناک ہے۔ پس میں نے اپنا سر آسمان کی طرف اُٹھایا اور دعا کی:

الٰہی! آسمان و زمین کے حکمران! میری مصیبتوں سے مجھے نجات دے۔ لیکن معًا میرے کانوں میں ایک صدا گونجی، پھر یوں لگا جیسے کوئی غیبی آواز یہ اشعار گنگنا رہی ہے:

تَتُوبُ عَنِ الذُّنُوبِ إِذَا مَرِضْتَ
وَتَرْجِعُ لِلذُّنُوبِ إِذَا بَرِئْتَ

”جب تمھیں بیماری آ لگتی ہے تو گناہوں سے تائب ہو جاتے ہو لیکن جونہی شفا نصیب ہوتی ہے، پھر گناہوں میں ملوث ہو جاتے ہو۔“

فَكَمْ مِّنْ كُرْبَةٍ نَجَّاكَ مِنْهَا
وَكَمْ كَشَفَ الْبَلَاءَ إِذَا بُلِيتَ

”اللہ تعالیٰ نے تجھے دردو الم سے کتنی دفعہ نجات بخشی ہے اور بار ہا آشوب وآزمائش کے گڑھے سے نکالا ہے۔“

أَمَا تَخْشَى بِأَنْ تَلْقَى الْمَنَايَا
وَ أَنْتَ عَلَى الْخَطَايَا قَدْ وُهِيتَ

”کیا تجھے خواہشاتِ نفسانی کے طوفان میں اُڑنے سے پہلے موت کا خوف دامن گیر نہیں ہوا، حالانکہ خطا کاریوں کی بنا پر تجھے بار ہا آفت رسیدہ ہونا پڑا تھا۔“

منصور بن عمار کہتے ہیں:

اللہ کی قسم! جب میں اس سے رخصت ہو کر واپس چلا تو میری آنکھیں اشکبار ہو گئیں، میں ابھی دروازے تک ہی پہنچا تھا کہ بے ساختہ آہ و بکا میں بھیگی ہوئی آواز آئی:

إِنَّهُ قَدْ مَاتَ

”وہ مر گیا!“[1]

---

[1] دیکھیے کتاب: مائة قصة و قصة، القسم الأول: 21-23، محمد امین الجندی۔

کفر و سرکشی کی سزا

بلعام بن باعورا بنی اسرائیل کے متقدمین میں سے تھا۔ وہ مستجاب الدعوات تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کا اسمِ اعظم جانتا تھا۔ اس کی رہائش ان لوگوں کے درمیان تھی جو زمین کو ظلم و طغیان سے بھرتے اور فساد برپا کرتے تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ”جب موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے اصحاب کنعانی ظالموں اور سرکشوں سے نبرد آزما ہوئے تو بلعام بن باعورا کے چچا زاد بھائی اس کی خدمت میں حاضر ہوئے، موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم کی قوت کا حوالہ دیا اور خبردار کیا کہ اگر موسیٰ علیہ السلام کا یہ لشکر ہماری سرزمین میں داخل ہو گیا تو تباہی مچ جائے گی۔

بلعام بن باعورا نے ان سے کہا: اگر میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کروں کہ وہ موسیٰ علیہ السلام اور ان کے لشکر کو پھیر دے تو میری دنیا و آخرت دونوں کا ستیاناس ہو جائے گا۔ لیکن اس کے چچا زاد برابر اصرار کرتے رہے حتیٰ کہ بلعام بن باعورا نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کے لشکر کے لیے بددعا کی مگر اللہ تعالیٰ نے خود اسی کو اس کی بددعا کا نشانہ بنا دیا اور وہ اپنے اعلیٰ مرتبے سے گر گیا۔

امام سُدّی کہتے ہیں: جب چالیس سال کا وقفہ گزر گیا تو اللہ تعالیٰ نے یوشع[1] بن نون علیہ السلام کو نبی بنا کر بنی اسرائیل کی طرف مبعوث فرمایا۔ یوشع بن نون علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو آگاہ

---

[1] یوشع بن نون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خادم تھے۔ ایک موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل سے خطاب فرما رہے تھے۔ انھوں نے پوچھا: سب سے بڑا عالم کون ہے؟ حضرت موسیٰ نے فرمایا: میں ہوں۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کو پسند نہ آئی۔ اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی کہ آپ نے یہ کیوں نہیں کہا کہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے؟

◀◀

کیا کہ میں اللہ کا نبی ہوں اور اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ تم سب مل کر ظلم و طغیان اور فساد کا بازار گرم کرنے والوں کے خلاف میدانِ کارزار میں نکلو۔ بنی اسرائیل نے ان کے ہاتھ پر بیعت کرکے ان کی تصدیق کی۔ لیکن بلعام نے یوشع بن نون علیہ السلام کی دعوت قبول کرنے سے انکار کردیا۔ وہ ظالموں اور سرکشوں کی صف میں جا ملا اور ان سے کہا: تم لوگ بنی اسرائیل سے نہ ڈرو کیونکہ جب تم ان کے مقابلے کے لیے میدانِ جنگ میں نکلو گے تو میں ان کے لیے بددعا کردوں گا جس کے زیرِ اثر وہ سب ہلاک ہو جائیں گے۔

بلعام بن باعورا کے پاس دنیاوی جاہ و مال کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اس کے باوجود شیطان اس پر غالب آ گیا، چنانچہ وہ اپنے کفر و سرکشی کے باعث گمراہوں کی فہرست میں شامل ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ○ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾

”اور (اے نبی!) انھیں اس شخص کی خبر پڑھ کر سنا دو جسے ہم نے اپنی آیتیں دی تھیں مگر وہ ان (کی پابندی) سے نکل بھاگا تو شیطان اس کے پیچھے لگ گیا۔ نتیجہ

»» مزید فرمایا: جہاں دو دریا ملتے ہیں، وہاں میرا ایک بندہ ہے جو آپ سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ یہ خضر علیہ السلام کی طرف اشارہ تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملنے گئے۔ اِس موقع پر یوشع بن نون علیہ السلام بھی آپ کے ساتھ تھے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام آج بھی زندہ ہیں مگر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے قرآن و حدیث کے دلائل سے اِس دعوے کی تردید کی ہے۔

یہ نکلا کہ وہ گمراہوں میں سے ہوگیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو ان (آیتوں) کے ذریعے سے اس کا مرتبہ بلند کر دیتے لیکن وہ پستی کی طرف جھکا اور خواہشِ نفس کی پیروی کرنے لگا، چنانچہ اس کی مثال کتے کی سی ہوگئی۔ اسے مشقت میں ڈالو تب بھی ہانپتا ہے اور زبان لٹکائے رکھتا ہے، چھوڑ دو تب بھی ایسا ہی کرتا ہے۔ یہی مثال ان لوگوں کی ہے جنھوں نے ہماری آیات جھٹلائیں، پس (اے نبی!) آپ یہ حکایت لوگوں کو سنا دیں تاکہ وہ اس پر غور و فکر کریں۔''[1]

---

[1] الأعراف 7:175,176. من أخبار المنتكسين لصالح العصيمي، (228).

اللہ تعالیٰ اس کی گھات میں تھا!

اس کی کل پونجی ایک گائے تھی، اسی پر اس کی زندگی کا انحصار تھا۔ لیکن مجبوری بری بلا ہے، اپنا ردعمل ضرور ظاہر کرتی ہے اور اپنا رنگ دکھلائے بغیر نہیں رہتی، اس لیے تو کہتے ہیں: مفلسی میں آٹا گیلا۔ اس نے مجبور ہوکر بالآخر اپنی گائے بیچ ڈالی۔ گائے کی قیمت ساڑھے تین ہزار درہم لگی۔ اس نے یہ رقم لے کر بڑی احتیاط سے ایک تھیلے میں چھپائی اور اپنے گھر روانہ ہوگیا۔ واپسی کے سفر میں اس کے چہرے پر حسرت وغم کے آثار پھیل گئے۔ وہ رہ رہ کر سوچ رہا تھا کہ قلاشی ہمارے گلے کا ہار ہوگئی ہے۔ فقروفاقہ کے دن گزر رہے ہیں، کہیں سے آمدنی کا کوئی امکان نہیں۔ ایسے کڑے وقت میں جب بیوی کو معلوم ہوگا کہ گائے بھی بک گئی ہے تو اس پر کیا بیتے گی؟ اور میں اس کے حسرتناک سوالوں کا کیا جواب دوں گا؟ اسی فکرو وحشت میں اس کے ڈولتے ڈگمگاتے قدم آگے بڑھتے رہے۔ بالآخر وہ گھر پہنچ گیا۔ دروازے پر دستک دی، بیوی لپک کر آئی، دروازہ کھولا اور وہ مرجھائے ہوئے دل اور جھکے ہوئے سر کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

یہ حالت دیکھتے ہی بیوی نے تشویش ناک انداز میں پوچھا: ارے! آپ خالی ہاتھ آئے ہیں۔ ”اُف!......کیا......؟ کیا آپ نے گائے بیچ ڈالی؟......صرف یہی ایک گائے تو ہماری آخری پونجی تھی۔“

”گھبراؤ مت بیگم! اللہ تعالیٰ ہمیں اس کا اچھا بدلہ عنایت کرے گا، قادر مطلق کے لیے

کوئی بات مشکل نہیں۔'' شوہر نے بیوی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

فضا میں شام چھا جانے کو تھی۔ سورج اپنی شعاعیں سمیٹ رہا تھا۔ شفق کے سرخ مناظر اس دن کو آخری سلامی دے رہے تھے اور پھر کچھ دیر بعد دیکھتے ہی دیکھتے دن کی روشنی چُھپ گئی اور رات اُترنے لگی۔ سردی کی لہر اپنے شباب پر تھی۔

ابوحسن اور اس کی بیوی اپنے معمولی سے کمرے میں مغموم بیٹھے تھے۔ گائے بک جانے کے بعد اب وہ اپنی گزر بسر کا کوئی اور ذریعہ ڈھونڈنے کی فکر میں تھے۔ وہ اپنی چھوٹی سی کٹیا آباد رکھنا چاہتے تھے، اس دوران ام حسن اپنے لخت جگر کو شیشی کے دودھ کے ذریعے بہلا پُھسلا رہی تھی تا کہ بچے کا دودھ چھڑانے میں کامیاب ہو جائے۔ اتنے میں دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

ابوحسن نے دروازہ کھولا، سامنے ایک آدمی کھڑا تھا، وہ بارش اور سردی کی شدت سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس نے نہایت عاجزی سے کہا: میں اجنبی ہوں۔ سردی کے شدید طوفان میں تمھاری بستی میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ یہاں میری کسی سے جان پہچان نہیں۔ مجھے حمص جانا ہے لیکن راستے میں مجھے رکنا پڑا۔

ابوحسن نے کہا: ہم آپ کے لیے بھلا کیا مہیا کر سکتے ہیں، ہمارا گھر اس قدر تنگ ہے کہ ہمیں مہمانوں کے استقبال کی اجازت نہیں دیتا۔

اجنبی بولا: صرف سردی سے بچنے کا بندوبست کر دو، میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ بس رات گزارنے کی اجازت دے دو، مجھے اور کسی چیز کی حاجت نہیں، میں تم پر کسی خرچ کا بوجھ نہیں ڈالوں گا۔

ابوحسن نے اُسے بتایا: ہمارے پاس صرف یہی ایک ننھا سا کمرہ ہے، اس میں میرے

ساتھ میری بیوی اور ہمارا چھوٹا سا بچہ سو رہا ہے، اس لیے ہم آپ سے معذرت خواہ ہیں۔ افسوس! ہم آپ کی خدمت نہیں کر سکتے۔

اجنبی نے کہا: میں کمرے کے ایک کنارے سو رہوں گا، تم دوسری جانب سو جانا، تم میرے اور اپنے درمیان کوئی پردہ ڈال لو، اللہ تعالیٰ تمھیں اجر دے گا۔

یہ عاجزانہ باتیں سن کر ام حسن کا دل پسیج گیا۔ اُس نے شوہر سے کہا: اے ابوحسن! اللہ تعالیٰ ہماری مدد کرے گا۔ ممکن ہے اس اجنبی مہمان کے ساتھ حسن سلوک کے صلے میں اللہ تعالیٰ ہماری مصیبتوں کا پہاڑ ٹال دے۔

پھر دونوں میاں بیوی نے اجنبی مہمان کا پرتپاک استقبال کیا۔ جو کچھ اوڑھنا بچھونا میسر تھا، مہمان کو فراہم کر دیا۔ خود بستر پر لیٹ رہے، چند ہی لمحے گزرے تھے کہ ابوحسن اور اس کی بیوی دونوں ایسی غفلت اور غلبے کی نیند سوئے کہ خراٹے لینے لگے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دونوں میاں بیوی دن بھر کی زبردست محنت ومشقت کے باعث بہت تھکے ہوئے تھے۔

ادھر اجنبی گھر والوں کو بغور تاڑ رہا تھا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ دونوں میاں بیوی دنیا ومافیہا سے بے خبر ہو کر گہری نیند میں غرق ہو چکے ہیں اور ان کے پہلو میں ان کا دودھ پیتا بچہ بھی مزے سے سو رہا ہے تو وہ نہایت آہستگی سے اٹھا اور دبے پاؤں چلتا ہوا بچے کی جگہ تلاش کرنے لگا، پھر جلدی بچے کو اٹھایا اور کمرے سے باہر آنگن میں ڈال آیا...... پھر جلدی سے اپنے بستر پر آ کر اس طرح لیٹ گیا جیسے گہری نیند سو رہا ہو۔...... باہر کھلی فضا میں بچے کو سخت سردی لگی تو وہ رونے اور چلانے لگا۔ بچے کے رونے کی آواز سن کر ماں فوراً جاگ اُٹھی۔ بچے کو ڈھونڈا لیکن بچہ بستر پر موجود نہ تھا۔ اس نے شوہر کو جگایا اور کہا: شاید ہمارا بیٹا کھسکتے کھسکتے آنگن میں چلا گیا ہے، آیئے جلدی اُٹھیے اسے اٹھا کر بستر پر

لے آئیں ورنہ اسے ٹھنڈ لگ جائے گی۔ دونوں میاں بیوی لپک کر بستر سے اٹھے اور بچے کو لینے آنگن میں گئے۔ ماں نے بیٹے کو دیکھتے ہی چھاتی سے چمٹا لیا اور کہنے لگی:

میرے پیارے، میرے لختِ جگر! میرے بچے! اس کڑاکے کی سردی میں تو بستر سے یہاں کیوں آ نکلا؟...... ابھی دونوں میاں بیوی اپنے لختِ جگر کو لے کر کمرے کی طرف بڑھ ہی رہے تھے کہ یکا یک اس کی چھت دھڑام سے گر پڑی اور پھر پورا گھر منہدم ہو گیا۔ میاں بیوی سکتے کے عالم میں جہاں تھے وہیں کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

پڑوسیوں نے چھت گرنے کا شور سُنا تو فوراً امداد کے لیے آ پہنچے۔ ابوحسن نے بلند آہنگی سے کہا:

لوگو! ہمارے گھر میں ایک مہمان ہے، اُسے بچانا ہمارا فرض ہے، پھر ابوحسن اور چند پڑوسی مکان کا ملبہ اٹھا اٹھا کر ابوحسن کی چارپائی تک پہنچے۔ وہاں مہمان کی لاش ملبے تلے دبی پڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں نقدی کی وہ تھیلی موجود تھی جس میں ابوحسن نے گائے کے عوض ملنے والی رقم چھپا رکھی تھی۔ اجنبی ابوحسن کے تکیے کے نیچے سے یہ تھیلی اٹھا کر رفو چکر ہونے والا تھا کہ ملبے تلے دب گیا۔

دراصل اِس چور نے ابوحسن کو بازار میں گائے بیچ کر اس کی قیمت تھیلے میں رکھتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور طے کر لیا تھا کہ کسی نہ کسی طرح وہ یہ تھیلا ہتھیا کر رہے گا، چنانچہ اس نے یہ مال اچکنے کی منصوبہ بندی کی اور ابوحسن کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ جب اس نے ابوحسن کو گھر میں داخل ہوتے دیکھا تو کچھ دیر بعد وہ دروازے پر آیا، دستک دی اور حیلہ سازی کی۔ اسے گھر والوں کی جانب سے رات گزارنے کی اجازت مل گئی، پھر اُس نے ابوحسن اور اس کی بیوی کے سو جانے پر ان کی توجہ بچے کی طرف مبذول کرانے کے لیے بچے کو بستر

سے اٹھا کر باہر صحن میں ڈال دیا اور اسے روتا ہُوا چھوڑ دیا تا کہ میاں بیوی بے قرار ہو کر بچے کو لینے کے لیے کمرے سے نکل جائیں اور اسی دوران وہ تھیلے پر ہاتھ صاف کر لے۔

اس چور نے ابوحسن کو تھیلا تکیے کے نیچے رکھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ اس غریب کی رقم اُچکنے کی فکر میں تھا جبکہ اللہ تعالیٰ اس کی گھات میں تھا اور اس احسان فراموش اُٹھائی گیرے کی تدبیر کے پیچھے پیچھے اللہ تعالیٰ کی تدبیر بھی چل رہی تھی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس مجرم کو جلد ہی اس کے عبرتناک انجام تک پہنچا دیا اور وہ ملبے کے ڈھیر میں دب کر ہمیشہ کی نیند سو گیا جبکہ بچے کے ساتھ ساتھ اس کے غریب والدین کو اللہ نے اس برے انجام سے بچا لیا۔

انسان یقیناً غافل ہوسکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ ہرگز غافل نہیں ہوسکتا جو ہمیں ہر دم دیکھ رہا ہے۔

لوگوں پر جب اصل بھید کھلا اور وہ اس احسان فراموش مجرم کے کرتوت سے آگاہ ہوئے تو کہنے لگے: گناہ اپنا تاوان لیے بغیر نہیں رہتا۔ جب یہ چور چوری کر کے بھاگنے والا تھا تو اُس سمیع وبصیر پروردگار کی نگران نگاہ اِسے دیکھ رہی تھی جسے نیند آتی ہے نہ اُونگھ! اُس نے ذرا بھی دیر نہیں لگائی اور اِس بدمعاش کو فوراً کیفرِ کردار تک پہنچا دیا۔ [1]

ع......دشمن اگر قوی است نگہبان قوی تر است!

---

[1] قصص هادفة من واقع الحياة لمحمود درويش (معمولی تصرف کے ساتھ)

مٹ گئے مٹ جائیں گے اعداء تیرے

ریاض کی شمالی جانب سے عیینہ نامی شہر کی طرف آپ سفر کریں تو راستے میں جبیلہ نامی بستی سے پہلے بہت بڑا کھلا میدان آتا ہے جسے عقرباء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ جگہ خاصی گہری ہے۔ بارش ہوتی ہے تو اردگرد سے پانی اکٹھا ہو کر اس جگہ جمع ہو جاتا ہے اور یہ میدان جھیل کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ یہاں کھیتی خوب اگتی ہے۔ سرسبز ہرے بھرے کھیتوں کا منظر بڑا خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ یہاں سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر عیینہ آتا ہے۔ یہ جگہ جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں ایک زمانے میں یہاں بنی حنیفہ کا بہت بڑا باغ تھا۔ اس باغ میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور مسیلمہ کذاب کے مابین زبردست جنگ ہوئی جس میں مسیلمہ کذاب کو شکست فاش ہوئی۔ اس کے بڑے بڑے سرداروں سمیت دس ہزار مرتد قتل ہوئے۔ مسیلمہ کی جھوٹی نبوت کا بھانڈا پھوٹ گیا اور اس کی طاقت ہمیشہ کے لیے پاش پاش ہو گئی۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو فتح حاصل تو ہوئی مگر یہ بڑی بھاری قربانیاں دے کر حاصل ہوئی۔ مسلمانوں کے چھ سو مجاہد شہادت پا گئے جن میں سابقین اولین کے علاوہ اکثریت حفاظ کرام کی تھی۔ ان شہادت پانے والوں میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بھائی زید بن خطاب اور مشہور انصاری صحابی ابودجانہ رضی اللہ عنہما بھی شامل تھے۔ یہ جنگ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی زندگی کی اہم ترین جنگوں میں سے ایک تھی۔ اس میں مسلمانوں نے جرأت وشجاعت کے ایسے جوہر دکھائے کہ اس علاقے میں مرتدین کا مکمل صفایا ہو گیا۔

مسیلمہ کذاب کا قصہ بڑا دلچسپ ہے۔ اس کا نام مسیلمہ بن ثمامہ بن کثیر بن حبیب تھا۔ یہ خاندان بنوحنیفہ سے تعلق رکھتا تھا جو ریاض کے قرب و جوار میں آباد تھا۔ یہ شخص نہایت مکار اور شعبدے باز تھا۔ شاعر تھا۔ نبوت کے آخری دور میں یہ بنو حنیفہ کے بارہ اشخاص پر مشتمل ایک وفد کے ساتھ مدینہ طیبہ آیا۔ وفد کے لیڈر کا نام سلمی بن حنظلہ تھا۔ یہ لوگ انصار کی ایک عورت مسلمہ بنت حارث کے گھر اترے۔ اس نے ان کی ضیافت کی۔ صبح و شام ان کی ضیافت روٹی گوشت، دودھ اور کھجوروں سے ہوتی تھی۔ جب یہ لوگ مسجد نبوی میں آئے تو مسیلمہ کو اپنی رہائش گاہ ہی پر چھوڑ آئے اور خود مسلمان ہو گئے جب انھوں نے واپسی کا ارادہ کیا تو اللہ کے رسول ﷺ نے انھیں چاندی کے پانچ پانچ اوقیے بطور عطیہ مرحمت فرمائے۔ مسیلمہ کو بھی ان کے برابر عطیہ دیا کیونکہ انھوں نے آپ ﷺ سے کہا تھا کہ وہ ان کی قیام گاہ پر موجود ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ مقام و منزلت کے لحاظ سے تم سے برا نہیں۔

مسیلمہ کذاب نے کہا کہ اگر محمد ﷺ اپنے بعد مجھے حکومت دے دیں تو میں ان کی پیروی کروں گا۔ اللہ کے رسول ﷺ کے ہاتھ میں کھجور کی ٹہنی کا ایک ٹکڑا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر وہ مجھ سے کھجور کی ٹہنی کا (ایک) ٹکڑا بھی مانگے تو وہ بھی نہیں دوں گا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے خواب دیکھا جس کے راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں: اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: میں سویا ہوا تھا، میں نے اپنے ہاتھوں میں سونے کے دو کنگن دیکھے، اس معاملے نے مجھے پریشان کر دیا، پس مجھے کہا گیا کہ انھیں پھونک مارو، میں نے انھیں پھونک ماری تو وہ (دونوں کنگن) اڑ گئے۔ میں نے اس کی تاویل یہ کی کہ میرے بعد دو کذاب ظاہر ہوں گے: ایک اسود عنسی اور دوسرا مسیلمہ، مگر دونوں ناکام و نامراد ہوں گے۔

بنو حنیفہ کا یہ وفد واپس یمامہ پہنچا تو یہ اللہ کا دشمن مرتد ہو گیا اور اس نے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ کہنے لگا کہ میں محمد ﷺ کے ساتھ شریکِ امر ہوں۔ مدینہ آنے والے وفد میں ایک شخص رجال بن عنفوہ بھی تھا۔ یہ مسلمان ہو گیا، کچھ عرصہ رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں رہ کر کچھ قرآن بھی سیکھا مگر یہ بد بخت بھی مرتد ہو گیا اور اس نے مسیلمہ کے لیے جھوٹی گواہی دی کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے شریکِ امر کر لیا ہے۔ اسے جو قرآن یاد تھا، اس نے اُس میں سے کچھ حصہ مسیلمہ کو پہنچا دیا، اس نے اسے اپنی طرف منسوب کر لیا جس سے بنو حنیفہ میں بڑا فتنہ پیدا ہوا۔

مسیلمہ نے اللہ کے رسول ﷺ کو خط لکھا: مسیلمہ رسول اللہ کی طرف سے محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف: اما بعد! مجھے آپ کے ساتھ شریک امر کیا گیا ہے، لہٰذا نصف حکومت ہماری اور نصف قریش کی، لیکن قریش ایسی قوم ہے جو زیادتی کرتی ہے۔

یہ خط مسیلمہ کے دو ایلچی لے کر آئے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ان سے پوچھا: ”کیا تم دونوں بھی وہی بات کہتے ہو جو وہ کہتا ہے۔ انھوں نے جواب دیا: ہاں۔ ارشاد ہوا: اللہ کی قسم! اگر ایلچیوں کو قتل نہ کرنے کا اصول نہ ہوتا تو میں تم دونوں کو قتل کرا دیتا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ بیان کرتے ہیں کہ اس وقت بھی اصول رائج تھا کہ ایلچیوں کو قتل نہ کیا جائے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے اس خط کا جواب اس طرح دیا: محمد رسول اللہ (ﷺ) کی طرف سے مسیلمہ کذاب کی طرف...... اس شخص پر سلامتی ہو جو ہدایت کی پیروی کرے۔ اما بعد!...... زمین کا اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ اللہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے، اس کا مالک بنا دیتا ہے۔ اور بہترین انجام کار متقین کے لیے ہے۔

مسیلمہ کذاب نے اپنے مریدوں کو متاثر کرنے کے لیے یہ دعویٰ بھی کیا کہ اس پر وحی

نازل ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ میں بنو حنیفہ کی ایک مسجد کے پاس سے گزرا تو وہ ایسی قراءت پڑھ رہے تھے جو اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ پر نہیں اتاری۔ قرآن پاک کے بے شمار اعجازات میں ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ اس کا چیلنج ہے کہ ساری دنیا کے جن وانس مل کر بھی قرآن جیسی ایک سورت نہیں بنا سکتے۔ قرآن کے مقابلے میں جو ہفوات مسیلمہ نے بیان کیں۔ ذرا ان کی ایک جھلک دیکھیے: غالبًا یہ سورۂ عادیات کے مقابلے میں بنائی گئی تھی:

"اور قسم ہے اچھی طرح پیسنے والیوں کی اور آٹا گوندھنے والیوں کی اور روٹی پکانے والیوں کی اور ثرید بنانے والیوں کی اور لقمے لینے والیوں کی۔" ...... ذرا ان الفاظ پر غور کریں۔ کیا ان کا کوئی معنی اور مفہوم ہے؟ یہی وجہ ہے کہ اس کے ہفوات کو ذرا بھی سمجھ رکھنے والے افراد نے قبول نہیں کیا۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اپنے دور کے نہایت ذہین اور فطین آدمی تھے۔ اسلام لانے سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں مسیلمہ کے پاس گئے۔ اُس نے ان سے پوچھا کہ اس وقت تمھارے ساتھی پر کیا کلام اترا ہے؟ عمرو بن العاص نے جواب دیا: کہ ایک مختصر مگر نہایت بلیغ سورت ان پر نازل ہوئی ہے۔ اس نے کہا: ذرا سناؤ، وہ کیا ہے تو انھوں نے سورۂ عصر سنا دی۔ مسیلمہ نے کچھ دیر سوچا، پھر اپنا سر اٹھایا اور کہنے لگا، مجھ پر بھی اس جیسی ایک سورت نازل ہوئی ہے۔ عمرو نے پوچھا وہ کیا ہے؟ تو مسیلمہ نے کہا:

يَا وَبْرُ يَا وَبْرُ إِنَّمَا أَنْتَ أُذُنَانِ وَ صَدْرٌ وَسَائِرُكَ حَفْرٌ نَقْرٌ

"اے وبر![1] اے وبر! تیرے صرف دو کان اور سینہ ہے اور باقی تو مٹی اور لاغری ہے۔"

---

[1] وبر: نیولے اور خرگوش سے ملتا جلتا ایک جانور ہے جو لبنان میں زیادہ ہوتا ہے۔

اب مسیلمہ نے دادطلب نگاہوں سے عمرو بن العاص ؓ کی طرف دیکھا اور پُوچھا: ہاں عمرو تمھارا کیا خیال ہے؟ عمرو نے کہا:

وَاللهِ إِنَّكَ لَتَعْلَمُ أَنِّي أَعْلَمُ أَنَّكَ تَكْذِبُ

”اللہ کی قسم! تمہیں معلوم ہے کہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔“

حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے پاس ایک وفد بنی حنیفہ کا آیا۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے اصرار پر انھوں نے مسیلمہ کا یہ کلام سنایا: ”اے مینڈکی! جو دو مینڈکوں کی بیٹی ہے۔ تمھارے لیے پانی صاف ہے۔ اور تو پانی کو گدلا نہیں کرتی۔ اور نہ پینے والے کو منع کرتی ہے۔ تیرا سر پانی میں اور دم کیچڑ میں ہوتی ہے۔“ اس قسم کی بے معنی اور فضول گفتگو کو کون سی عقل ہے جو قبول کرے مگر شیاطین ان چیزوں کو اتنا مزین کر کے پیش کرتے ہیں کہ بعض سمجھدار لوگ بھی راہِ راست سے بھٹک جاتے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہر نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ جو ہمیں یہ دائمی دعا سکھاتی ہے:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾

”اے اللہ! ہمیں سیدھی راہ دکھا۔“

مسیلمہ نے اللہ کے رسول ﷺ کی نقالی کرنے کی پوری کوشش کی۔ اُسے کسی نے بتایا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے کسی کنویں میں اپنا لعاب مبارک ڈالا تو اس کا پانی بڑھ گیا۔ اس نے بھی ایک کنویں میں تھوکا تو اس کا پانی بالکل خشک ہوگیا۔ ایک اور کنویں میں تھوکا تو اس کا پانی کڑوا ہوگیا۔ اس نے وضو کیا اور وضو کے بچے ہوئے پانی سے کھجور کے ایک درخت کو سیراب کیا تو وہ خشک ہوگیا۔ اس کے پاس بچے لائے گئے کہ ان کے سر پر ہاتھ پھیرو، اس نے ہاتھ پھیرا تو وہ گنجے ہوگئے اور بعض کی زبان ہکلانے لگی۔ ایک ایسا شخص لایا گیا جس

کی آنکھوں میں تکلیف تھی۔ اس نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا تو وہ اندھا ہو گیا۔

بعض اوقات علاقائی تعصب انسان کو اندھا کر دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ حق سے محروم ہو جاتا ہے، مثلاً: سیف بن عمرو یمامہ آیا، اس نے پوچھا کہ مسیلمہ کہاں ہے؟ لوگوں نے کہا کہ خاموش ہو جاؤ اور رسول اللہ کہو۔ اس نے کہا جب تک میں اسے دیکھ نہ لوں، رسول اللہ نہیں کہوں گا۔ جب اس نے مسیلمہ کو دیکھا تو کہا: کیا تم مسیلمہ ہو؟ اس نے کہا: ہاں۔ اِس نے پوچھا کہ تمھارے پاس کون آتا ہے؟ وہ بولا: میرے پاس رحمٰن آتا ہے۔ اس نے پوچھا: وہ نور میں آتا ہے یا ظلمت میں؟ اس نے جواب دیا: ظلمت میں۔ اس نے فوراً کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ تو کذاب ہے اور محمد ﷺ صادق ہیں۔ لیکن ربیعہ کا کذاب ہمارے لیے مضر کے صادق سے زیادہ پسندیدہ ہے اور یہ اجڈ بدو مسیلمہ کا پیروکار بن گیا اور اُسی کے ساتھ عقرباء کے روز قتل ہو گیا۔

مسیلمہ کذاب عورتوں کا رسیا تھا۔ اس کے دور میں سجاح نامی ایک عورت نے نبیہ ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ یہ عرب کے عیسائیوں میں سے تھی، اس کی قوم اس کی مطیع ہو گئی۔ ان لوگوں نے یمامہ کا رخ کیا تا کہ مسیلمہ کذاب سے نبوت چھین لیں۔ مسیلمہ نے اسے امان کا پیغام بھیجا اور پیش کش کی کہ اگر تو واپس چلی جائے تو قریش کی نصف زمین تمھیں دینے کی ضمانت دیتا ہوں۔ آپس میں خط کتابت ہوئی۔ مسیلمہ نے سجاح کو لکھا کہ میں اپنی قوم کی ایک جماعت کے ساتھ تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ ان کی ملاقات ایک خیمے میں ہوئی جو تین دن جاری رہی۔ خلوت کی اس ملاقات کا نتیجہ دونوں کی شادی کی صورت میں برآمد ہوا۔ تین دن کے بعد سجاح اپنی قوم کے پاس گئی۔ قوم نے سوال کیا: کیا تمھیں حق مہر دے دیا گیا ہے؟ اس نے کہا: مجھے تو کوئی مہر نہیں ملا۔ قوم نے کہا: یہ نہایت بری بات ہے کہ تمھارے جیسی عورت بغیر

مہر کے کسی سے نکاح کرے۔ وہ کہنے لگی: میں ابھی ایک شخص کو بھیجتی ہوں جو مسیلمہ سے میرے مہر کے بارے میں پوچھے گا۔ اس نے ثبت بن ربعی کو بھیجا۔ اس نے جواب دیا: اپنی قوم میں اعلان کر دو کہ مسیلمہ بن حبیب نے تم لوگوں سے فجر اور عشاء کی وہ دونوں نمازیں ساقط کر دی ہیں جو محمد ﷺ لائے تھے۔ بس یہی سجاح کا مہر ہے۔

......ادھر اس فتنے کا مقابلہ کرنے کے لیے حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے عکرمہ بن ابوجہل ؓ کو بھیجا۔ دشمن کی کثیر تعداد کے پیش نظر انھیں ہدایت کی گئی کہ لڑائی میں جلدی نہ کریں بلکہ خالد بن ولید اور شرحبیل بن حسنہ کا انتظار کریں مگر جذبۂ جہاد سے لبریز عکرمہ بن ابوجہل نے حملہ کرنے میں جلد بازی سے کام لیا۔ مسیلمہ نے بنوحنیفہ کو اکٹھا کیا اور ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا: آج غیرت کا دن ہے۔ اپنے شرف کی حفاظت کرو۔ اپنی عورتوں کو بچاؤ۔ غرض جنگ ہوئی، بنوحنیفہ کا پلہ بھاری رہا۔ حضرت ابوبکر صدیق کو ہزیمت کی خبر ملی تو سخت ناراض ہوئے۔ تھوڑے دنوں کے بعد حضرت خالد بھی اپنی فوج لے کر پہنچے۔ لڑائی کے لیے دونوں فوجیں آمنے سامنے آ گئیں۔ اب پھر مسیلمہ نے اپنی فوج سے خطاب کیا۔ غیرت دلائی اور عزت و شرف کا واسطہ دیا۔ لڑائی شروع ہوئی۔ اس روز مہاجرین کا جھنڈا سالم مولی ابوحذیفہ اور انصار کا جھنڈا ثابت بن قیس رضی اللہ عنہم کے پاس تھا۔ لڑائی کے پہلے ہلے میں مسلمانوں کو شکست ہوئی حتی کہ بنوحنیفہ حضرت خالد بن ولید کے خیمے میں داخل ہو گئے۔ وہاں ان کی اہلیہ ام تمیم موجود تھیں، انھیں قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ مُجّاعہ بن مُرارۃ نے انھیں روکا۔ اب انھوں نے انھیں قیدی بنانے کا ارادہ کیا، اتنے میں خالد بن ولید وہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے آتے ہی بنوحنیفہ کو للکارا کون ہے جو میرا مقابلہ کرے؟ اس مبارزت کے جواب میں جو بھی آیا، وہ حضرت خالد کی تلوار کا لقمہ بن گیا۔ اب انھوں نے مسیلمہ کو للکارا،

وہ بھاگ کر ایک باغ میں پہنچ گیا۔ اس روز بنو حنیفہ نے ایسی جنگ لڑی جس کی مثال نہیں دیکھی گئی۔ مسلمانوں کے علم بردار ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ نے زمین میں نصف پنڈلیوں تک گڑھا کھودا، انھوں نے کفن پہنا، خوشبو لگائی اور اس گڑھے میں اپنے آپ کو گاڑ لیا۔ اور نہایت ثابت قدمی سے لڑائی کی حتی کہ شہید ہو گئے۔

امام ابن کثیر نے البدایہ والنھایہ میں بڑی تفصیل سے اس جنگ کا ذکر کیا ہے۔ اس میدان کارزار میں صحابہ نے جس استقلال کا مظاہرہ کیا، وہ بے مثال تھا۔ وہ دشمنوں کی طرف مسلسل پیش قدمی کرتے رہے حتی کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں فتح عطا فرمائی اور کفار پیٹھ پھیر کر بھاگے۔ وہ ان کا تعاقب کرتے ہوئے انھیں موت کے باغ تک لے گئے۔ بنو حنیفہ کو اس باغ میں پناہ لینے کا مشورہ مُحَکَّم بن طفیل نے دیا تھا۔ وہاں مسیلمہ بھی موجود تھا۔ محکم بن طفیل اپنی قوم کو جنگ پر ابھار رہا تھا۔ وہ تقریر کر رہا تھا کہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابو بکر نے اس کی گردن میں تیر مارا تو وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ بنو حنیفہ نے اس قلعہ نما باغ کا دروازہ بند کر دیا۔ صحابہ نے اس کا محاصرہ کر لیا۔ باغ میں داخل ہونے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ دروازے بند تھے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے بھائی براء بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھے چمڑے میں لپیٹ کر نیزوں سے اوپر اٹھاؤ اور دیوار کے اوپر لے جا کر اندر پھینک دو، چنانچہ مسلمانوں نے اسی طرح انھیں باغ کے اندر پہنچا دیا۔ انھوں نے درازے پر مامور فوجیوں سے لڑائی کر کے قلعے کا دروازہ کھول دیا۔ مسلمان قلعہ کے اندر داخل ہو گئے۔ امام ابن کثیر کے قول کے مطابق مسیلمہ کی فوج ایک لاکھ تھی۔ مسلمانوں کی تعداد صرف دس ہزار تھی۔ ان میں حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کا قاتل وحشی بھی شامل تھا۔ اس نے سوچا، آج موقع ہے کہ میں اپنے گناہ کا کفارہ ادا کروں۔ اس نے مسیلمہ کا نشانہ لیا اور اپنے نیزے سے حملہ کر دیا۔

مسیلمہ شدید زخمی ہو گیا اور زور سے دھاڑا، حضرت ابو دجانہ ؓ اس کے سر پر پہنچ گئے۔ انھوں نے پوری قوت سے اس کے سر پر تلوار ماری اور اُس کے دو ٹکڑے کر دیے۔ اس وقت اس کی عمر ایک سو بیس سال تھی۔ جنگ میں مسیلمہ کا وزیر اور کمانڈر رجال بن عنفوہ بھی واصلِ جہنم ہو گیا۔

بنو حنیفہ کے ایک سردار مُجّاعہ بن مُرارہ کی حکمت عملی سے بہت سے لوگ قتل ہونے سے بچ گئے۔ انھوں نے حضرت خالد بن ولید سے صلح کی درخواست کی جو قبول کر لی گئی۔ انھیں دعوت اسلام دی گئی تو وہ سب کے سب مسلمان ہو گئے اور حق کی طرف رجوع کر لیا۔ حضرت خالد بن ولید ؓ نے جن عورتوں کو قید کر لیا تھا، ان میں بعض کو ان کے اہل خانہ کی طرف واپس بھیج دیا اور بقیہ کو حضرت ابو بکر صدیق ؓ کی خدمت میں روانہ کر دیا، حضرت علی بن ابو طالب ؓ نے ان میں سے ایک لڑکی کو لونڈی بنایا، وہی آپ کے بیٹے محمد کی ماں ہے۔ جسے تاریخ محمد ابن الحنفیہ کے نام سے یاد کرتی ہے۔[1]

---

[1] تفاصیل کے لیے دیکھیے: البدایة والنهایة 322/6 و شذرات الذهب 23/1۔ و تاریخ الطبري 268/2۔ 285.

خونِ ناحق کی ہیبت

سعید[1] بن جبیر رحمہ اللہ حجاج بن یوسف کے زمانے میں ایک جلیل القدر عالم اور مِلت اسلامیہ کے امام تھے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ جب ان کا تذکرہ کرتے تھے تو بے ساختہ رو ☐ ☐ ۔ فرماتے تھے:

> وَاللّٰهِ! لَقَدْ قُتِلَ سَعِيدُ بْنُ جُبَيْرٍ ، وَمَا أَحَدٌ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ إِلَّا وَهُوَ بِحَاجَةٍ إِلٰى عِلْمِهٖ
>
> ”اللہ کی قسم! سعید بن جبیر اس حال میں قتل کیے گئے کہ روئے زمین کا ہر مسلمان ان کے علم کا محتاج تھا۔“

اس جلیل القدر عالم، اللہ کے ولی، صوام وقوام، محدث عصر، فقیہ امت اور شیخ الاسلام کو

---

[1] سعید بن جبیر رحمہ اللہ 45 ہجری میں کوفہ میں پیدا ہوئے۔ اُن کی کنیت ابو عبداللہ تھی۔ ائمۂ کبار میں سے تھے۔ ☐ حدیث پر ماہرانہ دسترس تھی۔ فقہ کے بھی بہت بڑے عالم تھے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے ملاقات کی ٹوہ میں رہتے تھے۔ اُن سے احادیث معلوم کرتے اور مسائل سیکھتے تھے۔ قرآن کریم کے نہایت خوش آہنگ قاری تھے۔ تفسیر قرآن کا اسلوب حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے سیکھا۔ حجاج بن یوسف اُن کے علم وفضل کا بے حد مداح تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے انھیں کوفہ کا قاضی مقرر کیا۔ وہ آپ کا دشمن اس وجہ سے بنا کہ آپ بنوامیہ کے حریف ابن اشعث کے ہمنوا تھے۔ اور بنوامیہ کے مقابلے میں ابن اشعث کو حق پر سمجھتے تھے۔ ابن اشعث حجاج کے خلاف معرکہ آرائی میں مارا گیا تو حجاج سعید بن جبیر رحمہ اللہ کے پیچھے پڑ گیا، آپ حجاج کی حمایت سے معذوری ظاہر فرماتے رہے، حجاج نے انھیں موت کے گھاٹ اُتارنے کی دھمکی دی مگر وہ اپنے مؤقف کے جواز پر قائم رہے۔ بالآخر 95 ہجری میں شہید کر دیے گئے۔

قتل کرنے والا حجاج بن یوسف ہے جس نے اس حق پرست عالم کا ناحق خون کر ڈالا!

تفسیر و حدیث یا فقہ کی کوئی بھی کتاب اٹھائیے، جب آپ کتاب کھولیں گے اور اس کی ورق گردانی شروع کریں گے تو آپ کو جا بجا سعید بن جبیر کا تذکرہ ملے گا۔ ایسی قیمتی شخصیت کو وقت کے سفاک حاکم نے قتل کر ڈالا۔ سعید بن جبیر کا جرم کیا تھا؟ کون سی ایسی غلطی تھی جوان کے خون ناحق کا باعث بن گئی؟ ان سے ایسا کون سا گناہ سرزد ہوا تھا جو وہ زیرِ شمشیر رکھ لیے گئے؟

سعید بن جبیر کا جرم صرف اور صرف یہ تھا کہ وہ حق پرست اور بے باک عالمِ دین تھے۔ انھوں نے حجاج بن یوسف سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور بہ بانگ دہل کہہ دیا تھا:

أَخْطَأْتَ ، ظَلَمْتَ ، أَسَأْتَ وَ تَجَاوَزْتَ

”تم نے خطا کی ہے، ظلم کیا ہے، برائی کی ہے اور حد سے آگے بڑھ گئے ہو۔“

حجاج بن یوسف نے اپنے بارے میں یہ کڑوا سچ سنا تو اُس نے سعید بن جبیر کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ میرے خلاف کوئی لب کشائی نہ کر سکے، چنانچہ حجاج نے اپنے فوجیوں کو سعید بن جبیر کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔

فوجی سعید بن جبیر کے گھر گئے اور دروازے پر دستک دی۔

سعید بن جبیر نے یہ ڈراؤنی دستک سن کر دروازہ کھولا تو ان کے سامنے فوجیوں کا جتھا کھڑا تھا۔ انھیں دیکھ کر سعید بن جبیر نے فوراً کہا:

﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾

”ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ بہت اچھا کارساز ہے۔“[1]

پھر آپ نے پوچھا: تم کیا چاہتے ہو؟

فوجیوں نے کہا: حجاج نے آپ کو فوراً طلب کیا ہے۔

سعید بن جبیر نے فرمایا: تھوڑی دیر میرا انتظار کرو۔

پھر اندر جا کر غسل فرمایا اور بدن پر حُنوط مَلا (حنوط چند خوشبودار چیزوں کا ایک مرکب ہوتا ہے جو مردے کو غسل دینے کے بعد اس پر ملتے ہیں) اور کفن پہن کر فرمایا:

اللّٰهُمَّ يَا ذَا الرُّكْنِ الَّذِي لاَ يُضَامُ، وَالْعِزَّةِ الَّتِي لَا تُرَامُ ، اكْفِنِي شَرَّهُ

”اے پروردگار! اے قوت و صلابت والے جس پر ظلم و زیادتی نہیں ہو سکتی! اے عزت و شان والے جس کے حصول کا تصور نہیں کیا جا سکتا! میرے لیے حجاج کے شر سے کافی ہو جا۔“

فوجی سعید بن جبیر کو لے کر حجاج کے پاس چل پڑے اور سعید بن جبیر کی لسانِ حق ترجمان راستے بھر یہی ورد کرتی رہی:

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ خَسِرَ الْمُبْطِلُونَ

”اللہ کی توفیق کے بغیر نیکی کرنے کی طاقت ہے نہ برائی سے بچنے کی ہمت، باطل پرست خسارے میں پڑ گئے۔“

سعید بن جبیر جب حجاج کے دربار میں پیش ہوئے تو وہ غصے میں بھرا بیٹھا تھا اور اس کی آنکھیں غیظ و غضب کے شرارے برسا رہی تھیں۔

---

[1] آل عمرٰن 123:3 .

سعید بن جبیر:

السَّلامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی

''جو سیدھی راہ اختیار کرے اس پر سلامتی ہو۔''

حجاج: تمھارا نام کیا ہے؟

سعید: سعید بن جبیر۔

حجاج: تم سعید بن جبیر نہیں تم تو شقی بن کُسَیر ہو۔

سعید: یہ نام میری ماں نے رکھا تھا۔ یقیناً وہ زیادہ جانتی تھی۔

حجاج: تم اور تمھاری ماں دونوں بد بخت ہو۔

سعید: غیب کا علم صرف اللہ رب العزت کو ہے۔

حجاج: محمد ﷺ کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟

سعید: وہ ہدایت کے نبی اور رحمت کے امام ہیں۔

حجاج: حضرت علی ؓ کے بارے میں کیا کہتے ہو؟

سعید: اللہ کو پیارے ہو گئے، رحمت کے امام تھے۔

حجاج: میرے بارے میں کیا رائے ہے؟

سعید: تم ظالم ہو، اللہ کے پاس اپنی گردن پر مسلمانوں کے ناحق خون لے کر جاؤ گے۔

حجاج: میں تمھیں سونے چاندی سے نوازنا چاہتا ہوں۔...... یہ کہہ کر حجاج نے خدام کو حکم دیا کہ سونے چاندی کے دو تھیلے سعید بن جبیر کے سامنے ڈال دو۔ جو فوراً ڈال دیے گئے۔

سعید: یہ کیا ہے اے حجاج ؟ اگر تو نے یہ مال ومتاع اللہ تعالیٰ کے غیظ وغضب سے بچنے کے لیے اکٹھا کر رکھا ہے تو یہ قابل تعریف ہے۔ اس کے برعکس اگر تو نے اپنے ظلم وتکبر سے فقراء ومساکین کی دولت ہڑپ کر رکھی ہے تو قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تجھے اس دن سے ڈرنا چاہیے جس دن ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جائے گی:

﴿يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ﴾

”جس دن تم وہ (قیامت کا زلزلہ) دیکھ لو گے، اس دن دودھ پلانے والی مائیں اپنا دودھ پیتا بچہ بھول جائیں گی اور حاملہ خواتین کے حمل (قبل از وقت) گر جائیں گے اور تو لوگوں کو اس حال میں دیکھے گا کہ وہ مدہوش دکھائی دیں گے، حالانکہ درحقیقت وہ متوالے نہیں ہوں گے لیکن اللہ کا عذاب بڑا ہی سخت ہے۔“[1]

حجاج: تم بھی ہماری طرح کیوں نہیں ہنستے ؟

سعید: جب بھی اس دن کا تصور میرے ذہن میں آتا ہے جس دن قبروں میں جو کچھ ہے نکال دیا جائے گا اور سینوں کی پوشیدہ باتیں ظاہر کر دی جائیں گی تو میری ہنسی غائب ہو جاتی ہے۔

حجاج: پھر ہمیں کیوں ہنسی آتی ہے؟

سعید: لوگوں کے دل یکساں نہیں ہوتے۔

---

[1] الحج 22:2.

حجاج: ہم تمھاری دنیا کو ایسی آگ میں تبدیل کر دیں گے جو بڑی شعلہ بار ہو گی۔

سعید: اگر تو اس پر قادر ہوتا تو میں اللہ کو چھوڑ کر تیری عبادت کرتا۔

حجاج: میں تمھیں اس طرح قتل کروں گا جس کی مثال نہیں ملے گی۔

سعید: اللہ کی قسم! تم جس طرح مجھے قتل کرو گے، اُسی طرح اللہ تعالیٰ تمھیں قیامت کے دن قتل کرے گا۔

حجاج: اسے قتل کر دو۔

سعید بن جبیر نے یہ دعا پڑھی:

﴿وَجَّهۡتُ وَجۡهِيَ لِلَّذِيۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ حَنِيۡفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ﴾

”میں نے (تو ہر طرف سے منہ موڑ کر) اپنا رخ صرف اُسی ہستی کی طرف کر لیا ہے جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز اُن میں سے نہیں جو اس کے ساتھ شریک ٹھہرانے والے ہیں۔“[1]

حجاج: اس کا چہرہ قبلے سے پھیر دو۔

سعید بن جبیر نے یہ آیت پڑھی:

﴿فَاَيۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡهُ اللّٰهِ﴾

”جس طرف بھی تم رخ کرو گے، اسی طرف اللہ تمھارے سامنے ہے۔“[2]

حجاج: اسے زمین پر ڈال دو۔

سعید بن جبیر نے مسکراتے ہوئے یہ آیت پڑھی:

---

[1] الأنعام 79:6. [2] البقرة 115:2.

﴿مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرٰى﴾

”اسی زمین سے ہم نے تمھیں پیدا کیا، اسی میں پھر لوٹائیں گے اور اسی سے تم سب کو دوبارہ نکال لیں گے۔“[1]

حجاج: ارے! تم تو اب ہنس بھی رہے ہو؟

سعید: جو لوگ اللہ رب العزت کو اپنا دل دے دیتے ہیں، وہ تیغ وتفنگ سے کب ڈرتے ہیں۔ سعید بن جبیر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بدستور مسکراتے رہے جیسے کہہ رہے ہوں۔ ؎

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پُوچھ
عید نظارہ ہے شمشیر کا عُریاں ہونا!

پھر انھوں نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: میں اس لیے ہنس رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تجھ پر کس قدر حلیم و بردبار ہے لیکن تو اللہ تعالیٰ پر کس قدر جرأت مند ہے۔

حجاج: اسے ذبح کر دو۔

سعید: اَللّٰهُمَّ! لَا تُسَلِّطْ هٰذَا الْمُجْرِمَ عَلٰى أَحَدٍ بَعْدِي

”اے اللہ! میرے بعد اس مجرم کو کسی اور پر مسلط نہ کرنا۔“

اِدھر یہ جُملہ ادا ہوا اُدھر سعید بن جبیر کو اس شقی القلب نے قتل کرا دیا اور اللہ تعالیٰ نے سعید بن جبیر کی دعا کو معًا شرفِ قبولیت سے نوازا۔ ؎

دیدی کہ خونِ ناحقِ پروانہ شمع را
چنداں اماں نہ داد کہ شب راسحر کُند!

---

[1] طٰهٰ 55:20.

یعنی مکافاتِ عمل میں دیر نہیں لگی، جلد ہی حجاج بن یوسف کے بدن میں ایک زہریلی پھنسی نکلی۔ اس کی اذیت اتنی شدید تھی کہ وہ درد کے مارے پُورے ایک مہینے تک پاگل بیل کی طرح ڈکراتا رہا اور اس دوران وہ زندگی کے وظائف ہی بھول گیا۔ اسے کھانا پینا، سونا جاگنا اور اٹھنا بیٹھنا دُوبھر ہوگیا۔ دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہوگئی۔ وہ تڑپ تڑپ کر بار بار کہتا تھا:

وَاللّٰهِ! مَا نِمْتُ لَيْلَةً إِلَّا وَرَأَيْتُ كَأَنِّي أَسْبَحُ فِي أَنْهَارٍ مِّنَ الدَّمِ

’’اللہ کی قسم! جس رات بھی میری آنکھ لگی، میں نے خواب میں دیکھا کہ میں خون کی نہروں میں تیر رہا ہوں۔‘‘

پھر حجاج رہ رہ کر یہی جملہ دہراتا رہا:

مَالِي وَ لِسَعِيدٍ ، مَالِي وَ لِسَعِيدٍ

’’نہ جانے میرا اور سعید کا کیا حشر ہونے والا ہے، نہ جانے میرا اور سعید کا کیا حشر ہونے والا ہے۔‘‘

یہی جُملہ کہتے کہتے وہ لُقمۂ اجل بن گیا۔ [1]

---

[1] یہ واقعہ تاریخ کی متعدد کتابوں میں موجود ہے۔

دیکھیے البدء والتاریخ 38/6 والمنتظم في تاریخ الملوك والأمم 7/7 وسير أعلام النبلاء 330/4۔

آدابِ فرزندی کا قابلِ رشک مظاہرہ

عبداللہ بن ابوبکر رضی اللہ عنہما نے زید بن عمرو بن نفیل کی صاحبزادی عاتکہ [1] سے شادی کی۔ وہ نہایت حسین و جمیل خاتون تھیں۔ عبداللہ بن ابوبکر رضی اللہ عنہما بھی خوش شکل تھے اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک میں منفرد تھے۔ جب انھوں نے اپنی بیوی عاتکہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ازدواجی زندگی کا آغاز کیا تو وہ حسن و جمال کی اس پیکر پر ایسے شیدا ہوئے کہ اہلیہ سے اُن کی والہانہ محبت نقطۂ عروج پر جا پہنچی۔ وہ ہر وقت اپنے حریمِ اُلفت ہی میں رہنے لگے اور ان کی اہلیہ محترمہ ان کے دل و دماغ پر حکمرانی کرنے لگیں۔ محبت بڑا عظیم اور قابلِ قدر جذبہ ہے مگر ربِ جمیل کی محبت کے علاوہ کسی اور کی محبت حدِ اعتدال سے بڑھ جائے تو یہ جذبہ مضر ثابت ہوتا ہے۔ یہی حالت حضرت عبداللہ بن ابوبکر کو بھی پیش آئی۔ وہ اہلیہ کی محبت و فدویت میں اس قدر بے خود ہوگئے کہ بعض معاملاتِ دینیہ میں بھی کوتاہی ہونے لگی اور جہادی مہم میں بھی سستی آگئی۔ یہ بات سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ پر شاق گزری۔

---

[1] عاتکہ بنت زید بن عمرو بن نفیل بن عبدالعزی مہاجر خواتین میں سے تھیں۔ یہ بہت ہی خوبصورت اور ذہین و فطین تھیں۔ ان کی شادی عبداللہ بن ابوبکر رضی اللہ عنہما سے ہوئی۔ وہ غزوۂ طائف میں شہید ہوگئے تو انھوں نے قسم کھا لی کہ اب شادی نہیں کریں گی مگر کفارہ ادا کرنے کے بعد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے شادی کر لی۔ عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے ان سے شادی کی۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے پہلے ان کے بھائی زید بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ان سے سے شادی کی تھی۔ جب زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ شہید ◄◄

چنانچہ ایک موقع پر حضرت ابوبکر ﵁ نے اپنے بیٹے عبداللہ ﵁ سے فرمایا:

يَا بُنَيَّ! إِنَّ هٰذِهِ الْمَرْأَةَ قَدْأَذْهَلَتْ رَأْيَكَ وَ غَلَبَتْ عَلٰى عَقْلِكَ فَطَلِّقْهَا“

”جانِ پدر! اس خاتون نے تمھیں حواس باختہ کر دیا ہے اور تمھارے عقل و شعور پر چھا گئی ہے، اس لیے (میری رائے یہ ہے کہ) اسے طلاق دے دو۔“

عبداللہ ﵁ نے عرض کیا:

لَسْتُ أَقْدِرُ عَلٰى ذٰلِكَ

”پدرِ عالی قدر! یہ میرے بس کا روگ نہیں ہے۔“

ابوبکر ﵁ نے فرمایا: میں نے تیری طلاق کی قسم کھالی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت عبداللہ ﵁ کا دل اہلیہ کی محبت سے سرشار تھا مگر یہی دل تھا جس نے حضرت اسمٰعیل ﵇ سے آدابِ فرزندی کا سبق بھی سیکھا تھا۔ حضرت اسمٰعیل نے والد گرامی کے حکم پر اپنی گردن بے دریغ زیرِ تیغ رکھ دی تھی اور جسم و جان کی آزمائش میں پورے اُترے تھے لیکن حضرت عبداللہ کو جس آزمائش کا سامنا کرنا پڑا، وہ جسم و جان کی نہیں، نہایت نازک جذبات کی آزمائش تھی۔ ایک طرف اہلیہ کی لازوال اُلفت اور دوسری طرف والد ماجد کا حکم! حضرت عبداللہ اِس آزمائش کے پل صراط سے آناً فاناً گزر گئے۔ انھوں نے اپنے

» ہو گئے تو کچھ دنوں کے بعد حضرت علی بن ابو طالب ﵁ نے عاتکہ ﵂ کو شادی کا پیغام بھیجا مگر انھوں نے یہ کہہ کر شادی سے معذرت کر لی: إنی أخشی علیك أن تُقتل. ”مجھے خوف ہے، مبادا آپ بھی قتل کر دیے جائیں (جیسا کہ میرے سارے ہی سابقہ شوہر قتل کر دیے گئے)۔“ چنانچہ زبیر بن عوام ﵁ کے بعد انھوں نے شادی نہیں کی۔ ان کی وفات امیر معاویہ بن ابوسفیان ﵄ کی خلافت کے ابتدائی زمانے میں ہوئی۔ أسد الغابة 7087، والإستیعاب:3471، والإصابة:11452، والبداية والنهاية: 152/11 .

جذبات کی شہ رگ پر چھری پھیری، والد گرامی کے حکم کی تعمیل کی اور اہلیہ کو بلا تأمل طلاق دے دی۔ انھوں نے طلاق تو دے دی مگر وہ اپنے ٹوٹے ہوئے دل کو اہلیہ کی محبت سے خالی نہ کر سکے۔ وہ بدستور ان کے حجرۂ دل میں مقیم رہیں۔ یہ صورتحال ان پر اتنی شدت سے اثر انداز ہوئی کہ وہ جزع فزع کرنے لگے۔ کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔ کھانا پینا بھی ترک کر دیا۔

یہ حالت دیکھ کر لوگوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے شکوہ کیا کہ آپ نے عبداللہ رضی اللہ عنہ کو برباد کر دیا۔ اس فیصلے پر نظر ثانی فرمائیں۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا گزر عبداللہ رضی اللہ عنہ کے پاس سے ہوا تو انھوں نے یہ دردناک اشعار سنے جو عبداللہ رضی اللہ عنہ ہر طرف سے بے خبر ہو کر اہلیہ کے فراق میں گنگنا رہے تھے۔

أَعَاتِكُ! لاَ أَنْسَاكِ مَا ذَرَّ شَارِقٌ
وَمَا نَاحَ قُمْرِيُّ الْحَمَامِ الْمُطَوَّقُ

”اے عاتکہ! جب تک سورج کرن افشانیاں کرتا رہے گا اور جب تک گلے میں ہالہ پہنے ہوئے قمری کبوتر نوحہ خواں رہے گا، میں تجھے بھلا نہ سکوں گا۔“

فَلَمْ أَرَ مِثْلِي طَلَّقَ الْيَوْمَ مِثْلَهَا
وَلَا مِثْلُهَا فِي غَيْرِ جُرْمٍ تُطَلَّقُ

”اس دور میں کوئی میرا ثانی نہیں جس نے ایسی مثالی خاتون کو طلاق دے دی ہو۔ نہ اس جیسی کسی عورت کو یوں بلا جرم طلاق دی جاتی ہے۔“

لَهَا خُلُقٌ جَزْلٌ، وَرَأْيٌ وَمنصِبٌ
وَ خَلْقٌ سَوِيٌّ فِي الْحَيَاءِ وَ مَصْدَقُ

”عمدہ اخلاق، بصیرت پر مبنی رائے، بلند رتبہ، حیا سے مزین دل کش خدوخال، عمدہ

قدوقامت اور سچائی مبنی گفتگو اس خاتون کے نمایاں اوصاف تھے۔”

چنانچہ عبداللہ ؓ کی حالت زار پر رحم کھاتے ہوئے حضرت ابوبکر ؓ نے انھیں عاتکہ ؓ سے رجوع کرنے کا حکم دے دیا اور انھوں نے رجوع کر لیا۔ [1]

---

[1] یہ واقعہ تاریخ کی متعدد کتابوں میں موجود ہے۔ بعض حوالے اس سے پہلے کے حاشیے میں لکھ دیے گئے ہیں۔

کہیں عہد شکنی نہ ہو جائے!

شعبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک دن عمرو بن معدیکرِب رضی اللہ عنہ[1] ایک قبیلے میں پہنچے، اس کے افراد سے انھیں عداوت تھی۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک گھوڑا بندھا ہوا ہے اور ایک نیزہ زمین پر پڑا ہے جبکہ اس کا مالک قریب کے ایک گڑھے میں رفعِ حاجت کر رہا ہے۔

عمرو بن معدیکرب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے اُسے للکارا:

خُذْ حِذْرَكَ فَإِنِّي قَاتِلُكَ

---

[1] عمرو بن معدی کرب بن ربیعہ بن عبداللہ الزبیدی، ابوثور کی کنیت سے معروف تھے۔ ان کا شمار ملک یمن کے شہسواروں میں ہوتا تھا۔ 9 ہجری میں بنی زبید کے دس افراد کے ساتھ مدینہ منورہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے وفد کے ساتھ اسلام قبول کر کے یمن واپس چلے گئے۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد یمن کے مرتدین میں یہ بھی شامل تھے مگر جلد ہی سنبھل گئے اور دوبارہ اسلام قبول کر لیا۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انھیں شام روانہ کیا۔ وہاں سے انھوں نے جنگِ یرموک میں شرکت کی۔ اس میں ان کی ایک آنکھ چلی گئی۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے انھیں شام سے عراق بھیجا، وہاں انھوں نے قادسیہ کی جنگ میں حصہ لیا۔ یہ ادیب اور شاعر تھے۔ ان کے اشعار کا مجموعہ ”دیوان عمرو بن معدیکرب“ کے زیرِ عنوان شائع ہو چکا ہے۔ ان کا ایک شعر یہ ہے جو اُن کی بصیرت کی گواہی دیتا ہے ؎

إذا لم تستطع شيئا فدعه وجاوزه إلى ما تستطيع

”جب تم کوئی کام کرنے کی سکت نہیں رکھتے تو اسے چھوڑ کر ایسے کام کا رخ کرو جسے تم کر سکتے ہو۔“

ان کی وفات مقام رَے (نیشاپور سے 160 فرسخ کے فاصلے پر مشہور شہر) کے قریب ہوئی۔ ایک قول کے مطابق جنگِ قادسیہ میں شدتِ پیاس کی حالت میں جام شہادت نوش فرمایا۔ (دیکھیے الأعلام:86/5، والإصابة:5972)

”اپنے ہتھیار سنبھال لے! میں تجھے قتل کرنے والا ہوں۔“

اس نے پوچھا: تو کون ہے؟

میں نے جواب دیا: عمرو بن معدیکرب۔

کہنے لگا:

أَبَا ثَوْرٍ! مَا أَنْصَفْتَنِي أَنْتَ عَلٰى ظَهْرِ فَرَسِكَ وَأَنَا فِي بِئْرٍ

”ابوثور! تم نے مجھ سے انصاف نہیں کیا، تم گھوڑے پر سوار ہو اور اِدھر میں کنویں (گڑھے) میں پڑا ہوں (آخر یہ کہاں کی بہادری ہے؟)۔“

فَأَعْطِنِي عَهْدًا أَنَّكَ لَا تَقْتُلُنِي حَتّٰى أَرْكَبَ فَرَسِي وَآخُذَ حِذْرِي

”مجھ سے عہد کرو کہ جب تک میں گڑھے سے نکل کر اپنے گھوڑے پر سوار نہ ہو جاؤں اور اپنے ہتھیار سنبھال نہ لوں، اُس وقت تک تم مجھے قتل نہیں کرو گے۔“

میں نے عہد کیا کہ جب تک وہ گڑھے سے نکل کر اپنے گھوڑے پر سوار نہ ہو جائے گا اور اپنے ہتھیار سنبھال نہ لے گا اس وقت تک میں اسے قتل نہیں کروں گا۔

وہ میرے وعدے کے مطابق گڑھے سے نکل آیا اور اپنی تلوار نیام میں ڈال کر آرام سے بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا: یہ کیا تماشہ ہے؟

کہنے لگا:

مَا أَنَا بِرَاكِبٍ فَرَسِي وَلَا مُقَاتِلُكَ، فَإِنْ كُنْتَ نَكَثْتَ عَهْدًا فَأَنْتَ أَعْلَمُ

”میں اپنے گھوڑے پر سوار ہوں گا نہ تم سے قتال کروں گا، اگر تم اس کے باوجود اپنا

عہد توڑو گے تو تم ہی جانو (کہ زندگی بھر اپنے منہ پر عہد شکنی کا دھبہ لگائے پھرو گے)۔“

قارئین کرام! اب اگلا فقرہ پڑھنے سے پہلے ذرا رک جایئے اور غور فرمایئے کہ عرب کے بادیہ نشینوں کو وعدے کی پاسداری کس تک عزیز تھی اور وعدہ خلافی کو وہ کس قدر زبردست عیب اور عار کا باعث سمجھتے تھے۔ ایفائے عہد کی کتنی روشن مثال ہے عمرو بن معدیکرب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: میں نے اپنے دشمن پر قابو پانے کے باوجود اسے اُس کے حال پر چھوڑ دیا اور وہاں سے چل دیا۔ میں نے اپنی زندگی میں اس سے بڑا حیلہ ساز نہیں دیکھا۔ [1]

---

[1] دیکھیے کتاب الأذکیاء، ص:137.

سلطان جلال الدولہ کی ہوشیاری

ابوالحسن بن ہلال [1] نے اپنی تاریخ میں ایک تاجر کے حوالے سے ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ تاجر کا کہنا ہے کہ میں ایک فوجی چھاؤنی میں تھا۔ ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ سلطان جلال الدولہ [2] اپنی عادت کے مطابق شکار کے لیے نکلا تو اسے ایک دیہاتی روتا ہوا ملا، سلطان نے پوچھا: کیا ماجرا ہے؟

دیہاتی نے عرض کیا: تین لڑکوں نے میرا تربوز چھین لیا ہے، وہی میری کل پونجی تھی۔

سلطان نے کہا: تو لشکر گاہ میں چلا جا، وہاں سرخ رنگ کا ایک قبہ ہے، اس کے پاس

---

[1] ان کا نام ہلال بن محسن بن ابراہیم بن ہلال الصابي الحرانی ہے۔ ان کی کنیت ابوالحسن یا ابوالحسین ہے۔ سن 359 ہجری میں بغداد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد اور دادا صابي (مذہب کے) تھے۔ انھوں نے عمر کے آخری حصے میں اسلام قبول کر لیا۔ ان کا شمار بغداد کے مشہور ادیبوں اور مؤرخین میں ہوتا تھا۔ یہ جن دنوں صابي تھے۔ انھی دنوں انھوں نے ادب وانشاء میں مہارت پیدا کر لی تھی اور بغداد کی ادبی انجمن کے اہم ذمہ دار کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا تھا۔ ان کی کتابوں میں سے ایک کتاب "تحفة الأمراء في تاريخ الوزراء" کے نام سے موسوم ہے۔ ان کی وفات سن 448 ہجری میں ہوئی۔ (دیکھیے: الأعلام للزركلي: 92/8)

[2] یہ ابوالفتح ملک شاہ بن الب ارسلان محمد بن داود بن میکائیل بن سلجوق بن دقاق ہے۔ اس کا لقب جلال الدولہ ہے۔ والد کی وفات کے بعد تخت سلطنت پر فائز ہوا۔ ان کے دور میں بہت سے ممالک فتح ہوئے۔ یہ بہت بلند اخلاق تھا۔ لوگ اس کے اچھے اخلاق اور انصاف کی وجہ سے اُسے سلطانِ عادل کے نام سے پکارتے تھے۔ وہ اکثر جنگوں میں منصور و مظفر رہا۔ تعمیراتی کاموں میں دلچسپی رکھتا تھا۔ شکار کا بڑا شوقین تھا۔ اس کے دور میں ملک میں بڑا سکون اور امن تھا۔ لوگ بے خوف وخطر دور دراز کا سفر طے کرتے تھے۔

بیٹھ جا۔ شام تک وہیں بیٹھے رہنا۔ میں واپس آؤں گا تو تیری منشا پوری کر دوں گا۔

شام کو سلطان شکار سے واپس آیا تو اپنے ایک ملازم سے کہا:

قَدِ اشْتَهَيْتُ بِطِّيخًا فَفَتِّشِ الْعَسْكَرَ وَخِيَمَهُمْ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْهُ

”مجھے تربوز کھانے کی خواہش ہے، چھاؤنی میں جا کر دیکھو، شاید کسی فوجی کے پاس مل جائے۔“

ملازم چھاؤنی گیا اور چند ہی لمحے بعد سلطان کی خدمت میں تربوز پیش کر دیا۔

سلطان نے ملازم سے دریافت کیا: تربوز کس کے پاس سے ملا ہے؟

ملازم نے بتایا: فلاں دربان کے خیمے میں۔

سلطان نے اسے پیش کرنے کا حکم دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں دربان سلطان کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ سلطان نے دربان سے پوچھا: یہ بتا کہ تربوز تیرے پاس کہاں سے آیا؟

دربان نے بتایا: مجھے یہ تین لڑکوں نے لا کر دیا ہے۔

سلطان نے کہا: ابھی اور اسی وقت ان لڑکوں کو میری خدمت میں پیش کرو۔

دربان لڑکوں کو ڈھونڈنے نکلا مگر وہ سلطان کی نیت کو بھانپ چکا تھا لہٰذا اس نے لڑکوں کو بھگا دیا اور سلطان کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: سلطانِ معظم! وہ تو آپ کی سزا کے خوف سے بھاگ گئے۔

سلطان نے دیہاتی کو بلا بھیجا۔ جب وہ آیا تو اس سے پوچھا:

هٰذَا بِطِّيخُكَ الَّذِي أُخِذَ مِنْكَ؟

”کیا یہ وہی تربوز ہے جو لڑکوں نے تم سے چھین لیا تھا؟“

دیہاتی نے جواب دیا: جی ہاں۔

سلطان نے دیہاتی سے کہا: یہ تربوز لو اور یہ دربان میرا غلام ہے، اسے بھی اپنے ساتھ لے جاؤ، میں اسے تمھیں تحفہ میں دیتا ہوں تا آنکہ یہ اُن لڑکوں کو گرفتار کر کے پیش کر دے۔

سلطان نے دیہاتی کو یہ انتباہ بھی کیا:

وَاللّٰهِ لَئِنْ خَلَّيْتَهُ لَأَضْرِبَنَّ عُنُقَكَ

''اللہ کی قسم! اگر تم نے اسے چھوڑ دیا تو میں تمھاری گردن اڑا دوں گا۔''

دیہاتی نے دربان کا ہاتھ پکڑا اور باہر نکل گیا۔ باہر آنے کے بعد دربان نے دیہاتی سے کہا: ارے! تم مجھ سے تین سو دینار لے لو اور مجھے میرے ہی ہاتھ بیچ دو۔ دیہاتی نے دربان کی بات سے اتفاق کر لیا، پھر سلطان کی خدمت میں واپس آ گیا اور کہنے لگا:

يَا سُلْطَانُ! قَدْ بِعْتُ الْمَمْلُوكَ الَّذِي وَهَبْتَهُ لِي بِثَلَاثِمِائَةِ دِينَارٍ

''سلطانِ معظم! آپ نے جو غلام مجھے عنایت فرمایا تھا، اسے میں نے تین سو دینار میں بیچ ڈالا۔''

سلطان جلال الدولہ نے پوچھا:

قَدْ رَضِيتَ بِذٰلِكَ؟

''کیا تو اِس سودے سے راضی ہے؟''

دیہاتی نے عرض کیا: جی ہاں!

سلطان نے کہا: اچھا! تو پھر تین سو دینار پلے باندھو اور جان بچا کر یہاں سے نکل جاؤ۔[1]

---

[1] دیکھیے: كتاب الأذكياء لابن الجوزي، ص:94,93. یہ واقعہ وفيات الأعيان وأنباء أبناء الزمان: 284/5 میں بھی مذکور ہے۔

زیادہ صائب فیصلہ

سیدنا ابوہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے حضرت داود اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے زمانے کا یہ واقعہ بیان فرمایا کہ دو عورتیں کہیں جا رہی تھیں، ان کے ہمراہ ان کا ایک ایک بچہ بھی تھا۔ راستے میں بھیڑیے نے ان میں سے ایک کے بچے کو اچک لیا اور بھاگ گیا۔ اب ان کے پاس جو ایک بچہ تھا، اس کے بارے میں وہ دونوں جھگڑا کرنے لگیں۔ ایک کہتی تھی: یہ بچہ میرا ہے، دوسری کہتی: تیرا نہیں، میرا ہے۔ ان دونوں میں سے کوئی عورت بچے سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھی، دونوں کا دعویٰ تھا کہ بچہ اسی کا ہے۔

یہ سیدنا داود ؑ کا زمانہ تھا۔ لوگ اپنے الجھے ہوئے مسائل سلجھانے کے لیے سیدنا داود ؑ کی خدمت میں آتے تھے، چنانچہ ان دونوں عورتوں کا مقدمہ بھی سیدنا داود ؑ کے روبرو پیش ہوا۔ سیدنا داود ؑ نے دونوں کا موقف سنا اور اپنے تئیں جو ممکنہ قیاس آرائیاں کر سکتے تھے، کیں، پھر فیصلہ سنایا کہ یہ بچہ اس عورت کا ہے جو عمر میں زیادہ ہے۔ (امام نووی ؒ اس فیصلے کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ بچہ بڑی عورت ہی کے ہاتھ میں تھا جبکہ چھوٹی عورت کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی)۔

فیصلہ صادر ہو چکا تھا۔ دونوں عورتیں سیدنا داود ؑ کے دربار سے نکلیں، ان کا گزر حضرت داود ؑ کے صاحبزادے سیدنا سلیمان ؑ کے پاس سے ہوا، انھوں نے عورتوں

سے پوچھا: میرے والد نے تمھارے بارے میں کیا فیصلہ سنایا ہے؟ عورتوں نے سارا ماجرا سُنا دیا۔ انھوں نے کہا: یہ فیصلہ میرے والد نے اپنے اجتہاد سے کیا ہے۔ آؤ میں تم دونوں کے درمیان اس سے بہتر فیصلہ کر دیتا ہوں، پھر سیدنا سلیمان علیہ السلام نے بچے کو اپنی گود میں لیا اور حکم دیا:

اِئْتُونِي بِالسِّكِّينِ أَشُقُّ الْغُلَامَ بَيْنَكُمَا

”چھری لاؤ، میں اس بچے کے دو ٹکڑے کر کے تم دونوں کو آدھا آدھا دے دوں۔“

یہ سن کر بڑی عورت تو پرسکون رہی مگر چھوٹی عورت کے پاؤں تلے زمین نکل گئی کیونکہ بچہ اسی کا تھا، وہ حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہنے لگی: کیا آپ اس بچے کے دو ٹکڑے کر دیں گے؟ فرمایا: ہاں، میرے پاس اس کے سوا دوسرا علاج نہیں۔ وہ کہنے لگی:

لَا تَفْعَلْ، حَظِّي مِنْهُ لَهَا

”آپ ایسا نہ کریں، میں اپنا آدھا حصہ اِس عورت کو دیتی ہوں۔“

چھوٹی عورت کی یہ بات سُن کر سیدنا سلیمان علیہ السلام معاملے کی حقیقت سمجھ گئے اور فیصلہ سنایا کہ یہ بچہ اسی چھوٹی عورت کا ہے، بڑی عورت کا نہیں، اس لیے یہ بچہ چھوٹی عورت کے حوالے کر دیا جائے۔ اس حکم کی تعمیل ہوئی اور بچہ چھوٹی عورت کے حوالے کر دیا گیا۔ [1]

---

[1] صحيح البخاري، حديث:3427، وصحيح مسلم، حديث:1720.

عضد الدولہ کی دور اندیشی

علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ مجھے یہ روایت پہنچی کہ ایک تاجر خراسان سے چلا اور بغداد پہنچا۔ وہ حج کے لیے مکہ مکرمہ جانا چاہتا تھا، اس نے سفرِ حج کی تیاری مکمل کر لی تو زادِ راہ کے علاوہ اس کے پاس ایک ہزار دینار فالتو بچ گئے۔ اس نے سوچا اگر میں یہ ہزار دینار اپنے پاس رکھوں تو یہ مناسب نہیں کیونکہ راستے میں کوئی خطرہ بھی پیش آ سکتا ہے، پھر اس نے سوچا کہ اگر میں یہ رقم کسی کے پاس امانت رکھوں تو یہ تدبیر بھی خطرے سے خالی نہیں، کہیں وہ میری امانت کا انکار ہی نہ کر دے۔

چنانچہ خراسانی تاجر ایک صحرا میں گیا، وہاں اَرنڈ کے ایک درخت کے پاس گڑھا کھودا اور اس میں یہ ہزار دینار چھپا دیے۔ وہ اکیلا تھا، اس لیے اسے اس وقت کوئی نہیں دیکھ رہا تھا، پھر وہ حج کے لیے بغداد سے مکہ مکرمہ روانہ ہو گیا۔ حج کے بعد بغداد واپس آیا تو اَرنڈ کے درخت کے پاس گیا تاکہ گڑھے سے اپنے ایک ہزار دینار نکال لے مگر اسے یہ دیکھ کر سخت حیرانی اور پریشانی ہوئی کہ اس کا مال وہاں سے غائب ہے۔ اسے سخت صدمہ پہنچا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

خراسانی تاجر جو اب خراسانی حاجی بن چکا تھا، زور زور سے فریاد کر رہا تھا اور مسلسل روئے جا رہا تھا۔ کوئی اس سے رونے کا سبب پوچھتا تو وہ صرف یہ کہہ دیتا تھا کہ زمین نے میرا مال چوری کر لیا ہے، لوگ اس کی یہ بات سن کر ہنستے بھی تھے اور افسوس کا اظہار بھی کرتے تھے۔ جب اس کا واویلا حد سے بڑھا تو لوگوں نے اسے مشورہ دیا:

لَوْ قَصَدْتَ إِلٰى عَضُدِ الدَّوْلَةِ ، فَإِنَّ لَهٗ فِطْنَةً

”تم عضد الدولہ کی خدمت میں حاضر ہو کر۔ اپنا مقدمہ پیش کرو، شاید کوئی حل نکل آئے کیونکہ عضد الدولہ بڑا دور اندیش ہے اور ایسے مواقع پر پیچیدہ گتھیاں سلجھانے کی تدبیر نکال لیتا ہے۔“

خراسانی تاجر نے کہا:

أَوَ يَعْلَمُ الْغَيْبَ؟ ”کیا وہ غیب کا علم رکھتا ہے؟“

لوگوں نے کہا: فضول سوال کیوں کرتے ہو؟ اگر تم عضد الدولہ کے روبرو یہ مقدمہ پیش کردو تو تمھارا حرج ہی کیا ہے؟ ممکن ہے وہ کوئی حل نکال دے۔

چنانچہ لوگوں کے مشورے کے مطابق وہ عضد الدولہ کی خدمت میں پہنچا اور اپنا مقدمہ پیش کیا۔ عضد الدولہ نے اس کا مقدمہ بغور سنا اور کچھ دیر غور و فکر کے بعد شہر کے طبیبوں کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ اطباء حاضر ہوگئے تو اس نے ان سے دریافت کیا:

هَلْ دَاوَيْتُمْ فِي هٰذِهِ السَّنَةِ أَحَدًا بِعُرُوقِ الْخُرُوعِ؟

”کیا اس سال تم میں سے کسی نے ارنڈ کی جڑوں سے کسی کا علاج کیا ہے؟“

ایک طبیب بولا: جی ہاں! میں نے فلاں آدمی کا علاج کیا ہے ۔ وہ آپ کے خاص لوگوں میں سے ہے۔

عضد الدولہ نے حکم دیا: اُسے ابھی اور اسی وقت میرے پاس حاضر کیا جائے۔

جب وہ شخص عضد الدولہ کے پاس حاضر ہوا تو اس نے پوچھا: کیا تو نے اس سال ارنڈ کی جڑ سے علاج کرایا ہے؟

اس نے جواب دیا: ہاں۔

عضد الدولہ نے پوچھا: یہ جڑ کون لے کر آیا تھا؟

جواب دیا: میرا فلاں خادم۔

اب خادم کو طلب کیا گیا اور وہ حاضر ہو گیا۔

عضد الدولہ خادم سے مخاطب ہوا: تو ارنڈ کی جڑ کہاں سے لایا تھا؟

خادم نے جواب دیا: فلاں جگہ سے۔

عضد الدولہ نے کہا:

اِذْهَبْ بِهٰذَا مَعَكَ فَأَرِهِ الْمَكَانَ الَّذِي أَخَذْتَ مِنْهُ

”اس خراسانی کو اپنے ساتھ لے جا اور وہ جگہ دکھا جہاں سے تو نے وہ جڑ نکالی تھی۔“

خادم خراسانی تاجر کو اپنے ساتھ لے گیا اور وہ درخت دکھلایا۔ خراسانی نے وہ درخت فوراً پہچان لیا اور کہنے لگا: یہی وہ درخت ہے جہاں میں نے ایک ہزار دینار چھپا رکھے تھے۔ جب یہ دونوں عضد الدولہ کے پاس واپس آئے تو اس نے خادم سے کہا:

”هَلُمَّ بِالْمَالِ“ ”چلو! اس کا مال واپس کرو۔“

خادم پس و پیش کرنے لگا، عضدولہ نے مال واپس نہ کرنے کی صورت میں اسے سخت سزا کی دھمکی دی تو وہ تیزی سے اپنے گھر گیا اور ایک ہزار دینار لا کر خراسانی تاجر کے حوالے کر دیے۔[1]

قارئینِ کرام! اندازہ کیجیے کہ عضد الدولہ کتنا باریک بین تھا اور اس نے کیسی دور اندیشی سے ایک دور افتادہ مسافر کا مال اچکنے والے کا سراغ لگا لیا۔

---

[1] دیکھیے: كتاب الأذكياء لابن الجوزي، ص: 92 .

دندان شکن جواب

علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے اپنی معروف کتاب ''الاذکیاء'' میں سیدنا عیسی ابن مریم علیہ السلام کے بارے میں لکھا ہے: ایک دفعہ ابلیس سیدنا عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کے پاس آیا اور کہنے لگا:

أَلَسْتَ تَزْعُمُ أَنَّهُ لَا يُصِيبُكَ إِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكَ؟

''کیا تمھارا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ تمھیں وہی کچھ لاحق ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمھارے حق میں لکھ دیا ہے؟''

سیدنا عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام نے فرمایا: بے شک!

ابلیس نے کہا:

فَارْمِ بِنَفْسِكَ مِنْ هٰذَا الْجَبَلِ ، فَإِنَّهُ إِنْ قَدَّرَ لَكَ السَّلَامَةَ تَسْلَمُ

''اچھا! تو پھر اپنے آپ کو اس پہاڑ سے نیچے پھینک دو، اگر اللہ تعالیٰ نے تمھارے حق میں سلامتی لکھی ہوگی تو تم صحیح سالم بچ جاؤ گے اور تمھیں کچھ نہ ہوگا۔''

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے ابلیس کو دندان شکن جواب دیا۔ فرمایا:

يَا مَلْعُونُ! إِنَّ لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ أَنْ يَّخْتَبِرَ عِبَادَهُ وَلَيْسَ لِلْعَبْدِ أَنْ يَّخْتَبِرَ رَبَّهُ عَزَّ وَجَلَّ

''اے ملعون! اللہ عزوجل کو تو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے بندوں کا امتحان لے مگر بندے کو ہرگز اس جسارت کا حق نہیں کہ وہ اللہ عزوجل کا امتحان لے۔''[1]

چنانچہ ابلیس اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

---

[1] دیکھیے کتاب الأذکیاء لابن الجوزي :37.

جو سو رہے ہیں اُن کو جگانے کی فکر کر

ایک ساتھی نے اپنا قصہ کچھ یوں بیان کیا: میں ایک افریقی ملک کا سفر کر رہا تھا، میرا مقصد وہاں کے مہاجر کیمپ کا جائزہ لینا، غرباء میں امداد تقسیم کرنا اور دعوتی سرگرمیوں کی نگرانی کرنا تھا۔ سفر بڑا لمبا اور تھکا دینے والا تھا۔ چھوٹے سے ایئرپورٹ سے باہر نکلا، سڑکوں کا حال پتلا تھا۔ میرے میزبان بڑے خوش تھے، انھوں نے میرا پُرتپاک استقبال کیا، پھر ہم ایک چھوٹے سے گاؤں کی طرف روانہ ہوئے۔ میرے لیے وہاں ایک خصوصی خیمہ لگایا گیا تھا۔ شام ہونے کو تھی۔ میں تھکا ہوا تھا۔ میرے لیے زمین ہی پر گھاس بچھا کر اوپر کمبل ڈال کر آرام دہ بستر بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ میں نے قدرے ناگواری سے خیمے میں قدم رکھا، لائٹ کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ میں بستر پر لیٹا تو دل میں طرح طرح کے بے ترتیب خیالات آنے لگے۔

یہ سفر کتنا مشکل ہے، میں یہاں کیوں آیا، یہ کتنا تھکا دینے والا سفر ہے، مجھے جلد ہی واپس جانا چاہیے۔ گھر میں دنیا جہان کی آسائشیں میسر ہیں اور یہاں اس بستی میں بجلی بھی موجود نہیں...... میں سوچتا رہا اور پھر میرا ذہن دوسری طرف منتقل ہو گیا۔ اس علاقے میں شاید ہی کوئی داعی آیا ہو۔ آخر یہاں کون آئے گا؟ اتنا لمبا اور پُرمشقت سفر آسان نہیں، پھر میرے دماغ میں رقصِ ابلیس ہونے لگا۔ میں کتنا عظیم ہوں، دعوت کی خاطر اپنی ساری آسائشیں چھوڑ کر یہاں آیا ہوں۔ بلاشبہ یہ بہت بڑی قربانی ہے۔ میرے دل میں غرور، عجب اور احساسِ برتری پیدا ہونے لگا۔ میں انھی گڈمڈ خیالوں میں ڈُبکیاں کھا رہا تھا کہ مجھے نیند آ گئی۔

صبح ہوئی تو میزبان آ گئے۔ ابھی روشنی پوری طرح نہیں پھیلی تھی کہ میزبان بولے: چلو ذرا اس گاؤں کا چکر لگاتے ہیں۔ میں میزبانوں کے ساتھ آگے بڑھا۔ کچھ دور گاؤں کا واحد کنواں نظر آیا، یہاں لوگوں کا ہجوم تھا۔ عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے سبھی جمع تھے۔ پانی تو انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ میں نے دیکھا کہ کچھ خواتین اپنے سروں پر پانی کے برتن اٹھائے چلی آ رہی تھیں۔ انھی عورتوں میں ایک گورے رنگ کی نوجوان لڑکی نظر آئی۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کہ یہ گوری کہاں سے آ گئی! شاید اسے برص کا مرض ہو جس کی وجہ سے اس کا پورا جسم سفید ہو گیا ہے۔ میں نے اپنے ہمراہیوں سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟

جواب ملا: یہ لڑکی ناروے کی رہنے والی ہے۔ وہاں کی کسی عیسائی تنظیم کے لیے کام کرتی ہے، پچھلے چھ مہینے سے ہمارے ہاں مقیم ہے اور ہمارے جیسا لباس پہنتی ہے۔ کھانا پینا، اُٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، اس کا پچھلا معیارِ زندگی اسے ہماری بستی میں چھوڑ کر واپس چلا گیا، اب اس نے ہماری طرح کی بود و باش اختیار کر لی ہے۔ یہ ہماری خواتین کے ساتھ رہ کر کام کرتی ہے، اُنھی کی زبان بولتی ہے۔ روزانہ لڑکیوں کو اکٹھا کرتی ہے۔ ان سے گپ شپ کرتی ہے اور انھیں پڑھنا لکھنا سکھاتی ہے۔ کبھی کبھار رقص کے پیچ و خم بھی بتلاتی ہے۔ لڑکیاں اس کے ساتھ بڑی خوش رہتی ہیں اور اس سے بڑی محبت کرتی ہیں۔ یہ ہمارے سماج میں ڈھل گئی ہے۔ یتیموں کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے، ان کی امداد کرتی ہے، بیوہ عورتوں کی دلگیری کرتی ہے۔ مریضوں کے پاس جاتی ہے، ان کی تیمارداری کرتی ہے، انھیں ادویات بھی مہیا کرتی ہے، اس کی وجہ سے بہت سے لوگ عیسائیت اختیار کر چکے ہیں۔

قارئین کرام! ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیے ایک نوجوان لڑکی جو ناز و نعمت کے گہوارے میں پلی بڑھی ہے، اپنے باطل عقائد کی ترویج کے لیے اپنے خوبصورت ملک کو چھوڑتی ہے،

ایسا ملک جہاں دنیا بھر کی سہولتیں اور آسائشیں ہی نہیں، بلا مؤاخذہ عیاشیاں بھی میسر ہیں، یہ اُنھیں اپنے آپ پر حرام قرار دے کر بلا تأمل ایک ایسے ملک میں آبسی ہے جہاں کوئی سہولت نہیں، سڑکیں ناپید، بجلی عنقا، اعلیٰ مشروبات وفواکہ معدوم اور غذا ناقص ہے۔ پانی گدلا ہے، دور دور تک پینے کے قابل صاف پانی نہیں ہے، ندی نالوں کا پانی پیتی ہے۔ سرکنڈوں سے بنے ہوئے گھر میں رہتی ہے۔ ناموافق موسم کے تھپیڑے سہہ رہی ہے، جسم نحیف ہو رہا ہے۔ رنگ و رُوپ اُڑ چکا ہے مگر یہ سب کچھ کیوں ہے؟ یہ اتنی مصیبتیں کیوں جھیل رہی ہے؟ جواب بڑا واضح ہے...... صرف عیسائیت کی تبلیغ کے لیے...... یہ صورتحال دیکھ کر مجھے اپنے آپ پر ندامت ہونے لگی چنانچہ میں نے واپسی کا ارادہ تبدیل کر لیا۔

ایک اور ساتھی نے اپنا قصہ بیان کرتے ہوئے کہا:

میں مطالعاتی دورے پر جرمنی گیا ہوا تھا۔ ہوٹل کے کمرے میں بیٹھا۔ رسائل دیکھ رہا تھا، اچانک کسی نے دروازے پر دستک دی تو مجھے تعجب ہوا کہ یہاں مجھ سے ملنے کے لیے کون آ گیا؟ میں نے دروازے کے شیشے سے باہر جھانکا۔ میں نے دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکی ہاتھ میں کتابیں لیے کھڑی ہے۔ میں نے پوچھا کہ تم کون ہو اور کیا چاہتی ہو؟ اس نے کہا: دروازہ کھولو، مجھے آپ سے کام ہے۔ میں نے کہا کہ میں مسلمان ہوں، کمرے میں اکیلا ہوں۔ شرعی طور پر تمھارا تنِ تنہا میرے پاس آنا جائز نہیں۔ وہ اصرار کرتی رہی۔ میں انکار کرتا رہا اور یہی کہتا رہا کہ میں دروازہ نہیں کھولوں گا اور تمھیں آنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ اس نے کہا کہ میرا تعلق عیسائیت کے مشنری ادارے سے ہے۔ بس یہ کتابیں وصول کر لو، میں چلی جاؤں گی۔ میں نے جواب دیا: مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

جب وہ مایوس ہو گئی کہ میں دروازہ نہیں کھولوں گا تو اس نے اپنا منہ دروازے کی درز

سے لگایا اور پورے زور سے اپنا عقیدہ اور منہج بتانے اور اپنے دین کا تعارف کرانے لگی۔ یہ پورے دس منٹ کا دورانیہ تھا۔ جب اس نے اپنی تقریر ختم کی تو میں نے پوچھا کہ تم نے اپنے آپ کو اس قدر مشقت میں کیوں ڈالا اور زور زور سے ایک بے سود تقریر کیوں کی؟

وہ بولی: مجھے اب سکون مل گیا ہے کیونکہ میں اپنے دین کے لیے جو خدمت پیش کر سکتی تھی، وہ اپنی ہمت اور استعداد کے مطابق کر چکی۔

محترم قارئین! کیا ہم نے کبھی خود سے سوال کیا ہے کہ اسلام کی دعوت پھیلانے میں ہمارا کتنا حصہ ہے؟ ہم نے اسلام کی کیا خدمت کی ہے؟ کتنے لوگ ہمارے ہاتھ پر مسلمان ہوئے ہیں؟ ذرا عیسائیت کا پرچار کرنے والی اِس تن تنہا لڑکی کے حوصلے اور ولولے دیکھیے اور اپنی حالت پر غور کیجیے۔ ہدایت پانا ہر انسان کا قدرتی حق ہے۔ اسلام ہدایت وسعادت کا سرچشمہ ہے۔ کیا ہم نے اسلام کا نورِ ہدایت پھیلانے کی کوئی ادنیٰ سی کوشش بھی کی ہے؟ کوشش تو کجا، ہمیں اپنے اِس فرض عین کا کبھی خیال تک نہیں آیا۔ بے شمار انسان کفر، الحاد، شرک، بدعت، فسق و فجور، ظلم اور سرکشی کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں اور اِس معصیتِ جاریہ کی وجہ سے دوزخ کا ایندھن بننے والے ہیں۔ کیا کبھی ہمیں احساس ہوا کہ انھیں اسلام کی روشنی دکھائیں، گمراہیوں کی کیچڑ سے نکالیں اور جہنم میں گرنے سے بچائیں۔ ہم تو پیدا ہی اس لیے ہوئے تھے کہ عالم انسانیت کا رُخ مخلوق سے خالق کی طرف، دنیا سے آخرت کی طرف، بدی سے نیکی کی طرف، باطل سے حق کی طرف، مال سے اعمال کی طرف اور ظلمت سے ضیاء کی طرف پھیر دیں مگر ہم تو خود ہی صراطِ مستقیم سے بھٹک گئے۔ اپنی زندگی کا اصل مقصد ہی بھول گئے۔ ہم نے گمراہوں کو ہمراہی اور غیروں کے نقشِ قدم کو نشان منزل قرار دے لیا۔ ہم طاقت کے آگے اور دولت کے پیچھے بھاگنے

لگے اور اس دوڑ میں پاگلوں سے بھی بدتر ہو گئے۔ ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

تاریخ کے اوراق یہ گواہی دینے کے لیے موجود ہیں کہ ہمارے اسلاف کرام دعوت دین کے لیے حجاز سے نکل کر ساری دنیا میں پھیل گئے تھے۔ انھوں نے اپنا خون پسینہ ایک کر کے دعوت دین کا فرض ادا کیا۔ جب انھوں نے ادائے فرض کے لیے احساسِ ذمہ داری اور جاں نثاری کا مظاہرہ کیا تو ہمارے قادر مطلق نے بھی اُن پر اپنے فضل و کرم کے دریچے کھول دیے اور ساری دنیا کی دولت اور حکومت صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے قدموں میں ڈال دی...... یہ دنیا کبھی کسی کے لیے نہیں بدلی، ہاں! اگر ہم خود بدل جائیں اور اپنے اندر ایک انقلابی تبدیلی پیدا کر لیں، اپنی غفلت کے ٹیلے توڑیں۔ گناہوں سے توبہ کریں، ایمان اور اعمالِ صالحہ کی زندگی بسر کریں اور دعوت دین کا فرض ادا کرنے لگیں تو اللہ رب العزت ہمیں پھر اپنے انعامات کے لیے چن لے گا اور ہمارے سر پر فتحِ مبین کا وہی تاج پہنا دے گا جو اس نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سر پر سجا دیا تھا۔

بعض لوگ کہتے ہیں: جی چھوڑیے! اسلام کی دعوت آسان کام نہیں، ہمیں تو شرم آتی ہے کہ جہاں جاؤ وہاں اسلام کے حوالے سے گفتگو شروع کر دو اور دعوتِ دین دینے لگو......۔ اے میرے غافل بھائیو! ذرا اپنے نفس کی بندگی اور گناہوں کی زندگی پر غور کر لو۔ کاہلی، غفلت، جہالت، معصیت، شرک، بدعت، سودخوری، بادہ نوشی اور کون سا گناہ ہے جس کے ہم مرتکب نہیں ہو رہے؟ میرے عزیزو! شرم کرنے کی اصل چیز یہی رب العزت کی نافرمانی والی زندگی ہے۔ اسلام کی دعوت میں شرم اور جھجک کیسی؟ دین حنیف کی دعوت

تو سب سے بڑا اشرف ہے۔

...... ایک مغنیہ اور ایک رقاصہ کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ وہ ہزاروں تماشائیوں کے سامنے نیم عریاں بدن کے ساتھ رقص کرتی ہے، وہ خوب جانتی ہے کہ تماشائیوں کی ناپاک بھوکی نگاہیں اس کے بدن پر منڈلا رہی ہیں مگر اس نے تو کبھی یہ نہیں کہا کہ مجھے شرم آتی ہے، حالانکہ یہ شرم کا نہیں ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ اسلام کی دعوت کے لیے ہچکچانے یا معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اسلام کی دعوت دے۔ اسلام کی دعوت دینا بہت آسان ہے۔ مثالی زندگی کا نمونہ بن جایئے، ہر خاص و عام سے ملیے۔ محبت اور دل سوزی سے دین قیم کی بات کیجیے اور ان کے دل کا یقین بدل دیجیے۔ انھیں بتایئے کہ ہماری ہر حاجت، ہر راحت اور ہر سعادت سو فیصد فاطر السماوات والأرض کے ہاتھ میں ہے۔ کوئی پیر، فقیر، امیر، کبیر، وزیر، دبیر، سفیر یا مدیر کسی کو قطعاً کچھ نہیں دے سکتا۔ کامیابی صرف محمد رسول اللہ ﷺ کے مبارک طریقوں کے مطابق زندگی بسر کرنے سے نصیب ہوتی ہے۔ اگر دنیا بھر کے مسلمان اپنی اپنی جگہ محبت اور حکمت کے ساتھ یہی دعوت دینے لگیں تو انقلاب برپا ہو جائے گا اور آج ہر طرف ہوس، بدامنی، بمباری، غارت گری، وحشت، آفت، ظلمت اور دہشت کی جو آتشِ نمرود بھڑک رہی ہے، وہ گلزار خلیل علیہ السلام میں تبدیل ہو جائے گی!

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

ان کا نقش قدم……معراج انسانیت

حضرت ابو بکر صدیق ؓ ایمان و عمل، فضائل و مکارم اور حسنات و کمالات کا ایک نادر مجموعہ تھے۔ اُن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے فکر، قول اور عمل سے ہمیشہ کے لیے بتلا دیا کہ ایمان کی مضبوطی کے کیا معنی ہیں اور اللہ رب العزت کی بندگی اور رسول ﷺ کی اتباع کس طرح کی جاتی ہے۔ یہ ان کے اٹل ایمان اور یگانہ سیرت کی درخشندگی ہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں عالم انسانیت کی سب سے بڑی شخصیت امام الانبیاء حضرت محمد ﷺ کا جانشین بنا دیا۔ یہ وہ منفرد اعزاز اور امتیاز ہے جو پوری ملتِ اسلامیہ میں صرف حضرت ابو بکر صدیق ؓ ہی کے حصے میں آیا اور وہ خاتم النبیین ﷺ کے بعد امت مسلمہ کے سب سے بڑے قائد بن گئے۔

آیئے ذرا جائزہ لیں کہ وہ کون سی خوبیاں اور فضائل تھے جن کی وجہ سے وہ جانشینِ رسول ﷺ اور امتِ مسلمہ کے سب سے بڑے مربی قرار پائے۔

ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی پاکیزہ فطرت تھی۔ ابھی دعوتِ اسلام کا آغاز نہیں ہوا تھا اور جاہلیت کے لیل و نہار پورے جوبن پر تھے، اس زمانے میں بھی حضرت ابو بکر ؓ کی سیرت اُجلی اور بے داغ ہی رہی۔ انھوں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جسے ادنیٰ یا دوسرے درجے کا کام قرار دیا جاسکے۔ اس دور میں بھی ان کی دوستی حضرت محمد ﷺ ہی سے تھی۔

جب رسول اللہ ﷺ نے دعوتِ اسلام کا آغاز کیا اور حضرت ابو بکر ؓ کو بتایا کہ اللہ ایک

ہے۔ اُس کی یکتائی، کبریائی اور زیبائی میں کوئی شریک نہیں۔ میں اللہ کا رسول ہوں اور مجھ پر وحی اترتی ہے تو وہ ان سچائیوں پر فوراً دل و جان سے ایمان لے آئے۔ یوں وہ مردوں میں سب سے پہلے مسلمان قرار پائے۔

ان کی دوسری بڑی خوبی دین حنیف کی دعوت و تبلیغ کا پُر جوش جذبہ تھا۔ وہ ہر آن اسی دُھن اور اسی لگن میں لگے رہتے تھے کہ کسی طرح اسلام کا نور دور دور تک پھیل جائے اور ہر گمراہ شخص کے قدم راہِ ہدایت پر لگ جائیں۔ وہ اپنے عزیز و اقارب، دوست احباب اور اپنے حلقۂ اثر کے تمام افراد کو قبولِ اسلام کی شام و سحر دعوت دیتے رہے۔ حضرت عثمان بن مظعون، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت ابو عبیدہ بن جراح اور حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہم انھی کی ترغیب سے مسلمان ہوئے اور ان رجالِ کبار نے اسلام کی ایسی عظیم الشان خدمات انجام دیں کہ سب دنگ رہ گئے۔ آخر الذکر چار حضرات عشرہ مبشرہ کے صحیفۂ بشارت میں شامل ہو کر ہمیشہ کے لیے امر ہو گئے۔

ان کی سیرت کا تیسرا وصف غریبوں اور ناداروں کی دردمندی، ہمدردی، غم خواری اور مظلوموں کی زبردست حمایت کا جذبہ تھا۔ وہ غلاموں اور راہِ حق کے مظلوموں کو ان کے کافر آقاؤں کے پنجۂ ستم سے چُھڑانے کے لیے اپنا مال بے دریغ خرچ کرتے تھے۔ انھوں نے مُنہ مانگے دام دے کر حضرت بلال اور حضرت ابن فہیرہ رضی اللہ عنہما جیسے مظلوموں کو زنجیر غلامی سے آزاد کرایا۔ اُن کی فیاضیوں اور غریب نوازیوں کے چرچے عام تھے۔ اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے تھے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ناتوانوں کا بوجھ اُٹھاتے ہیں، بہت مہمان نواز ہیں، محتاجوں کو کما کر دیتے ہیں اور راہِ حق میں پیش آنے والی مشکلات میں اہلِ ایمان مدد کرتے ہیں۔

اُن کے حُسن کردار کی چوتھی نہایت عظیم الشان خوبی محمد رسول اللہ ﷺ سے والہانہ محبت

تھی۔ ہجرت مدینہ کے لیے رسول اللہ ﷺ کا رفیق سفر بننے کا اعزاز بھی تنہا آپ ہی کو میسر آیا۔ یہ نہایت نازک وقت اور بہت خطرناک سفر تھا۔ کفار مکہ رسول اللہ ﷺ کی جان کے درپے تھے اور ان کی تلاش میں بھاری انعامات کا لالچ دے کر اپنے ہرکارے دوڑا رہے تھے۔ اس موقع پر آپ ﷺ کے ہم سفر کو بھی جان کے لالے پڑ سکتے تھے۔ لیکن حضرت ابو بکر ؓ نے اپنی جان کی ذرہ برابر پروانہ کی اور رسالت مآب ﷺ کے ساتھ بے دھڑک مدینہ روانہ ہو گئے۔

اسی دوران غارِ ثور میں پڑاؤ کا موقع آیا تو غار میں پہلے خود داخل ہوئے تا کہ اگر اندر کوئی موذی جانور ہو تو اُس کی اذیت وہ اپنی جان پر جھیل لیں مگر رسول اللہ ﷺ پر کوئی آنچ نہ آنے دیں۔ محبت، رفاقت اور فدویت کا یہ عملی مظاہرہ ایسا ایمان افروز واقعہ ہے جس کی مثال تاریخ انسانی میں ناپید ہے۔

ان کی شخصیت کا پانچواں حسن ان کا اٹل ایمان، بالغ نظری، معاملہ فہمی، بصیرت، شجاعت اور استقامت سے عبارت ہے جس کے جوہر رسالت مآب ﷺ کی رحلت اور لشکرِ اسامہ کی روانگی کے موقع پر خوب کُھلے۔ یہاں ہم یہی ایمان افروز واقعہ بیان کرنا چاہتے ہیں تا کہ امتِ مسلمہ حضرت ابو بکر ؓ کے فضائل و اوصاف سے سبق لے اور آج وہ جن سنگین مصائب میں مبتلا اور کٹھن مسائل سے دوچار ہے، انھیں حضرت ابو بکر ؓ کی طرح توکل علی اللہ اور فراست و شجاعت کی روشنی میں حل کرے۔

صحابۂ کرام ؓ کی زندگی میں غم و اندوہ کا سب سے بڑا بھونچال اس وقت آیا جب رسالت مآب حضرت محمد ﷺ رحلت فرما گئے۔ یہ نہایت دلدوز سماں تھا۔ صحابۂ کرام سکتے کی حالت میں یوں سر جھکائے بیٹھے تھے جیسے وہ کسی سرد و سنسان، پر اسرار بیابان میں گم ہیں

اور ''نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن'' کی کیفیت سے دوچار ہیں۔ اس وقت صدیق اکبر ؓ بھی بہت مغموم تھے مگر انھوں نے صحابہ کی بے قراری، درد اور درماندگی دیکھی تو ان کی رگوں میں غیرت وحمیت کی بجلیاں کوندنے لگیں۔ انھوں نے اپنے آپ پر قابو رکھتے ہوئے پر وقار لہجے میں فرمایا:

> ''لوگو! جو لوگ محمد ﷺ کی پرستش کرتے تھے، انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ محمد وفات پا گئے ہیں اور جو لوگ اللہ رب العزت کی پرستش کرتے تھے، انھیں خبردار رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ حي وقیوم ہے، ہمیشہ کے لیے زندہ ہے۔ اسے کبھی فنا نہیں......''

پھر یہ آیت پڑھی:

> ﴿ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴾

> ''محمد ﷺ تو ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں، اگر وہ وفات پا گئے یا شہید کر دیے گئے تو کیا تم راہ حق سے الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ اور جو راہِ حق سے اُلٹے پاؤں پھرے گا، وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا (وہ اپنا ہی نقصان کرے گا) اور اللہ شکر گزاروں کو صلہ عطا فرمائے گا۔''[1]

صحابۂ کرام ؓ نے اپنے برگزیدہ سردار کی یہ تقریر سُنی تو چونک اُٹھے۔ انھیں یوں محسوس ہوا جیسے زلزلے کے بعد زمین کی شکنوں میں ہمواری آ گئی ہے اور ان کی رگوں میں از سر نو جان پڑ گئی ہے۔ ایسے الم انگیز موقع پر جبکہ حضرت عمر ؓ جیسا جری انسان بھی فرطِ غم سے نڈھال ہو کر ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا، اہلِ ایمان کے گرے ہوئے حوصلے بلند رکھنا

---

[1] آل عمران 3:144.

صدیق اکبر ؓ کا وہ کارنامہ ہے جو ہمیشہ دلوں میں ان کے لیے احترام کے جذبات پیدا کرتا رہے گا۔

پھر جب انھوں نے خلافت کی باگ ڈور سنبھالی تو اپنی پہلی تقریر میں فرمایا:

> ”اے لوگو! میں آپ کا خلیفہ بنایا گیا ہوں، حالانکہ میں آپ سب سے بہتر آدمی نہیں ہوں، پس اگر میں ٹھیک کام کروں تو آپ میری مدد کریں۔ اگر غلط کام کروں تو مجھے درست کر دیں۔“

مزید فرمایا: ”میں جب تک اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کروں، اس وقت تک آپ میری اطاعت کریں۔ اگر میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کروں تو پھر آپ پر میری اطاعت کی کوئی ذمہ داری نہیں۔“

بعد ازاں جب لشکرِ اُسامہ کی روانگی کے سلسلے میں صحابۂ کرام ؓ نے یہ رائے دی کہ اس نازک گھڑی میں جبکہ رسالت مآب ﷺ رحلت فرما گئے ہیں اور مدینہ منورہ کے اردگرد ارتداد کی وبا پھوٹ پڑی ہے، اِس لشکر کی روانگی روک دی جائے تو آپ نے پوری قوت سے اعلان کیا:

”اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو ساری دنیا کے لیے ہادی بنایا تھا اور انھیں ہر قسم کی غلطیوں کے امکانات سے محفوظ کر دیا تھا۔ یہ چیز مجھے میسر نہیں۔ لیکن میں اعلان کرتا ہوں کہ میں اپنے عالی مقام پیش رو حضرت محمد ﷺ ہی کے نقش قدم پر چلوں گا اور ان کے بتائے ہوئے راستے سے ہٹ کر ہرگز کوئی نئی راہ نہیں نکالوں گا۔“

ہم نے اوپر حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی تقریروں کے تین مختصر سے اقتباسات درج کیے ہیں۔ انھیں توجہ سے پڑھیے اور غور فرمائیے کہ ان چھوٹے چھوٹے جملوں میں اسلامی آدابِ سیاست اور امورِ حکومت کا کتنا وقیع و رفیع جہانِ معنی جگمگا رہا ہے۔ خاص طور پر ان

کا یہ ارشاد کتنا اہم ہے کہ ایک اسلامی ریاست کے امیر کی حیثیت سے میں صرف رسول اللہ ﷺ ہی کے بتائے ہوئے راستے پر چلوں گا اور ان کے مقدس راستے سے ہٹ کر اپنی طرف سے کوئی نئی راہ نہیں نکالوں گا...... کیا آج عالم اسلام کے اکثر حکمران ان اُصولِ جہانبانی سے کوئی ادنیٰ سی بھی وابستگی رکھتے ہیں جو رسالت مآب ﷺ نے نہ صرف بتائے تھے بلکہ ان پر عمل کر کے دکھلایا تھا۔ اور جس کی ٹھیک ٹھیک پیروی کا نمونہ حضرت ابو بکر صدیق نے قائم کر دکھایا۔ ابو بکر صدیق ؓ کی تقریریں ایک آئینہ ہیں، اس آئینے میں ہمیں اپنے خدوخال دیکھنا چاہئیں اور جائزہ لینا چاہیے کہ کیا ہم رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے راستے پر چل رہے ہیں یا اپنے لیے نئی نئی راہیں نکال رہے ہیں۔ جوں جوں آپ اس حقیقت پر غور کرتے جائیں گے، آپ پر یہ بھید کھلتا چلا جائے گا کہ ہمارے تمام آلام و مصائب کی اصل وجہ وہی نت نئی راہیں ہیں جو ہم نے عقائد، عبادات، معاشرت، معیشت، سیاست اور زندگی کے دیگر شعبوں میں ازخود نکال لی ہیں یا غیروں سے لے لی ہیں اور انھی تاریک راہوں نے ہمیں جادۂ ہدایت سے دور پھینک کر زندگی کی ہر سعادت سے محروم کر دیا ہے۔

آیئے اب لشکر اسامہ کی روانگی کا حال اور اس سلسلے میں حضرت ابو بکر صدیق ؓ کے کردارِ جوہر دار کی سرگزشت سنیے:

سیدنا ابو بکر صدیق ؓ کی مدت خلافت دو سال تین ماہ دس دن تھی مگر اس قلیل مدت میں انھوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے، وہ دوسرے خلفاء کے کاموں پر سبقت لے گئے۔ ان کے دور میں جو اصلاحات ہوئیں، وہ پھولوں کی سیج پر نہیں ہوئی تھیں۔ ان کی راہ میں بے شمار مسائل، رکاوٹیں، مشکلات اور پریشانیاں حائل تھیں مگر جس عزم و استقلال،

ثابت قدمی اور قوت ایمانی سے انھوں نے ان مشکلات اور مسائل کا حل تلاش کیا، وہ ایک ایسا اعزاز ہے جو صرف انھی کے حصے میں آیا۔ انھوں نے جب اقتدار سنبھالا تو اللہ کے رسول ﷺ اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ آپ ﷺ کی وفات کا غم اس قدر جاں گسل تھا کہ مسلمان اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھے۔ ادھر مدینہ طیبہ کے اردگرد مقیم بدوؤں نے بغاوت کر دی۔ وہ مسلمانوں کی اس پریشانی اور حالتِ غم کو اپنے لیے سنہرا موقع سمجھ رہے تھے اور اِس سے فائدہ اُٹھا کر مسلمانوں کی قوت ختم کرنے کے درپے ہو گئے تھے۔ چند ہی دنوں میں اسلامی حکومت کا نقشہ ایسی شکل اختیار کر گیا کہ اہل مدینہ اور اہل مکہ ایمان پر قائم رہے۔ شہر طائف کے کچھ لوگ اور بحرین کے مسلمان بھی قوت ایمانی کا مظاہرہ کرتے رہے لیکن دیگر علاقوں میں مختلف جھوٹے نبی سر اٹھانے لگے۔ ان کا فتنہ معمولی نہ تھا۔ یمن میں اسود عنسی حکومت پر قبضہ کیے بیٹھا تھا۔ اس کے ماننے والوں کی خاصی بڑی تعداد تھی۔ ان میں طلیحہ اسدی بھی تھا، مسیلمہ کذاب یمامہ (آج کل کا ریاض اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ) میں فتنہ برپا کیے ہوئے تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں نبوت میں شریک ہوں۔ اس کے ساتھ سجاح نامی ایک عورت بھی آملی۔ اُس نے کہا کہ نبوت مردوں پر ختم ہوئی ہے، عورتوں پر نہیں، پھر اس نے نبیہ ہونے کا دعوی کر دیا۔ غرضیکہ ختم نبوت کے ان ڈاکوؤں نے اپنے اپنے علاقوں میں لوگوں کو بہت گمراہ کیا۔ بعض قبائل نے زکاۃ دینے سے انکار کر دیا۔ کچھ لوگ نماز کے منکر ہو گئے۔ مسیلمہ کذاب نے سجاح سے شادی کر لی اور دو نمازیں سجاح کے مہر میں معاف کر دیں۔ بلاشبہ یہ مسلمانوں پر بڑا نازک اور پریشان کن وقت تھا۔ ذرا تصور کیجیے کہ مدینہ کے اردگرد کیسے کیسے فتنے کروٹیں لے رہے تھے اور کتنے منہ زور دینی، سیاسی اور دفاعی مسائل اُمنڈ آئے تھے مگر کوہِ وقار سیدنا ابوبکر صدیق ؓ ہمالیہ سے بھی

بلند اور محکم عزم لے کر اُٹھے اور مرتدین کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ ان کا کہنا تھا: اگر ساری دنیا کے لوگ بھی حق سے انکار کر دیں، تب بھی میں تن تنہا ان کا مقابلہ کروں گا۔ یہ ایک طے شدہ امر اور مسلمہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ حق کو غالب کر کے رہتے ہیں، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے خاص تائید الٰہی سے خلافت سنبھالنے کے بعد جو سب سے پہلا کام کیا، وہ جیش اسامہ کو اس کے مِشن پر روانہ کرنا تھا۔

جیش اسامہ کی روانگی کا فیصلہ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی حیات طیبہ ہی میں کر دیا تھا۔ آپ ﷺ نے حضرت اسامہ بن زید بن حارثہ کو ایک بڑے لشکر کا سالار مقرر فرماتے ہوئے حکم دیا کہ بلقاء کا علاقہ اور فلسطین کی سرزمین سواروں کے ذریعے روند آؤ۔ اس کا سبب یہ تھا کہ رومن امپائر کے غرورِ فرمانروائی کو گوارا نہ تھا کہ وہ اسلام اور اہلِ اسلام کے زندہ رہنے کا حق تسلیم کرے، اس لیے اس کی قلمرو میں رہنے والا جو شخص مسلمان ہو جاتا، اس کی جان کی خیر نہ رہتی۔ یہ صفر 11 ہجری کی بات ہے۔ حضرت اسامہ ؓ نوعمر تھے۔ بعض لوگوں نے ان کی چھوٹی عمر پر نکتہ چینی کی۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم لوگ ان کی سپہ سالاری پر طعنہ زنی کر رہے ہو، ان سے پہلے تم ان کے والد کی سالاری پر بھی طعنہ زنی کر چکے ہو، حالانکہ اللہ کی قسم! وہ سپہ سالاری کے اہل تھے۔ اور میرے نزدیک محبوب ترین لوگوں میں سے تھے۔ ان کے بعد اسامہ بھی میرے نزدیک محبوب ترین لوگوں میں سے ہے اور تمہارے بہترین آدمیوں میں سے ہے...... چنانچہ یہ لشکر روانہ ہوا۔ اور مدینہ سے تین میل دور جرف کے مقام پر خیمہ زن ہو گیا۔ اللہ کے رسول ﷺ کی بیماری کے سلسلے میں تشویش ناک خبریں آ رہی تھیں، اس لیے یہ لشکر آگے نہ بڑھ سکا۔ یہ اللہ کا فیصلہ تھا کہ یہ لشکر حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے دور خلافت کی پہلی فوجی مہم قرار پائے۔ اس وقت مدینہ منورہ

کے حالات بڑے دگرگوں تھے۔ بدو مدینہ پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ وہ مرتد ہو چکے تھے اور مدینہ پر چڑھائی کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ان حالات میں مدینہ کی حفاظت کے لیے لشکر کی موجودگی نہایت ضروری تھی مگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اس لشکر کو اس کی مہم پر روانہ کرنے کا اٹل فیصلہ کر چکے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اللہ کی قسم! میں وہ جھنڈا نہیں کھولوں گا جسے رسول اللہ ﷺ نے باندھا ہے۔ چاہے ہمیں درندے مدینہ سے اچک لیں تب بھی میں اسامہ کا لشکر ضرور بھیجوں گا اور مدینہ کے اردگرد کے محافظوں کو حکم دوں گا کہ وہ اس کی حفاظت کریں۔

لشکر بھیجنے کے نتائج نہایت ایمان افروز اور مسرت بخش نکلے۔ لشکر اسامہ کے فوجی جس قبیلے کے پاس سے گزرتے، وہ ان سے خوفزدہ ہو جاتا۔ لوگ کہتے: ارے! مسلمانوں کے پاس تو بہت بڑی فوجی قوت اور لڑاکا جتھے ہیں۔ اسی لیے تو یہ نکلے ہیں ورنہ موجودہ حالات میں کیسے ممکن تھا کہ وہ لشکر باہر بھیجتے۔ بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی کہ اسامہ ابھی نوعمر ہیں، لہٰذا ان کے بجائے کسی تجربہ کار شخصیت کو لشکر کا سپہ سالار بنایا جائے۔ اس تجویز کے محرکین میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ اب اس محبّ رسول ﷺ اور مسلمانوں کے خلیفۂ اول کا جواب سُنیے۔ آپ نے فرمایا: اے عمر! آپ کو کیا ہو گیا ہے، کیا میں اللہ کے رسول ﷺ کے مقرر کردہ امیر کو معزول کر کے کسی اور کو امیر بنا دوں؟ میں ایسا ہرگز نہ کروں گا...... پھر مدینہ کے باسیوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ حضرت ابوبکر صدیق بنفسِ نفیس مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے، مقام ''جرف'' پہنچے، لشکر اسامہ کا معاینہ کیا اور اسے الوداع کہا۔

ماضی کا غُبار ہٹا کر ذرا چشم تصور سے دیکھیے، حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما گھوڑے پر سوار

ہیں، خلیفۃ المسلمین پیدل ہیں اور ان کے گھوڑے کے ساتھ ساتھ ہموار قدموں سے آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ اسامہ ؓ نے عرض کیا: اے خلیفۃ الرسول! یا تو آپ بھی سوار ہو جائیں ورنہ میں اتر پڑتا ہوں۔ فرمایا: اللہ کی قسم! نہ تُم اُترو گے، نہ میں سوار ہوں گا۔ اسامہ ؓ ادب کے تقاضے کے زیرِ اثر گھوڑے سے نیچے اترنا چاہتے تھے۔ لیکن ادھر ابوبکر صدیق ؓ کو رسول اللہ ﷺ کے مقرر کردہ امیر لشکر کی عظمت و منزلت کا پورا پاس و لحاظ تھا۔ آپ نے حضرت اسامہ ؓ سے کہا: اے امیر! اگر اجازت ہو تو میں عمر فاروق ؓ کو مدینہ ہی میں روک لوں کہ اُمور خلافت چلانے کے سلسلے میں ان سے مشورے کی ضرورت پیش آئے گی۔ حضرت اسامہ نے نہایت خوش دلی سے اس کی اجازت دے دی......۔

اس طرح صدیق اکبر ؓ کے دور خلافت کا سب سے پہلا لشکر حضرت اسامہ بن زید ؓ کی قیادت میں روانہ ہوا اور اسلام کا پھریرا لہراتے ہوئے ان علاقوں سے گزرا جو روم کے تابع تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ مسلمان اپنے کمانڈروں کے شہید ہونے کے بعد دوبارہ بلقان میں قدم رکھیں گے مگر حضرت اسامہ ؓ اپنے لشکرِ جرار کے ساتھ ان علاقوں کو روندتے ہوئے باطل کا سر کچلنے آ پہنچے۔ اہلِ باطل پر مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی۔ وہ اس علاقے میں ایک ماہ کے لگ بھگ قیام پذیر رہے۔ ایک طرف ان کی تیغِ بے دریغ چمک رہی تھی اور دوسری طرف وہ اپنے قول و عمل سے دینِ حنیف کی تعلیماتِ عالیہ کو نمایاں کرتے رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فضا ہی بدل گئی جن قبائلیوں کے دماغ میں بغاوت کے کیڑے رینگ رہے تھے۔ وہ آمادۂ اطاعت ہوگئے۔ بہت سے سرکش قبائل نے صلح کر لی جو لوگ مرتد ہوگئے تھے، وہ از سر نو مسلمان ہوگئے۔ دُور دُور تک مسلمانوں کا رعب اور دبدبہ قائم ہوگیا۔ کل تک جو لوگ مدینہ پر چڑھائی کے مذموم منصوبے بنا رہے تھے، اب

وہ یہ ماننے پر مجبور ہو گئے کہ مسلمانوں کی طاقت برقرار ہے، اس میں کوئی کمزوری نہیں آئی۔ لشکرِ اسامہ کم وبیش دو ماہ مدینہ سے باہر رہ کر فتح مندی کے پھریرے لہراتا ہوا واپس آیا۔

ادھر حضرت ابوبکر صدیق ؓ مدینہ طیبہ کے گرد و نواح میں بدووں کی طرف متوجہ ہوئے۔ ذبیان کے قبائل مدینہ پر چڑھائی کی تیاری کر رہے تھے کہ حضرت ابوبکر ؓ اور ان کے ساتھی بجلی کی طرح ان پر کوندے اور ذِی حُسیٰ نامی مقام پر جا پہنچے۔ وہاں بنو مرہ آباد تھے۔ ان سے مقابلہ ہوا۔ دشمن بھاگ گیا اور اس کی قوت منتشر ہو گئی۔ سیدنا ابوبکر صدیق ؓ ساتھیوں سمیت آگے بڑھے۔ حبال بن طلیحہ کو قتل کر دیا گیا۔ اب مسلمان ذو القَصَّہ نامی مقام پر پہنچے۔ بنو ذبیان اپنے اردگرد مقیم مسلمانوں کو چن چن کر قتل کر رہے تھے۔ مجاہدین اسلام نے یلغار کی تو انھوں نے ان کے سامنے جانوروں کی کھالیں ڈال دیں۔ یہ ایک پرانا حربہ تھا کہ گھوڑوں کے سامنے جانوروں کی کھالیں ڈال دی جائیں تو وہ ڈر کر بھاگ جاتے ہیں، چنانچہ گھوڑے بدکنے لگے۔ بعض مجاہدین اپنے ہی گھوڑوں تلے روندے گئے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد فرمائی۔ دشمن پر غلبہ عطا فرمایا اور مسلمان فتح و نصرت سے ہمکنار ہو کر مدینہ واپس آئے۔ مسلمانوں کے جانی نقصان پر حضرت ابوبکر صدیق ؓ بڑے دل گرفتہ تھے۔ آپ نے قسم کھائی کہ ایک ایک مسلمان کے بدلے دو دو مشرکین کو قتل کروں گا، پھر وہ وقت آ گیا کہ بدووں کی قوت ہمیشہ کے لیے پاش پاش ہو گئی۔ مدینہ طیبہ اور اس کے گرد و نواح میں مکمل امن قائم ہو گیا۔ اب صدیق اکبر ؓ دیگر مرتدین اور منکرینِ زکاۃ کی سرکوبی کی طرف متوجہ ہوئے۔

حضرت عمر خلیفۃ الرسول کی خدمت میں پھر حاضر ہوئے اور عرض کیا: ان لوگوں کے بارے میں ذرا توقف کرنا چاہیے۔ آخر جو لوگ نماز پڑھتے ہیں، ہم ان سے لڑائی کیسے کر

سکتے ہیں؟ جبکہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ مجھے لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے حتی کہ وہ گواہی دے دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ جب وہ یہ گواہی دے دیں گے تو وہ اپنے خون اور اموال مجھ سے محفوظ کر لیں گے، سوائے اس کے کہ حق ان کے لینے کا تقاضا کرتا ہو...... اِس بات پر صدیق اکبر ؓ نے حضرت عمر فاروق ؓ کو ٹوک دیا اور فرمایا: جَبَّارٌ فِي الْجَاهِلِيَّةِ، خَوَّارٌ فِي الإِسْلَامِ ''جب تم جاہلیت میں تھے تب تو بڑے سخت اور جابر تھے اور اب مسلمان ہو کر بزدل ہو گئے ہو۔'' مجھے تو یہ اُمید تھی کہ تم میری مدد کرو گے مگر تم ان کے لیے معافی کے طلب گار بن کر آ گئے ہو۔ اللہ کی قسم! اگر وہ لوگ ایک رسی جو اللہ کے رسول ﷺ کو ادا کرتے تھے، دینے سے بھی انکار کریں گے تب بھی میں ان سے ڈٹ کر جنگ کروں گا۔ ایک مرتبہ فرمایا: اللہ کی قسم! جو نماز اور زکاۃ میں فرق کرے گا، میں اس سے جنگ کروں گا۔ اس ارشاد سے آپ کا مطلب یہ تھا کہ اگر ایک شخص نماز تو پڑھتا ہے مگر زکاۃ ادا نہیں کرتا تو ابوبکر ؓ کے نزدیک وہ کافر ہے اور وہ اس سے بزورِ شمشیر زکاۃ وصول کریں گے۔

بعض صحابہ کا موقف تھا کہ جو لوگ زکاۃ دینے سے انکار کر رہے ہیں، انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور ان سے دوستی بڑھائی جائے تا کہ ایمان ان کے دلوں میں اچھی طرح جاگزیں ہو جائے۔ اس کے بعد وہ خود ہی زکاۃ دینے لگیں گے مگر حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا۔ حضرت عمر فاروق ؓ فرماتے ہیں: میں نے دیکھا کہ منکرینِ زکاۃ سے جنگ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر کو شرحِ صدر سے نواز دیا ہے۔ اب مجھے پتہ چل گیا کہ وہ حق پر ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ ذو القصة جانے کے لیے روانہ ہوئے وہ اپنی اونٹنی پر بیٹھے، تلوار سونتی اور بے دھڑک چل پڑے۔

یک بیک حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے، آپ کی اونٹنی کی مہار پکڑی اور پوچھا: اے خلیفۃ الرسول! کہاں کا ارادہ ہے؟ آپ نے تلوار کیوں سونتی ہے؟ اپنی جان مصیبت میں نہ ڈالیے۔ اللہ کی قسم! اگر ہمیں آپ کے فقدان کا غم جھیلنا پڑا تو آپ کے بعد اسلام کا نظام کبھی قائم نہ رہ سکے گا، چنانچہ حضرت ابوبکر واپس آ گئے اور فوج کو روانہ کر دیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی میں گیارہ امراء کو جھنڈے عطا فرمائے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ یہ حضرات کمانڈر ہیں۔ انھیں مختلف علاقوں میں بھیجا گیا۔ جن امراء کو جھنڈے عطا ہوئے، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

خالد بن ولید، عکرمہ بن ابو جہل، شرحبیل بن حسنہ، مہاجر بن امیہ، خالد بن سعید بن عاص، عمرو بن عاص، حذیفہ بن محصن، طریفہ بن حاجز، سوید بن مقرن، علاء بن حضرمی رضوان اللّٰه عليهم أجمعين.

مدینہ منورہ کے چاروں طرف جہاں جہاں مرتدین اور منکرین زکاۃ سر اُٹھا رہے تھے، وہاں لشکر بھیجے گئے اور الحمدللہ! سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تدابیر سو فیصد کامیاب رہیں۔ تمام امراء کامیاب و کامران ہو کر واپس آئے۔ مسلمانوں کی عزیمت و استقامت کے اِن بے مثل مظاہروں اور شاندار کامیابیوں کے باعث رومی اور ایرانی حکومتوں پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اس طرح مسلمانوں کو ایرانیوں کے خلاف قادسیہ میں اور رومیوں کے خلاف یرموک میں جو فتوحات حاصل ہوئیں ان کا آغاز درحقیقت اِسی دورِ صدیقی سے ہوا جو صرف دو سال اور ایک سو دن کے لیل و نہار تک محدود تھا۔ اس طرح صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے آخر دم تک اپنی حیاتِ مستعار کا ہر لمحہ اسلام کی روشنی کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچانے میں صرف کیا۔

حقیقی طالب علم

محمد بن سعید نے سرائے کے مالک سے کہا کہ اس مسافر کے بارے میں اپنے رب سے ڈرو۔ یہ بہت دور سے سفر کر کے اس ملک میں آیا ہے، اسے سرائے سے مت نکالنا۔ یہ سخت بیمار ہے، غریب الوطن ہے، نہ جانے کتنے صحرا اور دریا عبور کر کے یہاں پہنچا ہے۔ اس کے آنے کا مقصد صرف تحصیلِ علم ہے۔

سرائے کا مالک بولا: اچھا تو بقی بن مَخلَد بہت دور سے یہاں آیا ہے۔ محمد بن سعید نے کہا: ہاں ہاں! بالکل ایسا ہی ہے۔ یہ شخص زیادہ سے زیادہ احترام اور عزت کا مستحق ہے۔ دیکھو! میں نے تم سے کبھی کوئی سوال یا مطالبہ نہیں کیا، بس اس شخص کے بارے میں میری درخواست ہے کہ اسے سرائے سے نہ نکالنا، یہ حدیث کا عالم ہے۔ احوال رجال اور اسناد پر عبور رکھتا ہے۔ کیا ایسے شخص کو بیماری کے عالَم میں بے یار و مددگار چھوڑا جا سکتا ہے۔

مالک کہنے لگا: تمھاری بات درست ہے۔ یہ شخص دو سال سے ہماری سرائے میں مقیم ہے۔ میں نے آج تک اس سے کرایہ طلب نہیں کیا۔ اب یہ سخت بیمار ہے۔ خدشہ ہے کہ اگر یہ وفات پا گیا اور اس کا جنازہ میری سرائے سے نکلا تو لوگ سرائے کو منحوس سمجھیں گے اور اس میں قیام کرنا بند کر دیں گے۔ یوں میں مفلس اور قلاش ہو کر رہ جاؤں گا۔ یہ سخت بیمار ہے۔ کسی وقت بھی اس کی موت واقع ہو سکتی ہے۔ نہ جانے کب آخری سانس لے اور دم توڑ دے۔ وہ وقت کتنا منحوس تھا جب میں نے اسے اپنی سرائے میں جگہ دی تھی۔

محمد بن سعید نے مضطرب لہجے میں کہا: بلاشبہ تمھاری بات اپنی جگہ درست ہے لیکن اگر تمھیں اس شخص کی اہمیت معلوم ہو جائے تو تم سجدہ شکر بجا لاؤ کہ تمھاری سرائے میں کتنا مبارک اور محترم شخص قیام پذیر ہے۔ تم اس کی خدمت کرو، اس کا علاج کراؤ، اس کی تیمارداری کرو، ان شاء اللہ اس کے صلے میں اللہ تعالیٰ سے جنت کے لافانی محل پاؤ گے۔

سرائے کا مالک کہنے لگا: اگر تمھیں اس شخص کی اصلیت معلوم ہو جاتی تو تم مجھے ملامت نہ کرتے، میں اسے خوب جانتا ہوں۔ اگر تم جاننا ہی چاہتے ہو تو سنو! یہ شخص سرائے میں ایک رات ٹھہرا۔ اگلے دن میں نے ایک ناقابل یقین منظر دیکھا۔ اس نے بھیک مانگنے والوں کا روپ دھارا، ہاتھ میں موٹا عصا لیا، بدن پر پھٹے پرانے کپڑے لپیٹے اور پھر مانگنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ میں حیران رہ گیا کہ یہ شخص بھکاری بھی ہو سکتا ہے...... لیکن ابن سعید تم ہنس کیوں رہے ہو؟ تم تو میرا مذاق اڑا رہے ہو...... سرائے کا مالک احتجاج کرنے لگا۔

محمد بن سعید: یقیناً تم اس شخص کی عظمت سے ناواقف ہو۔

مالک: یہ جاننے کے بعد بھی کہ یہ روزانہ گداگری کے لیے نکلتا تھا، تم اس کی عظمت کے گُن گائے جا رہے ہو۔

محمد بن سعید: ہاں...... ہاں! یہ بڑی شان اور عظمت والا شخص ہے۔ تم کیا جانو...... یہ شخص کتنا رفیع و وقیع ہے...... ہاں! اس شخص نے جنتِ ارضی اندلس کو چھوڑا۔ اس کی خوبصورت وادیاں، اس کے باغات، اس کی نہریں، اس کی کھیتیاں، اس کے محلات اور اس کے بہترین موسم سے منہ موڑ کر بغداد آ پہنچا۔ اسے کسی مال و دولت کی تمنا، منصب کی طلب یا کسی کی دوستی اس شہر میں کھینچ کر نہیں لائی۔ یہ محض علومِ حدیث کے حصول کی خاطر یہاں آیا۔ اس کی سب سے بڑی آرزو ابو عبداللہ سے ملاقات تھی۔

سرائے کے مالک نے ابوعبداللہ کا نام سنا تو سناٹے میں آ گیا۔ وہ اس عظیم شخصیت کی عظمت و وجاہت کے تصور میں کھو گیا۔ اس کے دل میں بقی بن مخلد کے بارے میں جو نفرت، بغض اور غلط فہمیاں جگہ پا رہی تھیں، سب یکا یک کافور ہو گئیں۔ ابوعبداللہ کا تو وہ خود بھی شیدائی تھا۔ ان کے علم، فضل، ورع اور تقویٰ کا معترف تھا۔ اس نے بے اختیار پوچھا: کیا واقعی یہ شخص اندلس سے محض ابوعبداللہ احمد بن حنبل سے ملنے آیا ہے؟۔

محمد بن سعید نے جواب دیا: یقیناً یہ بات درست ہے۔

مالک: اچھا پھر تو یہ شخص واقعی بڑا عظیم ہے۔ کیا اس کی ابوعبداللہ سے ملاقات ہو گئی؟ کب ہوئی...... کیسے ہوئی......؟ اس نے اپنا اشتیاق ظاہر کیا۔

محمد بن سعید نے اب اس راز سے پردہ اٹھانا شروع کیا: بقی بن مخلد بغداد پہنچا، تمھاری سرائے میں اترا، اپنا سامان رکھا اور ابوعبداللہ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ وہ دن بڑے کٹھن تھے۔ امام احمد بن حنبل حکومت کے زیرِ عتاب تھے۔ کوئی شخص حکومت کے خوف کے باعث ان سے ملاقات نہ کرتا تھا کہ اگر سرکاری کارندوں کو معلوم ہو گیا کہ اس کے امام احمد بن حنبل سے تعلقات ہیں تو وہ جیل میں بند کر دیا جائے گا۔ اسے سخت ترین سزا ملے گی جو ان کے قریبی ساتھی تھے، وہ پہلے ہی سزا بھگت رہے تھے۔ ابوعبداللہ اپنے گھر میں اکیلے نظر بند تھے، جو بھی ان سے ملنے جاتا سرکاری جاسوس اسے فوراً گرفتار کرا دیتے۔ بقی کو ان حالات کا علم ہوا تو سخت پریشان اور رنجیدہ ہوا، تاہم بغداد کی جامع مسجد کی جانب چل پڑا جہاں حدیث کے بعض حلقے قائم تھے۔ وہ ان حلقوں سے گزرتا ہوا ایک قدرے بڑے حلقۂ درس سے لگ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اس شخص کو پہلی مرتبہ وہیں دیکھا۔ اس کا حلیہ، اس کا لباس اور اس کی شکل یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ یہ اجنبی غریب الدیار ہے۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا، بغداد آمد پر خوشی کا

اظہار کیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ یہ کون محدث ہے جو پڑھا رہا ہے؟ میں نے بتایا کہ یہ یحییٰ بن معین ہیں۔ وہ اُنھیں خوب جانتا تھا، اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ وہ کچھ دیر بیٹھا رہا۔ اس دوران شیخ شاگردوں کے سوالوں کا جواب دیتے رہے۔ لوگ ان سے علمائے حدیث کے بارے میں پوچھ رہے تھے، وہ بتاتے جاتے تھے۔...... کوئی ثقہ ہے، کوئی ضعیف ہے تو کوئی مجہول...... جرح وتعدیل جاری تھی۔ اچانک وہ شیخ سے مخاطب ہوا:

ابو زکریا! اللہ آپ پر اپنے فضل وکرم کی بارش فرمائے! میں غریب الدیار ہوں۔ بڑی دور سے آیا ہوں۔ کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ براہ کرم میرے سوالات کا جواب مرحمت فرمائیں۔ شیخ نے فرمایا: پوچھو کیا پوچھتے ہو؟ اب اس نے بعض علمائے حدیث کے بارے میں سوالات شروع کیے۔ شیخ نے بعض پر جرح اور بعض کی تعدیل فرمائی۔ بعض کو ثقہ اور قوی قرار دیا اور بعض کو ضعیف اور نا قابل اعتبار۔ اب اس نے اپنے استاذ ہشام بن عمار کے بارے میں سوال کیا۔ جواب ملا:

ثِقَةٌ وَّ فَوْقَ الثِّقَةِ لَوْ كَانَ تَحْتَ رِدَائِهٖ كِبْرٌ مَّا ضَرَّهٗ شَيْئًا لِّخَيْرِهٖ وَ فَضْلِهٖ

”ثقہ ہے بلکہ ثقہ سے بھی بڑھ کر ہے حتی کہ اگر اس کے ہاں کسی حد تک استکبار بھی ہو تو اس کی بھلائی اور فضیلت کے باعث اس کے لیے نقصان دہ نہیں ہوگا۔“

شیخ کے شاگردوں نے سائل کی طرف دیکھنا شروع کیا کہ اب دوسرں کی باری ہے، انھیں بھی سوال کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔

اب وہ کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ بس ایک اور شخص احمد بن حنبل کے بارے میں بتا دیں کہ وہ کیسا ہے؟ اس کا سوال کرنا تھا کہ تمام حاضرین ایک دم سناٹے میں آ گئے اور سب کی

توجہ کا رُخ اُس کی طرف پھر گیا۔ شیخ نے جواب میں کچھ پس و پیش کیا مگر جلد ہی ان کا چہرہ نورِ ایمان سے جگمگا اٹھا۔ حاکم کے غیظ و غضب کی پروا کیے بغیر انھوں نے سائل سے کہا:

مِنْ أَيْنَ أَنْتَ أَيُّهَا الرَّجُلُ! نَحْنُ نَكْشِفُ عَنْ أَحْمَدَ بْنِ حَنْبَلٍ

”تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ ہم تمھیں احمد بن حنبل کے بارے میں بتلاتے ہیں۔“

شیخ نے تھوڑی دیر انتظار کیا اور نتائج سے بے پروا ہو کر پورے اعتماد سے کہا:

ذَاكَ إِمَامُ الْمُسْلِمِينَ، وَخَيْرُهُمْ وَ أَفْضَلُهُمْ

”وہ عصر حاضر میں مسلمانوں کے امام ہیں اور ان کے بہترین اور افضل ترین آدمی ہیں۔“

پھر اس نے ابوعبداللہ کے گھر کا پتا پوچھا۔ بعض لوگوں نے اسے حکمرانوں کے عتاب سے ڈرایا کہ ان کے کارندے اس گھر کی مسلسل نگرانی کرتے ہیں۔ کچھ لوگ چند قدم ساتھ چلے، ابوعبداللہ کے گھر کا راستہ بتایا اور اپنی راہ لی۔ اس طرح وہ بالآخر ابوعبداللہ امام احمد بن حنبل کے گھر پہنچ گیا۔

کیا واقعی ان ایامِ ابتلا میں یہ شخص ابوعبداللہ کے گھر پہنچ گیا؟ سرائے کے مالک نے حیرانی سے پوچھا:

محمد بن سعید نے جواب دیا: ہاں، پھر اس نے دروازہ کھٹکھٹایا، ابوعبداللہ نے دروازہ کھولا تو کہنے لگا:

امام صاحب! میں بہت لمبا سفر طے کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

ابوعبداللہ نے کہا: مرحبا! تم کس ملک سے آئے ہو؟

سائل: ”مغرب اقصیٰ“ سے۔

ابوعبداللہ: ”افریقہ سے؟“

سائل: نہیں، افریقہ سے بھی زیادہ دور سے، افریقہ سے میرے ملک تک جانے کے لیے بحری جہاز میں سوار ہونا پڑتا ہے۔ میں اندلس سے آیا ہوں۔

ابوعبداللہ: بلاشبہ یہ بہت دور کا سفر ہے۔ تم نے بڑی مشقت جھیلی مگر تم نے اتنا لمبا سفر کس لیے کیا؟

سائل: میں آپ سے حدیث کی سماعت کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ آپ کی شاگردی کا شرف حاصل کرنے کا آرزومند ہوں تاکہ آپ سے حدیث پڑھوں اور آگے لوگوں تک پہنچا سکوں۔

ابوعبداللہ: تم میرے حالات سے واقف ہو چکے ہو گے۔ میں کسی سے ملتا ہوں نہ کسی کے پاس جاتا ہوں، نہ کسی کو بلواتا ہوں۔ اگر تم مجھ سے پڑھنے آؤ گے تو میں تمھاری سلامتی کی ضمانت نہیں دے سکتا۔

سائل: امام محترم! اس مقدس راہ میں چاہے کتنی ہی تکلیف جھیلنی پڑے، خوشی سے منظور ہے۔ بڑے سے بڑا عذاب بھی میری راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتا۔

ابوعبداللہ: اگر حکومت کے کارندوں نے زبردستی روک دیا تو پھر کیا کرو گے؟

سائل: میں ایک حیلہ اختیار کرتا ہوں۔ میں بھکاری کے بھیس میں دروازے پر آؤں گا اور صدا لگاؤں گا: اَلْأَجْرُ یَرْحَمُكَ اللّٰهُ ”اللہ آپ پر رحم فرمائے کچھ دیجیے۔“ کیا آپ اس صورت میں مجھ پر اپنا دروازہ کھول دیں گے اور حدیث بیان کر دیں گے۔

ابوعبداللہ: درست ہے مگر ایسا کرنا کہ کسی بھی علمی حلقے میں شمولیت نہ کرنا۔ ایسا نہ ہو کہ لوگ تمھیں پہچان جائیں۔

سائل نے یقین دلایا: حضرت! میرا وعدہ ہے، میں کسی حلقے میں نہیں جاؤں گا۔

پھر اس نے اپنا حلیہ گداگروں جیسا بنا لیا۔ اسی حلیے میں وہ روزانہ ان کے گھر جاتا تھا۔ تم یہ گمان کرتے رہے کہ یہ لوگوں سے خیرات مانگنے جاتا ہے، وہ درحقیقت خیرات نہیں بلکہ علم حدیث کی متاعِ گراں مایہ حاصل کرنے جاتا تھا۔

یہ سن کر سرائے کے مالک نے سر جھکا دیا۔ آج اس کی نگاہوں میں یہ شخص نہایت معزز اور مکرم تھا کیونکہ وہ امام احمد بن حنبل کے شاگردوں میں سے تھا۔ وقت گزرتا رہا...... مشکلات اور پریشانیوں کا دور ختم ہو گیا۔ اب خلافت کی باگ ڈور معتصم کے ہاتھ سے نکل کر متوکل کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس نے اہل سنت والجماعت کے مسلک کو دوبارہ زندہ کیا۔ شرکیات و بدعات کا خاتمہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے امام احمد کے صبر و استقامت کو شرفِ قبولیت بخشا۔ وہ بلاشبہ امام اہل سنت تھے۔ حدیث کے اسباق جاری ہوئے۔ ان کے فتاوی کو تسلیم کیا گیا۔ اور بقی بن مخلد کے بارے میں لوگوں نے گواہی دی کہ یہ عالی ہمت شخص حقیقی طالب علم ہے۔

سرائے کے مالک نے کہا: جزاك الله اے ابن سعید! تم نے میری آنکھوں سے لاعلمی، نادانی اور کورپن کے پردے اُٹھا دیے ہیں۔ چلو اب اس مقدس طالب علم سے ملتے ہیں۔

بقی بن مخلد اندلسی اپنے کمرے میں اکیلا لیٹا ہوا تھا۔ بیماری کی وجہ سے وہ ناتواں ہو چکا تھا۔ اس کے اردگرد کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ سرائے کا مالک اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس کا دل لبھانے لگا۔ اچانک اس کی نظر کمرے کی کھڑکی سے باہر کے منظر پر پڑی۔ حد نگاہ تک بازار سنسان نظر آیا۔ وہ اس صورتحال پر غور کرنے لگا اور سوچنے لگا کہ لوگوں کو کیا ہو گیا؟ یہ بازار بند کیوں ہے؟ ابھی اسی فکر میں تھا کہ اچانک اس کی سرائے قدموں کی

دھمک سے گونجنے لگی۔ وہ آ رہے ہیں۔ بس یہاں پہنچنے ہی والے ہیں...... اس نے خیال کیا، شاید خلیفہ کی سواری آ رہی ہے۔ ایک مرتبہ اس نے شاہی سواری دیکھی تھی۔ اُس وقت لوگوں نے اس کے لیے بازار خالی کر دیا تھا۔

اس نے لوگوں سے پوچھا کہ کون آ رہا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ ابو عبداللہ احمد بن حنبل تشریف لا رہے ہیں۔ وہ احمد بن حنبل جو خلفاء و امراء کے محلات کو لائق توجہ نہیں سمجھتے مگر وہ اس سرائے میں مقیم ایک مریض کی تیمارداری کے لیے آ رہے ہیں۔

ابو عبداللہ میری سرائے میں آ رہے ہیں، اس نے خوشی سے بے قابو ہو کر چیخنا چاہا مگر اس کی آواز اس کے حلق ہی میں پھنس کر رہ گئی۔ اسی اثنا میں امام صاحب آ پہنچے۔ ان کے ساتھ بہت سے شاگرد تھے۔ دنیا کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے حدیث کے طالبِ علم، ہاتھوں میں قلم اور دوات لیے، امام صاحب جو کچھ فرماتے: اُسے معاً لکھ لیتے...... یہ عظیم بغداد تھا جو علم کا مرکز تھا۔ اس کی آبادی اس وقت 20 لاکھ سے زیادہ تھی۔

امام صاحب مریض کے کمرے میں داخل ہوئے۔ اس کے سرہانے کھڑے ہوئے۔ اور ارشاد فرمایا:

يَا أَبَا عَبْدِالرَّحْمٰنِ...... أَبْشِرْ بِثَوَابِ اللّٰهِ، أَعْلَاكَ اللّٰهُ إِلَى الْعَافِيَةِ

”اے ابو عبدالرحمٰن! اللہ کے اجر و ثواب سے خوش ہو جایئے، اللہ آپ کو عافیت اور صحت عطا فرمائے۔“

پھر انھوں نے اس کے چہرے پر اپنا دستِ مبارک پھیرا۔ اس کے لیے صحت کی دعا فرمائی۔ کچھ دیر اس کے پاس ٹھہرے اور واپس تشریف لے گئے۔

معلوم نہیں اس واقعے پر ماہ وسال کی کتنی گردشیں بیت گئیں لیکن یہ واقعہ لوگوں کے حافظے میں ہمیشہ جگمگاتا رہا۔ وہ اِس یادگار دن کا اپنی مجالس میں چرچا کرتے رہے اور بتاتے رہے کہ فلاں دن اِس سرائے میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنے غریب الدیار شاگرد کی تیمارداری کی تھی۔ اس دن سے یہ سرائے عام لوگوں کی، علماء کی اور طالبانِ علم کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ لوگ اس سرائے میں بڑے شوق اور احترام سے ٹھہرتے، اللہ رب العزت نے اس سرائے کے مالک کو برکت عطا فرمائی اور اُس کا رزق بہت فراخ ہو گیا۔

بقی بن مخلد اندلسی شفایاب ہو کر اپنے وطن واپس جا چکا تھا اور اس نے بڑی محنت اور اخلاص سے علم کے چراغ روشن کر کے اس سرزمین کو چار چاند لگا دیے تھے۔

امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں بقی بن مخلد کا ایک یادگار قول نقل کیا ہے۔ انھوں نے فرمایا: میں نے سرزمین اندلس میں اہل حدیث کا پودا لگا دیا ہے جسے خروج دجال سے پہلے کوئی نہیں اکھاڑ سکے گا۔[1]

---

[1] اس مضمون کی تیاری میں قصص من التاریخ اور سیر أعلام النبلاء سے استفادہ کیا گیا ہے۔

حق بحقدار رسد

علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ اپنی معروف تالیف "کتاب الأذکیاء" میں لکھتے ہیں:

مجھے اطلاع پہنچی کہ ایک آدمی خراسان سے بغداد آیا۔ وہ حج کے لیے مکہ جا رہا تھا۔ اس کے پاس تقریباً ہزار دینار کی قیمت کے مساوی موتیوں کا ایک ہار تھا۔ اس نے ہار فروخت کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا، چنانچہ وہ ایک عطر فروش کے پاس پہنچا۔ اُس کی شہرت اچھی تھی۔ اس کے پاس اپنا موتیوں کا ہار امانت رکھ دیا اور حج کے لیے روانہ ہو گیا۔

حج سے واپس ہوا تو اس نے عطر فروش کے لیے تحفے تحائف خریدے اور اس کی خدمت میں پہنچ کر تحائف پیش کیے اور اپنے ہار کا تقاضا کیا۔ عطار کہنے لگا: تو کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟

خراسانی حاجی کہنے لگا:

أَنَا صَاحِبُ الْعِقْدِ الَّذِي أَوْدَعْتُكَ

"میں ہی اس ہار کا مالک ہوں جسے میں نے (حج پر جاتے ہوئے) آپ کے پاس بطورِ امانت رکھا تھا۔"

عطار نے حاجی کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ اُسے بری طرح دھکے مار کر دکان سے نکال دیا اور کہنے لگا: تو مجھ پر بہتان تراشی کر رہا ہے۔

خراسانی نے شور مچایا۔ ان کا جھگڑا دیکھ کر لوگ جمع ہو گئے۔ حاضرین حاجی سے کہنے

لگے: تم اس عطار کے بارے میں یہ کیسی غلط سلط باتیں کر رہے ہو۔ یہ تو اس علاقے کا نہایت مشہور اور اچھا آدمی ہے۔ بھلا یہ تمھارے ساتھ ایسا دھوکا کیسے کر سکتا ہے؟

لوگوں کی زبانی عطار کے بارے میں یہ کلمات سن کر حاجی کو حیرت ہوئی۔ وہ اب بھی رہ رہ کر عطار سے اپنی امانت کا تقاضا کر رہا تھا مگر عطار اسے مسلسل گالیاں دیے جا رہا تھا۔ کچھ لوگوں نے حاجی کو مشورہ دیا کہ اگر تم اس جھگڑے کا حل چاہتے ہو تو خلیفۃ المسلمین عضد الدولہ [1] کے دربار میں چلے جاؤ۔ اپنا مقدمہ پیش کرو اور ان سے مدد طلب کرو، عین ممکن ہے تمھاری پریشانی کا کوئی حل نکل آئے۔

حاجی نے لوگوں کے مشورے کے مطابق اپنی پوری داستان ایک کاغذ پر لکھ لی اور اسے ایک لمبی لکڑی پر لٹکا کر عضد الدولہ کے دربار جا پہنچا۔ اسے دیکھتے ہی عضد الدولہ نے قریب بلوایا اور پوچھا: تمھارا کیا مسئلہ ہے؟

حاجی نے درخواست پیش کی اور زبانی طور پر بھی پوری داستان سنا دی۔

عضد الدولہ نے حاجی سے کہا:

"اِذْهَبْ إِلَى الْعَطَّارِ غَدًا، وَاقْعُدْ عَلٰى دُكَّانِہٖ

---

[1] یہ عضد الدولہ بُویہی ہے۔ اس کا نام فنَّا خسرو بن حسن ہے۔ اس کا لقب عضد الدولہ ہے۔ اس کی ولادت 324 ہجری میں اور وفات بغداد میں 372 ہجری میں ہوئی۔ سلطنتِ عباسیہ کے عہد میں عراق پر قبضہ کرنے والوں میں اس کا بھی نام آتا ہے۔ وہ ایران، موصل اور پھر بلادِ جزیرہ کا حاکم رہا۔ یہی وہ پہلا شخص ہے جسے اسلامی تاریخ میں شہنشاہ کا لقب ملا۔ یہ بہت رعب ودبدبے والا حکمران تھا۔ تعمیراتی کاموں کا بڑا شوقین تھا۔ اس نے اپنے نام سے ایک بڑا ہسپتال بنوایا تھا۔ بڑی بڑی بلڈنگیں اور پل تعمیر کرائے تھے اور مدینہ منورہ کے اردگرد ایک مضبوط دیوار بھی چنوائی تھی۔ (دیکھیے: الأعلام: 156/5، والكامل في التاريخ لابن الأثير، وسير أعلام النبلاء، وتاريخ ابن خلكان، والبداية والنهاية)

''کوئی بات نہیں، تم کل عطار کی دکان کے پاس جا کر بیٹھ جانا۔''

مزید برآں عضدالدولہ نے کہا:

''اگر عطار تمھیں اپنی دکان کے پاس بیٹھنے سے روکے، تب بھی اس سے کوئی احتجاج یا جھگڑا کرنے کی ضرورت نہیں، ایسی صورت میں سامنے کی کسی دکان کے پاس جا بیٹھنا۔ صبح سے مغرب تک چُپ چاپ بیٹھے رہنا۔ اس سلسلے میں کسی سے کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ تین دن تک اسی طرح کرنا جس طرح میں بتا رہا ہوں۔ چوتھے روز میرا وہاں سے گزر ہوگا تو میں تمھارے پاس چند لمحے کھڑا ہوں گا اور تمھیں سلام کروں گا۔ اس موقع پر تم اپنی جگہ سے کھڑے نہ ہونا، نہ میرے سلام کے جواب سے زیادہ کوئی بات کرنا۔ جب میں وہاں سے گزر جاؤں تو عطار کے پاس جانا اور اپنے ہار کا تقاضا کرنا۔ اب کی بار وہ تم سے جو کچھ بھی کہے، مجھے آ کر بتانا۔ اگر وہ ہار واپس کر دے تب بھی میرے پاس آنا اور مجھے مطلع کرنا۔''

اگلے روز خراسانی عطار کی دکان پر جا کر بیٹھ گیا، کسی سے کوئی بات نہ کی۔ خلیفہ کی ہدایت کے مطابق وہ متواتر تین دن بیٹھا رہا، چوتھے دن عضدالدولہ اپنی عظیم الشان سواری پر لاؤ لشکر کے ساتھ وہاں سے گزرا۔ خراسانی کو دیکھا تو سواری روک لی اور پکار کر کہا: خراسانی بھائی! السلام علیکم۔

خراسانی بدستور بیٹھا رہا اور صرف ''وعلیکم السلام'' کہہ کر چُپ ہوگیا۔

عضدالدولہ نے کہا:

''يَا أَخِي! تَقَدَّمْ فَلَا تَأْتِي إِلَيْنَا وَلَا تَعْرِضْ حَوَائِجَكَ عَلَيْنَا

"خراسانی بھائی! آؤ، آخر ہمارے پاس کیوں نہیں آتے اور اپنی ضروریات کیوں نہیں بتاتے؟"

عضد الدولہ نے انتہائی اصرار کے ساتھ اس سے اس کی ضروریات پوچھیں مگر اس نے کوئی بات نہیں کی، بدستور خاموش رہا۔ اس دوران عضد الدولہ کا پورا لشکر بھی وہاں کھڑا رہا۔ ادھر عطار کی حالت غیر ہوگئی، مارے دہشت کے اس پر غشی طاری ہونے لگی۔ عضد الدولہ وہاں سے چلا گیا تو عطار فورًا حاجی کے قریب آیا اور کہنے لگا:

وَيْحَكَ! مَتٰى أَوْدَعْتَنِي هٰذَا الْعِقْدَ، وَفِي أَيِّ شَيْءٍ كَانَ مَلْفُوفًا، فَذَكِّرْنِي لَعَلِّي أَذْكُرُهُ

"تیرا ناس ہو! تو نے اپنا ہار میرے پاس کب اور کس چیز میں بطورِ امانت رکھا تھا، ذرا اس کی نشاندہی تو کر، شاید مجھے یاد آجائے۔"

حاجی نے اسے نشانیاں بتائیں، تھیلی اس شکل کی تھی اور رنگ ایسا تھا۔ عطار دکان کے اندر گیا اور اس کا ہار لاکر دیتے ہوئے کہنے لگا: اگر تو مجھے اس کی نشانیاں نہ بتاتا تو شاید مجھے یہ ہار نہیں مل سکتا تھا۔

حاجی نے ہار لے لیا اور اپنے دل میں کہنے لگا: بھلا اب مجھے عضد الدولہ کے دربار میں حاضر ہونے کا کیا فائدہ؟ مجھے تو میرا ہار مل ہی گیا ہے، پھر اسے خیال آیا کہ خلیفہ نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں ہار ملنے کے بعد اس سے ضرور ملوں۔ ہوسکتا ہے اسے مجھ سے کوئی کام ہو یا وہ مجھ سے ہار خرید لے، چنانچہ وہ ہار لے کر عضد الدولہ کے دربار میں حاضر ہوا۔

عضد الدولہ نے خراسانی کو دیکھا تو ایک سپاہی کو حکم دیا کہ اس عطار کو گرفتار کرکے فورًا دربار میں پیش کرو۔ تھوڑی دیر کے بعد عطار وہاں موجود تھا۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ اس بدبخت

نے خیانت کی ہے، اس کی سزا یہ ہے کہ ہار اس کے گلے میں ڈال دیا جائے، پھر اس کی دکان کے سامنے اسے سرعام پھانسی دی جائے تاکہ یہ عبرت کا نشان بن جائے، چنانچہ خراسانی سے ہار لے کر اسے عطار کی گردن میں ڈالا گیا اور اسے سربازار پھانسی دے دی گئی اور پھر یہ اعلان کیا گیا:

هٰذَا جَزَاءُ مَنِ اسْتُودِعَ فَجَحَدَ

”امانت رکھ کر مکر جانے والے کی یہی سزا ہے۔“

غروبِ آفتاب کے وقت دربان نے عطار کی گردن سے ہار نکال کر خراسانی حاجی کے حوالے کر دیا اور کہا: اب تم باطمینان اپنے گھر جا سکتے ہو۔ [1]

---

[1] یہ واقعہ ابن جوزی کی ”کتاب الأذکیاء“ صفحہ 90,89 سے معمولی تصرف کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔

کسریٰ پر عربوں کی پہلی جیت

ایران کا شہنشاہ کسریٰ بن ہرمز عربوں کا بے تاج بادشاہ بنا ہوا تھا۔ اس نے عرب کے مختلف علاقوں میں اپنے گورنر مقرر کر رکھے تھے جو کسری کے پولیٹکل ایجنٹ کے طور پر کام کرتے تھے۔ وہ اپنے علاقوں میں امن و امان قائم رکھتے اور کسریٰ کا سکہ چلاتے تھے۔ حیرہ شہر کا حاکم، جو آج کل عراق میں واقع ہے، نعمان بن منذر تھا۔ اس کا تعلق لخم قبیلہ سے تھا جو مشہور قحطانی قبیلے کی ایک شاخ ہے۔ نعمان بڑا بدصورت اور پست قد آدمی تھا۔ اس کا پیٹ بڑھا ہوا تھا مگر نہایت ذہین و فطین، دانا اور قوی شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے عربوں کو کسری کی اطاعت پر مجبور کر رکھا تھا اگرچہ متذکرہ صورتِ حال عربوں کے نزدیک نہایت مکروہ تھی مگر نعمان کی بہادری، جواں مردی اور کسری کا معتمد ہونے کی وجہ سے عرب اس سے خوف زدہ بھی رہتے اور اس کے شر سے بچنے کے لیے بظاہر اس کی عزت بھی کرتے تھے۔ اقتدار کے نشے میں چور نعمان بن منذر عجیب و غریب عادات و صفات کا حامل تھا۔ اس کے ہاں دو دن مروج تھے۔

ایک دن جسے وہ سعادت اور خوش بختی کے نام سے موسوم کرتا تھا۔ اس دن جو شخص اسے سب سے پہلے ملتا، وہ اسے مال و دولت سے نوازتا اور دوسرا دن نحوست کا تھا، اُس دن جو شخص سب سے پہلے اسے نظر آتا یا ملاقات کرتا تو اسے قتل کرا دیتا۔ گویا وہ اپنے آپ کو لوگوں کی زندگی اور موت کا مالک و مختار سمجھ بیٹھا تھا۔ اس رذیل خصلت کو اسلام نے ہمیشہ

کے لیے ختم کر دیا اور اِس حقیقت کا ببانگ دہل اعلان کر دیا کہ اقتدار کا اصل مالک صرف اللہ رب العزت ہے اور حاکمیتِ اعلیٰ بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے۔ بادشاہی سدا کسی کے پاس رہی ہے نہ رہے گی۔ کسری کی طاقت سے ٹکر لینے کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اور کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ اسے بھی کوئی شکست دے سکتا ہے، بلاشبہ یہ زمانۂ جاہلیت کی سپر پاور تھی۔

ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ کسری کی فوجوں اور عربوں کے درمیان جنگ ہوئی جس میں پہلی مرتبہ عربوں نے ایرانیوں پر فتح حاصل کی۔ بلاشبہ یہ تمام عربوں کے لیے قابلِ فخر بات تھی۔ کسری کی فوجوں کو قبائل بکر کے سالار ہانی بن مسعود شیبانی کے ہاتھوں شکست اٹھانا پڑی۔ یہ تاریخی معرکہ نہایت دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا اسبق آموز بھی ہے۔

کسری بن ہرمزا اپنے تخت پر بیٹھا گفتگو میں مصروف تھا۔ اردگرد اس کے وزراء، امراء اور دیگر حاشیہ نشین بھی موجود تھے۔ ان لوگوں میں ایک عربی شخص بھی تھا۔ اس کا نام زید بن عدی تھا۔ اس مجلس میں گفتگو کا رخ عرب عورتوں کے حسن و جمال کی طرف مڑ گیا۔ درباریوں نے عرب عورتوں کے حسن کی خوب خوب تعریف کی۔ کسری نے اس پر بڑی شادمانی اور پسندیدگی کا اظہار کیا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر زید کہنے لگا: شہنشاہ کی سلامتی ہو! آپ کو عرب عورتیں اس قدر پسند ہیں تو اپنے خادم نعمان بن منذر کو پیغام بھیجیں۔ اس کے پاس بیس سے زیادہ اس کی اپنی بیٹیاں، بھتیجیاں اور بھانجیاں موجود ہیں۔ یہ عرب کی حسین ترین دوشیزائیں ہیں۔ اگر آپ یا آپ کی اولاد ان سے شادی کرلے تو یہ نعمان کے لیے نہایت فخر اور شرف کی بات ہوگی۔ آپ اپنے کسی معتمد کے ہاتھ پیغام بھیجیں کہ وہ فوری طور پر ان دوشیزاؤں کو آپ کے حضور بھجوا دے۔ کسری اپنی تعریف سن کر بڑا خوش ہوا۔ اس نے اپنے

درباریوں کی طرف نظر دوڑائی اور یہ جائزہ لیا کہ اس کام کے لیے کون سا شخص موزوں ہے، پھر اس کی نظر زید بن عدی ہی پر پڑی۔ اُس نے زید بن عدی سے کہا: میری رائے میں اس مہم کے لیے تم سے بہتر کوئی شخص نہیں۔ تم میرا پیغام لے کر فوراً نعمان کے پاس چلے جاؤ۔ تمھارے لیے گھوڑوں اور زاد راہ کا بھر پور بندوبست کیا جائے گا۔ ایک فوجی دستہ بھی تمھارے ساتھ ہوگا تاکہ تمھیں راستے میں کوئی پریشانی نہ ہو۔ یہ فوجی دستہ واپسی پر ان خوبصورت دوشیزاؤں کی حفاظت کا بھی ذمہ دار ہوگا۔ زید بن عدی نعمان بن منذر سے نفرت کرتا تھا مگر اسے شہنشاہ ایران کا حکم مانے بغیر چارہ نہ تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ کسی طرح کسریٰ کی نظروں میں نعمان کی قدر و منزلت گھٹ جائے۔

چند ہی دنوں میں شاہی دستہ پورے کروفر کے ساتھ حیرہ جا پہنچا۔ نعمان کو کسریٰ کا پیغام پہنچا دیا گیا۔ اسے عورتوں کی صفات سے آگاہ کیا گیا اور مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنی بیٹیاں اور بھتیجیاں دلہن بنا کر اس دستے کے ساتھ روانہ کر دے۔

زید بن عدی نے کہا: کسریٰ نے اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے تم سے رشتہ مانگ کر تمھاری عزت اور وقار میں اضافہ کیا ہے۔ نعمان نے بڑی تفصیل سے ان صفات کا مطالعہ کیا جو پیغام میں درج تھیں، اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کسریٰ اس سے اس کی بیٹیاں مانگے گا۔ اسے غصہ تو بہت آیا مگر وہ سمجھدار تھا، اس نے زید سے کہا: کسریٰ کو میرا سلام پہنچا دو اور کہو کہ آپ نے جن صفات سے متصف دوشیزاؤں کا مطالبہ کیا ہے، وہ ہمارے ہاں نہیں ہیں۔ میری طرف سے معذرت کرنا اور بتانا کہ میں نے مندرجہ صفات کی عورتیں تلاش کرنے کی پوری کوشش کی ہے مگر کسی کو بھی اس عظیم شرف کا مستحق نہیں پایا۔

زید بن عدی کسریٰ کے پاس ناکام واپس آیا۔ وہ پہلے ہی نعمان کا حاسد تھا، اب اسے

اپنے بغض باطن کو بروئے کار لانے کا موقع میسر آ گیا۔ نعمان نے تو اس کے ذریعے کہلایا تھا کہ کسری سے کہنا کہ عراق کی خوبصورت حوریں ہی تمھارے لیے کافی ہیں، مگر زید نے ان الفاظ کا ترجمہ ''بقر العراق'' یعنی عراق کی گائیں، کے الفاظ سے کیا۔ کسریٰ کو یہ جواب سن کر بڑا غصہ آیا مگر اس نے اپنا طیش ظاہر نہ ہونے دیا۔ اب اس نے نعمان کو پیغام بھیجا کہ وہ فوری طور پر اس سے ملاقات کے لیے پہنچے۔ نعمان کو کسری کا پیغام ملا تو اسے یقین ہو گیا کہ کسری اسے قتل کرا دے گا۔ اس نے اپنا سامان حرب، سونے چاندی کے زیورات اور گھر کی خواتین کو ساتھ لیا اور بنی شیبان کے سردار ہانی بن مسعود کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے اپنی عزت کی دہائی دی اور اس سے پناہ طلب کی۔ ہانی نے اس کے اہل وعیال کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ اپنی خواتین کو محفوظ پناہ میں دینے کے بعد نعمان کسری کے پاس چلا گیا۔ حسب توقع اس سے نہایت برا سلوک کیا گیا۔ اسے کسری سے ملنے ہی نہ دیا گیا بلکہ ذلیل و رسوا کر کے ایک دور دراز علاقے میں بھجوا دیا گیا۔ اس علاقے میں ان دنوں طاعون پھیلا ہوا تھا۔ نعمان وہاں انتہائی بے بسی کی حالت میں مر گیا۔ ادھر کسری نے حیرہ پر ایاس بن قبیصہ طائی کو اپنا گورنر مقرر کر دیا۔ اسے کسری کی طرف سے پہلا فرمان یہ ملا کہ وہ فوراً ہانی بن مسعود سے رابطہ کرے اور اس سے کہے کہ وہ نعمان کی عورتیں، اسلحہ اور مال و دولت فوری طور پر کسری کے پاس روانہ کر دے۔ ہانی کو کسری کا یہ پیغام ملا تو اس نے اسے مسترد کر دیا اور جواباً کہا: ان عورتوں کو میں نے پناہ دی ہے اور نعمان کا ساز و سامان میرے پاس امانت ہے۔ میں اس میں کسی خیانت کا ہرگز مرتکب نہیں ہو سکتا۔ کسری کے لیے یہ جواب بہت بڑا چیلنج تھا۔ اس نے حکمت سے کام لیا اور ہانی کو پیغام بھیجا کہ تمھیں تین اختیارات ہیں، ان میں سے کوئی ایک قبول کر لو: پہلا یہ کہ جو کچھ تمھارے پاس ہے، وہ میرے حوالے

کر دو۔ دوسرا یہ کہ میری سلطنت سے نکل جاؤ اور تیسرا یہ کہ لڑائی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ ہانی نے اچھی طرح غور و فکر کیا اور لڑائی کا چیلنج قبول کر لیا، پھر اُس نے قبائل بکر اور بنی شیبان، بنو عجل، بنو نمر اور بنو ذہل وغیرہ کو اکٹھا کیا اور لڑائی کی تیاری شروع کر دی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ عرب کسریٰ کے خلاف لڑائی کے لیے تیار ہو رہے تھے، اس لیے ان میں زبردست جوش وخروش پایا جاتا تھا۔ اسلحہ کے ڈھیر جمع کیے گئے۔ شعراء نے اپنی شعلہ بار شاعری سے آگ لگا دی۔ کسریٰ کو اپنے خاص ذرائع سے یہ ساری معلومات مل رہی تھیں۔ اس نے نامور شہسواروں کو طلب کیا۔ اپنے زیر اثر عرب قبائل کو دعوت نامے بھیجے۔ جنگ کے ماہرین اکٹھے ہوئے۔ جنگی منصوبوں پر غور کیا گیا، پھر کسریٰ نے حکم دیا کہ عرب کے مانے ہوئے بہادر قبیلہ ایاد کو ہانی کے قتل کی ذمہ داری سونپی جاتی ہے، اسے زندہ یا مردہ بہر حال ہمارے روبرو پیش کیا جائے۔

ادھر کسریٰ کا لشکر ہانی کی طرف روانہ ہوا، قبیلہ ایاد کے سردار نے ہانی کو پیغام بھیجا: ہم تمھارے مقابلے میں اپنی مرضی کے خلاف لائے جا رہے ہیں۔ ہم مجبور ہیں، لاچار ہیں، تم سے لڑنا نہیں چاہتے۔ اگر تم چاہو تو ہم کسریٰ کی فوج کو چھوڑ کر تمھارے جھنڈے تلے لڑنے کے لیے تیار ہیں۔ ہانی نے جواب بھیجا کہ کسریٰ کی فوج چھوڑنے کی ضرورت نہیں۔ مناسب یہ ہے کہ تم انھی کے ساتھ مل کر ہمارے خلاف لڑتے رہنا اور ہمیں دھکیلتے ہوئے صحرا میں داخل ہو جانا۔ جب کسریٰ کی فوجیں صحرا میں آ جائیں تو پھر ہم اور تم باہم مل جائیں گے اور دشمن کو نیست و نابود کر دیں گے۔ کسریٰ کی فوج آگے بڑھی۔ ایاد کے نوجوان اس کے ہراول دستے میں شامل تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ ہانی اپنی فوج لے کر صحرا میں داخل ہو گیا ہے۔ وہاں دور دور تک پانی تھا نہ کوئی درخت۔ جبکہ ہانی نے اپنی فوج کے لیے پانی کا

وافر انتظام کر رکھا تھا۔

ادھر کسری کی فوج بھی صحرا میں داخل ہوگئی مگر اس کے پاس پیاس بجھانے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کسرٰی کے سپاہی پیاس سے مرنے لگے۔ کسری کے سپہ سالار نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ ایک دم دشمن پر ٹوٹ پڑو۔ معرکہ عروج پر پہنچا تو ایاد کی فوج نے راہِ فرار اختیار کی اور اپنے اردگرد موجود کسری کی فوج کو گھیرے میں لینا شروع کر دیا۔ بس اب کیا تھا کسری کی فوج آگے اور پیچھے سے گھیرے میں آ گئی۔ یوں دشمن کے بے شمار فوجی قتل ہوئے، بہت سے فوجی صحرا میں زخمی حالت میں بے یار و مددگار سسکنے لگے۔ کسری نے ایک سپیشل دستہ ہانی کو زندہ گرفتار کرنے کے لیے بھیجا۔ یہ بڑے طاقتور اور بہادر نوجوان تھے مگر یہ سب کے سب بری طرح قتل کر دیے گئے۔ کسری کی فوج کے چند ہی افراد زندہ بچے اور بھاگ گئے۔

ے اِک دوسرے کی لاش میں ضم کر دیے گئے
وہ لوگ بے شمار تھے، کم کر دیے گئے

جب یہ بھگوڑے کسری کے پاس پہنچے تو ان کی شکلیں دیکھنے والی تھیں۔ موسم کی شدت، صحرا کی گرمی اور پانی کی نایابی سے ان کی شکلیں مسخ ہو رہی تھیں۔ ان کی حالت ان چوہوں سے بھی بدتر تھی جو تیل کے ڈرموں سے نکل آتے ہیں۔

قارئین کرام! آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ جس مقام پر یہ معرکہ ہوا، اس کا نام ''ذی قار'' تھا جس کا مفہوم ہی پٹرول والی جگہ بنتا ہے۔

جب کسری کی ان سے ملاقات ہوئی تو اس نے پوچھا کہ ارے! ایاد کہاں ہے؟ تمھارے بڑے بڑے بہادر جرنیل کدھر ہیں؟ انھوں نے تو کبھی شکست کا منہ ہی نہیں دیکھا

تھا۔ اِدھر مکمل خاموشی طاری تھی۔ کسری غصے سے دہاڑا: تم لوگ جواب کیوں نہیں دیتے؟ اب یہ شکست خوردہ بھگوڑے کیا جواب دیتے۔...... ان میں سے ایک نے ہمت کی اور جواب دیا: جناب! عربوں نے ہمارا استقبال صحرا میں کیا۔ وہ ہمیں بتدریج صحرا میں لے گئے، وہاں موسم کی حدت اور پانی کا قحط تھا، پھر عربوں کے قبیلے ایاد نے ہم سے دھوکا کیا، وہ لوگ عین وقت پر دشمن سے جا ملے۔ اس طرح ہمارے سارے سالار پوری فوج سمیت قتل ہو گئے...... کسری کو ان حالات کا علم ہوا تو وہ ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ یہ شکست اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ ادھر کسری کی پے در پے شکستوں کی وجہ سے اس کے بیٹے شیرویہ نے اپنے باپ کو قتل کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ مؤرخین نے ان لوگوں کی زبانی جو اس معرکہ میں شریک تھے، لکھا ہے کہ بنو بکر کے قبائل اپنی عورتوں کو بھی میدان جنگ میں لائے تھے۔ وہ لشکر کے پیچھے بیٹھی تھیں جو شخص بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیچھے بھاگتا تھا، یہ اُسے عار دلاتی تھیں۔ انھوں نے کسریٰ کے لشکر پر منظّم ہو کر پتھر برسائے اور دشمن کو بہت نقصان پہنچایا۔ آغاز جنگ میں کسریٰ کا ایک نامور پہلوان لشکر سے باہر آیا اور مبارزت طلب کی۔ بنی یشکُر کا برد بن حارثہ اس کے مقابلے میں نکلا۔ اور مبارزت طلبی کے جواب میں اسے قتل کر دیا۔ ہانی کسریٰ کی فوج کے پیچھے گھات لگائے بیٹھا تھا۔ نعمان بن منذر کی جگہ تعینات ہونے والے گورنر کو اسی کمین گاہ میں دفن ہونا پڑا۔ عربوں نے پہلی مرتبہ آپس میں یکجہتی اور اتفاق کا ثبوت دیا۔ کسریٰ کی فوج کے بہت سے عرب اسے چھوڑ کر ہانی کی فوج میں شامل ہو گئے۔ تمیم، قیس اور عیلان کے قبائل نے غلامی کا طوق اتار دیا اور اپنے اپنے علاقوں میں خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ عربوں کو معلوم ہو گیا کہ ہم جسے نا قابل شکست سمجھتے تھے، وہ سراسر دھوکا تھا۔ عربوں کے دلوں سے کسریٰ کا خوف اُٹھ گیا۔ ربیعہ، بکر اور دیگر

قبائل کے نوجوانوں نے ایک جتھہ تیار کیا جو مکمل طور پر آزاد تھا۔ انھوں نے کسریٰ اور اس کے مقرر کردہ گورنر کی اطاعت کرنے سے انکار کر دیا اور انھی قبائل میں سے اسلام کا وہ نامور ہیرو، مجاہد اور کمانڈر پیدا ہوا جسے مثنی بن حارثہ شیبانی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہی وہ نوجوان ہے جسے ہانی بن مسعود کے بعد مقامی لیڈر منتخب کیا گیا۔ عربوں نے عجم پر ''ذی قار'' کے میدان میں جو فتح حاصل کی، اس نے آگے چل کر معرکۂ قادسیہ میں مسلمانوں کی فتح کا دروازہ کھول دیا۔[1]

---

[1] الكامل في التاريخ لابن الأثير 436/1۔

سربمہر لفافے پر بیعت

اموی خلیفہ سلیمان بن عبدالملک ”دابق“ نامی قصبے میں مقیم تھا۔ یہ قصبہ شام کے شہر حلب کے قریب واقع تھا۔ مسلمانوں نے قسطنطنیہ فتح کرنے کے لیے اس علاقے میں اپنی فوجیں مدت سے بھیج رکھی تھیں۔ خلیفہ خود بھی جہاد میں شرکت اور فوجیوں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے محاذ جنگ پر موجود تھا۔ اچانک بخار کی وبا پھوٹ پڑی جس سے بڑی تعداد میں فوجی اور دیگر سرکاری ملازمین وفات پا گئے۔ خود خلیفہ کو بھی بخار ہو گیا۔ علاج شروع کیا گیا مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا، بخار کی شدت میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔

خلیفہ کو اندازہ ہو گیا کہ اس کا آخری وقت آ چکا ہے۔ اُس وقت خلیفہ کی عمر صرف پینتالیس برس تھی اور 99 ہجری کے ابتدائی دن تھے۔ اس نے خلافت کے لیے اپنے بیٹے ایوب کو نامزد کرنا چاہا مگر ابھی وہ نابالغ تھا۔ اسے حسرت تھی کہ کاش! اس کی اولاد جوان ہوتی، چنانچہ اس نے کہا:

إِنَّ بُنَيَّ صِبْيَةٌ صِغَارٌ
أَفْلَحَ مَنْ كَانَتْ لَهُ كِبَارٌ

”وہ کامیاب ہو گئے جن کی اولاد بڑی عمر کی ہے۔ میرے بچے تو بالکل چھوٹے چھوٹے ہیں۔“

اس موقع پر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ قریب ہی موجود تھے۔ فوراً بولے:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۙ وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى﴾

’’کامیاب وہ ہے جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کرلیا اور اپنے رب کو یاد کیا اور نماز ادا کی۔‘‘

بیماری کے دوران ایک دن اس کے پاس بنوامیہ کے خاص مشیر و وزیر اور ممتاز عالم دین رجاء بن حیوہ بیٹھے ہوئے تھے۔ خلیفہ کا جسم دن بدن نحیف ہوتا جا رہا تھا۔ بیماری بڑھتی جا رہی تھی وہ اس فکر میں مبتلا تھا کہ میرا جانشین کون ہوگا؟ اس نے رجاء سے مشورہ کیا تو رجاء کہنے لگے کہ امیر المومنین! آپ کو چاہیے کہ قبر میں آرام سے سونے سے پہلے حکومت کی باگ ڈور کسی نیک اور صالح انسان کو سونپ دیں۔ خلیفہ نے پوچھا: تمھاری نظر میں کون مناسب ہے؟ رجاء نے کہا: جو آپ کی نگاہ میں مناسب ہو۔ چند نام لینے کے بعد خلیفہ نے پوچھا: عمر بن عبدالعزیز کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟ انھوں نے کہا: بہت خوب اور بڑا مناسب آدمی ہے۔ خلیفہ نے کہا: مگر مجھے اندیشہ ہے، مبادا میرے بھائی ان کی خلافت ماننے سے انکار کر دیں، حالانکہ اس منصب کے لیے عمر بن عبدالعزیز ہی سب سے زیادہ مناسب ہیں۔ رجاء نے مشورہ دیا: بنومروان کو راضی کرنے کے لیے عمر بن عبدالعزیز کے ساتھ یزید بن عبدالملک کو ولی عہد نامزد کر دیجیے، چنانچہ خلیفہ نے رجاء بن حیوہ کو وصیت نامہ لکھوایا، اس پر شاہی مہر ثبت کرائی اور اسے آئی جی پولیس کعب بن حامد کے پاس بھجوا دیا۔ اس وصیت نامہ میں کیا تھا؟ یہ بات سوائے خلیفہ اور رجاء کے کسی کے علم میں نہ تھی۔

خلیفہ ابھی زندہ تھا، اس نے حکم دیا کہ میرے بھائیوں، رشتہ داروں اور عزیز و اقارب سے اس نام پر جس کی سر بمہر لفافے میں وصیت کی گئی ہے۔ بیعت لو۔ اگر کوئی انکار کرے تو اس کا سر قلم کر دو۔ رجاء بن حیوہ بڑے قابل، ذہین اور صاحبِ اثر مشیر تھے۔ اموی خاندان

میں ان کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ یوں سمجھ لیجیے کہ آج کل کے نہایت اہم عہدے کے اعتبار سے وہ چیف سیکرٹری تھے۔ انتقالِ اقتدار کے سلسلے میں ان کی حیثیت بڑی اہم تھی۔ ان کی اپنی بھی یہی تمنا تھی کہ عمر بن عبدالعزیز جیسی نیک شخصیت خلیفہ مقرر ہو، اُدھر خلیفہ کا بھائی ہشام بن عبدالملک اپنے آپ کو خلافت کا حق دار سمجھتا تھا۔ وہ رجاء بن حیوہ کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ میرے اور تمھارے جو تعلقات ہیں، ان کا تمھیں بخوبی علم ہے۔ اس پرانے تعلق کی بنا پر میں پوچھتا ہوں کہ اگر وصیت نامے میں میرا نام درج نہیں ہے تو مجھے بتا دو، ابھی خلیفہ زندہ ہے، میں اس کا بھائی ہوں، میں اس سے منوا لوں گا۔ مجھے ڈر ہے مبادا میرے بھائی نے میری بجائے کسی اور کو خلیفہ نامزد کر دیا ہو۔

رجاء نے کہا: دیکھو میں عہد کر چکا ہوں، لہٰذا جو معاملہ مجھے خفیہ رکھنے کے لیے کہا گیا ہے، میں اُس کی مکمل پاسداری کروں گا۔ میں اس معاملے سے کسی کو بھی آگاہ نہیں کر سکتا۔ ہشام اس پر ناراض ہوا اور دھمکیاں دیتا ہوا چل دیا۔

ادھر عمر بن عبدالعزیز کو ڈر تھا کہ کہیں خلیفہ انھیں خلافت کے لیے نامزد نہ کر دے، چنانچہ وہ بھی رجاء کے پاس گئے، انھیں اپنے تعلقات کا واسطہ دیا کہ ہماری باہمی دوستی بہت گہری ہے، برسوں سے چلی آ رہی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ خلیفہ نے مجھے اپنا جانشین نامزد نہ کر دیا ہو۔ اگر ایسی بات ہے تو مجھے مطلع کر دو۔ خلیفہ ابھی زندہ ہے، میں اس کے پاؤں پکڑ لیتا ہوں، اس کی منت سماجت کرتا ہوں کہ مجھے نامزد نہ کرے۔ رجاء نے عمر کو بھی وہی جواب دیا جو ہشام کو دیا تھا کہ یہ سلطنت کے راز ہیں، میں انھیں وقت سے پہلے افشا نہیں کر سکتا، چنانچہ وہ بھی ان سے ناراض ہو کر واپس چلے آئے۔ خلیفہ شدید بیمار تھا، کسی اختلاف کے امکان سے بچنے کے لیے رجاء نے نہایت عمدہ فیصلہ کیا۔ انھوں نے کسی شخص کو بھی خلیفہ کے

پاس جانے کی اجازت نہ دی۔ ادھر خلیفہ کا انتقال ہوا، اُدھر انھوں نے اپنا خاص معتبر شخص دروازے پر کھڑا کر دیا اور حکم دیا کہ اگر خلیفہ کی اہلیہ بھی اندر جانا چاہے تو اس سے کہہ دو کہ وہ آرام کر رہے ہیں، لہٰذا ان کے پاس جانے کی اجازت نہیں۔

پھر انھوں نے ''دابق'' کی جامع مسجد میں تمام امراء کو اکٹھا کیا۔ خود منبر پر کھڑے ہوگئے، لوگوں کے سامنے سر بمہر وصیت نامہ لہرایا اور کہا: آؤ اس شخص کی بیعت کرو جس کا نام اس وصیت نامے میں لکھا گیا ہے۔ ہشام نے اعتراض کرنا چاہا کہ پہلے نام بتاؤ، پھر بیعت کریں گے۔ رجاء نے کڑک کر کہا: خاموش ہوتے ہو یا نہیں؟ اگر تم نے زیادہ باتیں بنائیں تو ابھی مزاحم کو حکم دوں گا کہ تمھارا سر قلم کر دے۔ وہ خاموش ہو گیا، پھر سب لوگوں نے اس سر بمہر وصیت نامے کے اندر جس شخصیت کا نام درج تھا، اس پر موافقت کر لی۔ اب لوگوں کے سامنے وہ سر بمہر وصیت نامہ کھولا گیا تو اس میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کا نام نکلا۔ سلیمان کے بھائیوں نے شور مچا دیا کہ خلافت ہمارے گھر سے نکل گئی مگر جب رجاء نے ان کے بعد یزید بن عبدالملک کا نام لیا تو وہ خاموش ہو گئے۔ ادھر عمر بن عبدالعزیز نے اپنا نام سنا تو ان پر سکتہ چھا گیا۔ کہنے لگے کہ میں نے تو کبھی اس منصب کی تمنا نہیں کی تھی۔ لوگوں نے انھیں کندھوں سے پکڑا اور منبر پر کھڑا کر دیا۔ اب لوگوں نے ان کی طرف دیکھا تو حیران رہ گئے کیونکہ عمر بن عبدالعزیز پر گریہ طاری تھا۔ ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ذرا سکون ہوا تو کہنے لگے: لوگو! مجھے تمھاری بیعت کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسے اپنے پاس ہی رکھو، مجھے خلافت کی ہرگز خواہش نہیں جسے چاہو اپنا خلیفہ بنا لو۔ ہر طرف شور مچ گیا، لوگ رو پڑے اور کہنے لگے: ہم آپ کے علاوہ کسی اور کو نہیں چاہتے۔

لوگوں کا اصرار دیکھ کر وہ بمشکل خلافت کی ذمہ داری سنبھالنے پر راضی ہوئے، پھر منبر پر

کھڑے ہوئے اور اپنی حکومت کے طریق کار کی اس طرح وضاحت کی: قرآن کے بعد کوئی کتاب الٰہی نہیں ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ جو اللہ نے حلال کر دیا ہے، وہ قیامت تک حلال ہے اور جسے اللہ نے حرام کر دیا ہے وہ قیامت تک حرام ہے۔ [1]

---

[1] البداية والنهاية 650/12

اندھیرے سے اجالے کی طرف

اس دن وہ خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا جب اسے یہ اطلاع ملی کہ اس نے وزارت تعلیم کو بیرون ملک پڑھنے کی جو درخواست بھیجی تھی، وہ منظور ہوگئی ہے، اب وہ جلد ہی اعلیٰ تعلیم کے لیے پیرس روانہ ہو جائے گا اور اس کی بیرون ملک پڑھائی کا خرچ حکومت برداشت کرے گی۔ وہ بار بار اس لیٹر کو پڑھ رہا تھا جس میں اسے یہ خوشخبری دی گئی تھی اور ساتھ ہی وہ یہ تصور کر کے نہال ہو رہا تھا کہ اب تو میری عزت اور توقیر میں زبردست اضافہ ہو جائے گا۔ پورے خاندان میں گھر گھر اس خبر کا چرچا ہوگا۔ ہر مجلس میں یہی دھوم مچے گی کہ فلاں کا بیٹا پڑھنے کے لیے فرانس جا رہا ہے۔

جیسے جیسے سفر کا وقت قریب آ رہا تھا، اس کی مسرت میں اضافہ ہو رہا تھا مگر خیالات کے ہجوم میں اُسے یہ قلق بھی تھا کہ میں فرانس چلا جاؤں گا تو والدین کی جدائی برداشت کرنا پڑے گی اور مکہ مکرمہ جہاں بیت اللہ ہے اور میں جس میں کم از کم یومیہ ایک نماز تو ضرور پڑھتا ہوں، اس سے محرومی ہو جائے گی اور پھر کتنے ماہ و سال تک بیت اللہ کا طواف نصیب نہ ہو سکے گا۔ بیت اللہ کا طواف کتنا روح پرور اور ایمان افروز ہوتا ہے۔ میری عادت ہے کہ دن میں کم از کم ایک بار والدہ کو ضرور حرم میں لے جاتا ہوں اور پھر واپس لاتا ہوں۔ میرے بعد ان کا کیا حال ہوگا۔ بے شک میرے دوسرے بہن بھائی بھی والدہ محترمہ سے بہت محبت کرتے ہیں لیکن پھر بھی مجھے والدہ محترمہ کا دھیان لگا رہتا ہے۔ ہاں! میں مکہ مکرمہ کا باسی ہوں۔ میری پیدائش اسی مقدس شہر میں ہوئی۔ میں نے اپنا بچپن اور جوانی اسی

بلد امین کی گلیوں میں گزاری ہے۔ مجھے اس شہر سے روحانی محبت ہے۔ میں حرم میں جاتا ہوں، طواف کرتا ہوں زمزم کے مقدس پانی سے اپنی پیاس بجھاتا ہوں تو میرے رگ وریشے میں سکون وسکینت کا نور پھیل جاتا ہے۔...... بے ترتیب خیالوں کا ایک جوار بھاٹا تھا جو اُس کے دل و دماغ میں اُمڈا چلا آرہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کا مستقبل بھی بڑا اہم ہے۔ فرانس کی تعلیم اور ڈگری بڑی اہمیت رکھتی ہے۔...... بہت سے سوالوں کے جواب اس کے پاس نہ تھے، پھر وہ دن بھی آگیا کہ اس کا ویزا اور ٹکٹ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے سامان سفر تیار کیا اور روانگی کے دن ہوائی اڈے کی راہ لی۔ اس کی والدہ، بھائی اور بہنیں جدہ ایئرپورٹ پر اسے الوداع کہنے گئیں۔ والدہ اس سے لپٹ کر رو رہی تھی۔ خود اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ بہنیں رو رو کر ہلکان ہوگئی تھیں، وہ رہ رہ کر کہہ رہی تھیں۔ بھیا! ہمیں بھول نہ جانا، ہمیں روزانہ تمھارے فون کا بے تابی سے انتظار رہے گا۔

اب وہ بھائیوں سے مخاطب تھا: والدہ محترمہ کا خیال رکھنا۔ انھیں بروقت حرم لے جانا اور واپس لانا۔ میں ان کی خدمت میں کسی قسم کی کوتاہی برداشت نہیں کرسکتا، پھر اس نے اپنی والدہ اور بہن بھائیوں کو الوداع کہا، مکہ مکرمہ اور مسجد حرام کو الوداع کہا، اپنے مقدس وطن کی فضا پر الوداعی نظر ڈالی اور اَن دیکھی سرزمین کی طرف روانہ ہوگیا۔

اب وہ فرانس میں تھا۔ ایک نیا ملک، اس کا کلچر، اس کی سوسائٹی اس کے مقدس وطن سے یکسر مختلف تھی۔ وہ اس ملک کی زبان سے ناآشنا تھا۔ وہ جس شہر، جس ملک سے آیا تھا، اس کے ماحول میں اور یہاں کے ماحول میں زمین وآسمان کا فرق تھا۔ جب اس نے شرم وحیا سے عاری چست لباس میں ملبوس عورتوں کو دیکھا تو مارے شرم کے اپنی گردن جھکا لی۔

یونیورسٹی میں اس کی تعلیمی حالت ہمیشہ نمایاں رہی تھی۔ وہ شروع ہی سے ذہین وفطین

تھا۔ اس کا شمار ہمیشہ سے اپنی کلاس کے بہترین طلبہ میں ہوتا تھا۔ یہاں مخلوط تعلیم تھی۔ بہت سی لڑکیاں نیم عریاں لباس پہنے کلاس میں پڑھ رہی ہوتی تھیں۔ آہستہ آہستہ اس کی جھجک دور ہوتی چلی گئی۔ پہلے جب وہ کلاس میں داخل ہوتا تو نگاہیں جُھکا لیتا تھا، پھر جوں جوں وقت گزرا اس کا احساس مردہ ہوتا چلا گیا۔ پہلے نگاہ کا حجاب اُٹھا، پھر لڑکیوں سے مسکراہٹوں کا تبادلہ ہونے لگا۔ اُسے فرنچ زبان نہیں آتی تھی۔ وہ اس کی تعلیم پا رہا تھا۔ پہلے مرحلے میں زبان کی تعلیم، پھر یونیورسٹی کی کلاسز شروع ہونا تھیں۔ اس کی ایک کلاس فیلو تھوڑے ہی دنوں میں اس کے قریب ہوگئی۔ نیلی آنکھوں والی ...... وہ اس کے حواس پر چھاتی چلی گئی۔ اب یہ دونوں یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں مختلف بہانوں سے اکٹھے ہونے لگے۔ اکٹھے اُٹھتے بیٹھتے، وہ اسے فرنچ زبان کے الفاظ کے معانی بتاتی اور چھوٹے چھوٹے جُملے بولنا سکھاتی تھی۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہ رواں ہوگیا اور اچھی خاصی فرنچ بولنے لگا۔

اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد بالکل سچ ہے کہ جب دو غیر محرم آپس میں ملتے ہیں تو تیسرا ان کے ساتھ شیطان ہوتا ہے۔ شیطان اس نوجوان پر پوری طرح غالب آ گیا۔ مکہ مکرمہ کا باشندہ پوری طرح یورپی ثقافت میں ڈوب گیا تھا۔ مکہ مکرمہ، بیت اللہ میں اس کی نمازیں، زمزم کا مقدس پانی ...... وہ آہستہ آہستہ حسنات و برکات کی ہر چیز بھولتا چلا گیا۔

اس کی کلاس فیلو ایک دن اسے اپنے گھر لے گئی۔ اس کے والدین نے اس کا پُر تپاک استقبال کیا۔ کلاس فیلو نے اپنی بہنوں سے تعارف کرایا۔ اس کے والد نے اس کی خوب حوصلہ افزائی کی۔ اس معاشرے میں شرم، حیا، غیرت اور حمیت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اب اس کا ہر دن فسق و فجور سے آلودہ ہوتا چلا گیا اور دین و ایمان کا جنازہ نکل گیا۔ وہ اپنی اکثر راتیں اسی لڑکی کے ساتھ گزارنے لگا۔ مغربی تہذیب کے جادو نے اسے اندھا کر

دیا۔ اس نے وہاں کی عورتوں کے چنگل سے نکلنے کی ادنیٰ سی کوشش بھی نہیں کی بلکہ بتدریج اسی مادر پدر آزاد ثقافت کا اسیر ہوتا چلا گیا۔

ایک دن اس کی معشوقہ نے کہا: میں اتوار کے دن چرچ جاتی ہوں۔ عبادت کرتی ہوں۔ ہمارا پادری ہمارے سارے گناہ پلک جھپکتے ہی معاف کرا دیتا ہے۔ ہمارا مذہب بڑا اچھا ہے۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام، جتنے جی چاہے گناہ کرلو، بس پادری کے سامنے اعترافِ گناہ کرلو، وہ فوراً معافی نامہ جاری کر دیتا ہے۔ وہ اسی طرح آہستہ آہستہ عیسائیت کی تبلیغ کرتی رہی، پھر وہ دن آیا جو اس کی زندگی کا سیاہ ترین دن تھا، اسے چرچ چلنے کی دعوت دی گئی۔ وہ اس معاشرے کا اسیر ہو گیا تھا۔ اس نے لمحہ بھر سوچا اور پھر معاً چرچ جانے کی ہامی بھر لی۔

وہ اتوار کا دن تھا۔ اس دن عیسائیوں کی خاصی تعداد چرچ جاتی ہے۔ یہ بھی اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ چرچ جا پہنچا۔ منصوبہ پہلے سے تیار تھا۔ دروازے پر کئی خوبصورت اور نوجوان لڑکیوں نے اس کا پر جوش استقبال کیا۔ اس پر حسن و شباب کا جادو چل چکا تھا۔ وہ حسین لڑکیوں کی پذیرائی سے مسحور ہو گیا۔ ان کی معیت میں چرچ کے صدر دروازے میں داخل ہونے لگا تو سب لڑکیوں نے اپنے سینے پر انگلی سے صلیب کا نشان بنایا۔ ایک لڑکی نے اس کی طرف بھی اشارہ کیا کہ تم بھی اپنے سینے پر انگلی سے صلیب کا نشان بناتے ہوئے اندر داخل ہو۔ اس کی انگلی بے اختیار سینے کی طرف اٹھ گئی۔ اس نے انگلی سے سینے پر صلیب بنائی اور چرچ میں داخل ہو گیا۔ اسے خوب معلوم تھا کہ چرچ میں جو کچھ ہے، وہ باطل ہے مگر اس کی آنکھوں پر غفلت اور مدہوشی کے پردے پڑ گئے۔ اُدھر پادریوں کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ وہ بے بھاؤ مغفرت بانٹتے پھر رہے تھے۔ اس کے آگے پیچھے لڑکیاں

اور راہب تھے۔ ایک خوبصورت لڑکی اٹھلاتی ہوئی اس کی طرف بڑھی، اس کے ہاتھ میں ایک دلکش ڈبہ تھا جو نہایت خوبصورت سنہرے غلاف میں لپٹا ہوا تھا، اس حسینہ نے برقِ نظر گراتے ہوئے کہا: ہماری طرف سے آپ کی خدمت میں یہ تحفہ پیش کیا جا تا ہے، قبول فرمایئے:

اس نے بڑی خوش دلی سے ہاتھ بڑھادیا اور وہ ڈبہ تھام لیا۔ اب ایک اور نازنین آگے بڑھی۔ اور مترنم لہجے میں کہنے لگی: دیکھیے تو سہی اس میں کیا ہے؟ پھر اُس کے نرم و نازک ہاتھ آگے بڑھے۔ غلاف اتارلیا گیا۔ کرسٹل کے ڈبے میں خالص سونے کی صلیب رکھی ہوئی تھی۔ اس کے کونے پر ریشمی ڈوری بندھی ہوئی تھی اب اس نازنین نے مسکراتے ہوئے صلیب اٹھائی اور اس کے گلے میں ڈال دی۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتا مگر لڑکیوں نے اُسے لب کشائی کا موقع ہی نہیں دیا اور پر جوش تالیاں بجا کر اس کی حوصلہ افزائی کی۔ اب اس کی نئی زندگی کا آغاز ہو چکا تھا۔ وہ غیر شعوری طور پر صلیب کا پجاری بن گیا تھا اور عیسائیت کی تعلیم کی طرف راغب ہو رہا تھا۔ مغربی موسیقی کی دھنوں اور نوجوان لڑکیوں کے جھرمٹ میں شامل ہو کر وہ بتدریج اپنے والدین کو بُھلا تا چلا گیا۔ والدین کے فون آتے تھے مگر اب اسے ان کی کوئی پروانہ تھی۔ وقت کا قافلہ تیزی سے گزرتا رہا۔ اسے اس دیارِ غیر میں آئے ہوئے سات سال بیت چکے تھے۔ اس دوران اُس کے دل کی دنیا یکسر بدل گئی تھی۔ کبھی کبھی اُسے ایک نازک سا خیال آتا تھا، کیا میں مسلمان ہوں؟...... وہ بار بار سوچتا تھا اور سر جھٹک دیتا تھا...... نہیں نہیں! اب میں مسلمان نہیں ہوں۔ اب میں چرچ کا وفادار ہوں...... وہ اپنے آپ کو یہی جواب دیتا تھا...... اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب اس کی تعلیم مکمل ہو گئی۔ اسے اب اپنے وطن واپس جانا تھا، اس کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا، نہ چاہتے

ہوئے بھی وہ جدہ کی طرف محو پرواز تھا۔ اس کا ذہن اسے کچوکے لگا لگا کر پوچھ رہا تھا: کیا تم مسلمان ہو؟...... تم اس شہر سے بحیثیت مسلمان روانہ ہوئے اور اب عیسائی بن کر واپس جا رہے ہو؟ سارے سفر میں وہ اپنے ضمیر کی سرزنش کا مقابلہ کرتا رہا، پھر شیطان اس پر غالب آ گیا۔ اس نے خود کلامی کرتے ہوئے کہا: ہاں! میں اب صلیب پہنے رکھوں گا۔ جدہ کے ایئرپورٹ پر اس کی والدہ اس کے گلے لگ کر بے اختیار رو رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر بوسے دیے جا رہی تھی۔ میرے لاڈلے! تم کہاں کھو گئے تھے؟ اس کی بہنیں اور بھائی آج کتنے خوش تھے۔ گاڑیوں کا قافلہ مکہ مکرمہ روانہ ہوا۔ اس کے اعزاز میں کھانے کی تقریب ہوئی۔ وہ بظاہر اپنے آپ کو پرسکون رکھنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ عزیزوں، رشتے داروں، بہنوں اور بھائیوں سے ملاقات کر رہا تھا مگر نہایت بجھے بجھے انداز میں بڑی سرد مہری سے گلے لگ رہا تھا۔

اگلے دن اس کی زندگی پچھلی زندگی سے بالکل مختلف تھی۔ وہ فرانس میں لڑکیوں سے فون پر لمبی لمبی باتیں کرتا یا پھر گاڑی لے کر لمبی ڈرائیونگ پر نکل جاتا۔ شروع میں تو اس کی مصروفیات پر گھر والوں کا دھیان نہیں گیا مگر چند ہی دنوں میں انھوں نے محسوس کر لیا کہ ان کے نور نظر میں تبدیلی آ گئی ہے۔ وہ جب سے واپس آیا ہے حرم میں نہیں گیا۔ نہ طواف کیا ہے نہ عمرہ، نماز سے بھی غافل ہے۔ گھر والوں نے نہایت محبت سے اس کی کوتاہیوں کی طرف توجہ دلائی مگر اس نے سنی ان سنی کر دی۔ اصرار بڑھا تو اس نے بڑی ڈھٹائی سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہر شخص اپنے تصرفات اور عبادات میں آزاد ہے۔ یہ نجی، شخصی اور ذاتی معاملات ہیں، آپ کو ان میں مداخلت کا کوئی حق نہیں۔ نماز زبردستی نہیں ہوتی۔ دین میں جبر و اکراہ اور زبردستی کا کوئی تصور نہیں۔ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ ''تمھارے لیے

تمھارا دین اور میرے لیے میرا دین ہے۔''[1]

اس کی والدہ اس کے بارے میں سخت پریشان تھی۔ جب اسے اپنے بیٹے کے فاسد خیالات کا علم ہوا تو اس کی دعاؤں میں اضافہ ہو گیا۔ وہ اکثر رو رو کر اس کی ہدایت کے لیے دعا کرنے لگی...... ایک دن اس کی چھوٹی بہن اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ یہ بھائی سے بڑی محبت کرتی تھی اور بڑی لاڈلی تھی۔ وہ اس وقت اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔ وہ کانوں میں واک مین لگائے مغربی موسیقی سن رہا تھا۔ اس کی بہن اس کے بستر پر بیٹھ گئی اور بے اختیار اس کے گلے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے دیکھا کہ بھائی کے گلے میں سونے کی چین چمک رہی ہے۔ اس نے فوراً چین تھام لی اور دیکھا کہ چین کے آخری سرے پر صلیب بنی ہوئی ہے۔ بہن کی چیخ نکل گئی: یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں؟ یہ تو عیسائیوں کا مذہبی نشان ہے۔ وہ ایک ہی سانس میں نجانے کتنے سوالات پوچھتی چلی گئی۔ کیا تم عیسائی ہو چکے ہو؟ تبھی تو نماز نہیں پڑھتے۔ بھائی نے پوری قوت سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ دروازہ بند کیا اور غضب ناک ہو کر کہا: خبردار! اگر تم نے ایک لفظ بھی زبان سے نکالا تو تمھاری خیر نہیں...... وقت گزرتا چلا گیا۔ گھر والوں کو اس کی گمراہیوں اور بے دینی کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا تھا اور ان کی راہیں جُدا جدا ہو چکی تھیں مگر اس کی والدہ کی حالت اور تھی۔

ایک دن وہ باہر جانے کے لیے تیار ہوئی۔ برقع پہنا، بیٹے کے کمرے کی طرف گئی اور بولی: بیٹے! کیا تم مجھے اپنی گاڑی پر لے جا سکتے ہو؟ وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی والدہ کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھی۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی تو اس نے پوچھا: اماں! کہاں جانا ہے؟ ماں نے

---

[1] الکفرون 6:109.

محبت سے اس کی طرف دیکھا اور بولی: حرم کی طرف۔ میں عشاء کی نماز پڑھنا چاہتی ہوں۔ یہ سُن کر اس کے ہاتھوں پر رعشہ طاری ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ میں معذرت کر دوں مگر وہ والدہ تھی جس کے ادنیٰ سے اشارے پر وہ دنیا کی ہر چیز قربان کرنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ اس وقت انکار یا معذرت کی کوئی گنجائش باقی نہیں تھی۔ اس نے بڑی بے دلی سے کار حرم کی طرف موڑی۔ یہ مختصر سا راستہ اُسے بڑا لمبا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی ایک ہی خواہش تھی کہ کس طرح جلدی سے والدہ کو حرم کے قریب اتارے اور وہاں سے بھاگ آئے۔ کار حرم کے قریب پہنچی تو اس نے قدرے سختی سے کہا: اماں! یہاں اتر جاؤ، میں تمھارا اسی جگہ انتظار کروں گا۔ والدہ نے اس کی طرف شفقت بھری نظروں سے دیکھا اور کہنے لگی: میرے بیٹے! ...... ابھی یہی الفاظ کہے تھے کہ اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔ آنکھوں سے آنسو برسنے لگے۔ اس نے دلگیر لہجے میں کہا: میرے لختِ جگر! آؤ، میرے ساتھ حرم چلو، اللہ تعالیٰ کو یاد کرو، کیا عجب اللہ رب العزت تمھیں ہدایت عطا فرما دے، تمھارا سچا دین تمھیں لوٹا دے۔ میرے بیٹے! یہ چند منٹ کی بات ہے۔ آ جاؤ، ابھی وقت ہے مگر اس نے اپنی ماں کی باتوں کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اس کی والدہ گاڑی سے اتری، روتی ہوئی اور دعا مانگتی ہوئی حرم کی طرف چل دی۔ اس نے گاڑی کا شیشہ بند کیا۔ فرنچ گانوں کی کیسٹ لگائی۔ کرسی کی پشت کو پیچھے کیا اور اس پر دراز ہو گیا۔

قارئین کرام! اب باقی کہانی خود اس نوجوان کی زبانی سُنیے:

یہ چند لمحات کی بات تھی، آنکھیں بند تھیں، کیسٹ سے موسیقی کی دُھنیں اٹھ رہی تھیں۔ اچانک ایک انتہائی دلکش آواز حرم کے میناروں سے بلند ہوئی۔ اس نورانی صدا سے مکہ کے بلند و بالا پہاڑ گونج اٹھے۔ یہ حرم کے مؤذن شیخ علی ملا کی پیاری آواز میں اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ

أَكْبَرُ ، أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ کے الفاظ تھے۔ مجھ پر ان مقدس الفاظ سے رعب طاری ہو گیا۔ میں نے کیسٹ بند کر دیا اور پوری توجہ سے اذان سننے لگا۔ اس دِل کشا آواز کو سنے ہوئے سات سال کا طویل عرصہ ہو گیا تھا۔ جوں جوں اذان کے مقدس بول گونجتے گئے فضا میں نور پھیلتا چلا گیا۔ یکا یک میرا دل بھر آیا اور آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ بے اختیار میرا ہاتھ گلے کی طرف بڑھا۔ میں نے صلیب نکال کر توڑ ڈالی۔ سونے کی چین کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور بلک بلک کر رونے لگا۔ لوگ نماز کے لیے تیزی سے حرم کی طرف جا رہے تھے۔ جیسے جیسے اذان ختم ہوتی گئی، میرا ایمان لوٹنے لگا۔ میں نے گاڑی بند کر دی اور حرم کی طرف بھاگا۔ میرا رخ حمامات کی طرف تھا۔ میں نے غسل کیا اور سات سال تک حرم اور اسلام سے دور رہنے کے بعد حرم میں داخل ہوا۔

جونہی کعبہ مشرفہ پر نظر پڑی، میں اس کے جلال و جمال کی تاب نہ لا سکا۔ بے اختیار سجدے میں گر گیا۔ جماعت شروع ہو چکی تھی۔ میں بھی صف میں کھڑا ہو گیا۔ مجھ پر گریہ طاری تھا۔ نماز ختم ہوئی۔ میں نے اٹھ کر بقیہ رکعتیں پوری کیں۔ میرے قریب ایک نوجوان نے مجھے بڑے محبت بھرے انداز میں دیکھا اور کہنے لگا: میرے پیارے دینی بھائی! تم جس جگہ آ بیٹھے ہو، یہ شکر و سپاس کا مقام ہے۔ یہاں رب کریم کا بحرِ رحمت ہر وقت تموج پر رہتا ہے اور ہمارے رحیم و کریم پروردگار کا پیارا پیارا اعلان ہے کہ وہ ہر گناہ معاف کر دیتا ہے اور توبہ کرنے والوں کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ میں رو رہا تھا اور نمازی مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے اس نوجوان کا شکریہ ادا کیا۔ حرم سے نکلا، گاڑی کی طرف آیا تو دیکھا کہ میری پیاری ماں ہاتھ میں جائے نماز تھامے میرا انتظار کر رہی ہے۔ میرے قدم میرا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ میں قریب پہنچا تو بے اختیار جھک گیا اور اس کے قدموں کو

چومنے لگا۔ میں زاروقطار رو رہا تھا۔ والدہ سمجھ گئی کہ میں دوبارہ اسلام میں داخل ہو چکا ہوں۔ اس نے اپنے مقدس ہاتھ آسمان کی طرف پھیلا دیے۔ وہ بار بار کہہ رہی تھی:

يَا رَبِّ! لَكَ الْحَمْدُ يَا رَبِّ! لَكَ الْحَمْدُ يَا رَبِّ! مَا خَيَّبْتَ دُعَائِي وَرَجَائِي ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ

''اے پروردگار! تمام تعریفیں تیرے ہی لیے ہیں۔ اے پروردگار! ہر قسم کی ستائش کا تو ہی مستحق ہے۔ الحمد للہ تو نے میری دعا ومناجات اور میری امیدوں کو خائب وخاسر نہیں لوٹایا۔ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔''

میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ والدہ کو ساتھ بٹھایا، پھر ہم گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ کفر اور شرک کا میل ڈھل رہا تھا۔ گھر کے قریب پہنچے تو والدہ نے کہا:

يَا وَلَدِي! وَاللّٰهِ! مَا جِئْتُ إِلَى الْحَرَمِ إِلَّا أَنْ أَدْعُوَ لَكَ يَا وَلِيدِي! وَاللّٰهِ! ما نَسِيتُكَ مِنْ دُعَائِي وَلَا لَيْلَةً

''میرے بیٹے! اللہ قسم! آج میں حرم میں صرف تمھاری ہدایت کی دعا ہی کے لیے گئی تھی۔ میرے پیارے بیٹے! اللہ کی قسم! مجھ پر کوئی رات ایسی نہیں گزری جب میں نے تمھاری ہدایت کے لیے دعا نہ کی ہو۔''

میں نے گاڑی سڑک کے ایک جانب کھڑی کی اور اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔ حتی کہ میرے سینے میں کفر وشرک کا شائبہ تک باقی نہ رہا۔ اب میں اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ گھر پہنچتے ہی سب سے پہلے ساری کیسٹس، تصاویر اور عیسائیوں کے تحفے اکٹھے کیے اور انھیں آگ لگا دی۔ اپنے دل ودماغ سے وہ ساری شیطانی باتیں بھلا

دیں جو گزشتہ سات سال سے کرتا آیا تھا۔ اب میرا ضمیر مجھے مسلسل ملامت کر رہا تھا۔ کچوکے لگا رہا تھا کہ تم بدکاری پر کیسے آمادہ ہو گئے؟ تم نے اپنے آپ کو ان عیسائی لڑکیوں کے حوالے کیوں دیا؟ تم چرچ میں کیسے داخل ہو گئے؟ تمھاری غیرت کہاں مر گئی؟ تم نے یہ کیسے گوارا کر لیا کہ اپنے گلے میں صلیب ڈال لی، حالانکہ قرآن پاک نے اس عقیدے کی مکمل نفی فرمائی ہے:

﴿وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ﴾

”نہ (حضرت مسیح علیہ السلام) قتل کیے گئے۔ نہ انھیں سولی دی گئی بلکہ حقیقت حال ان پر مشتبہ ہو گئی۔“[1]

یہ کیسے ہوا؟ ...... کیوں ہوا؟...... سیکڑوں سوالات اُمنڈ پڑے اور میرے ذہن پر چھا گئے۔ ان کا جواب میرے پاس شرمندگی کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر قسمت کے کواڑ کُھل گئے۔ میری دوستی ایک ایسے نوجوان سے ہو گئی جو نہایت متقی اور قوی ایمان کا مالک تھا۔ میں اُس کی پاکیزہ باتوں اور حُسن عمل سے بہت متأثر ہوا۔ میں نے نہایت مختصر عرصے میں تین پارے حفظ کر لیے۔ ہم صبح و شام اکٹھے رہتے، نماز ادا کرتے، قرآن کریم کی تلاوت کرتے۔ میں نے صبح و شام کے اذکار بھی یاد کر لیے۔ اس کے اعلیٰ اخلاق نے مجھے اس کا گرویدہ بنا دیا۔ میں جب بھی قرآن کریم کی یہ آیتِ مقدسہ پڑھتا تھا، آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی تھی:

﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ﴾

”کفر کرنے والوں سے کہہ دیجیے کہ اگر یہ لوگ باز آ جائیں تو جو کچھ ہو چکا ہے، وہ

---

[1] النسآء 157:4 .

معاف کر دیا جائے گا۔‘‘ [1]

میں آج بھی اِس آیت مقدسہ کی تلاوت کرتے کرتے بے ساختہ رو پڑتا ہوں:

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ﴾

’’بتا دیجیے کہ اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔ اللہ تمام گناہوں کو بخش دے گا۔‘‘ [2]

بلاشبہ دین حنیف کی طرف میری مراجعت اللہ رب العزت کے کرم اور میری والدہ ماجدہ کی پرسوز دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ جو احباب مشکلات و مصائب سے چھٹکارے اور خوش باش زندگی کے آرزومند ہیں، انھیں چاہیے کہ اپنے والدین کی دعائیں لیں۔

---

[1] الأنفال 8:38. [2] الزمر 39:53.

عربوں کی مہمان نوازی

عربوں کے ہاں دستور تھا کہ رات کے وقت اونچے اونچے ٹیلوں پر آگ جلا دیا کرتے تھے تاکہ اگر رات کے وقت کوئی مسافر گزرے تو وہ اس آگ کو دیکھ کر مقامی لوگوں کے خیموں تک پہنچ سکے اور جب کوئی بھولا بھٹکا مسافر رات کے وقت ان کے ہاں پہنچ جاتا تھا تو وہ اس کی خاطر مدارات میں کوئی کمی نہ رہنے دیتے۔ سید محمود بغدادی نے دو شعر اس سلسلے میں نقل کیے ہیں جن کا ترجمہ یہ ہے:

> ”ایک آقا اپنے غلام سے کہتا ہے: اے واقد! اونچے ٹیلے پر آگ جلا دے۔ رات نہایت سرد ہے، ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی بھٹکا ہوا راہی تیری آگ کو دیکھ لے۔ اگر تیری اس جلائی ہوئی آگ نے کسی مہمان کو اپنی طرف کھینچ لیا تو تجھے آزاد کر دیا جائے گا۔“[1]

کبھی کبھی یہ لوگ بجائے آگ جلانے کے عود اور دوسری خوشبودار چیزیں بھی جلاتے تاکہ ہوا کے جھونکے وسیع و عریض صحرا میں دور دور تک مہک پھیلاتے رہیں اور مسافر یہ خوشبو سونگھ کر ان کے پاس پہنچ جائے، پھر وہ اس کی ضیافت کر کے لطف اندوز ہوں۔ بعض لوگوں نے اس مقصد کے لیے کتے پال رکھے تھے جو رات کے سناٹے میں بھونکتے تھے اور دور دراز تک ان کی پھیلتی ہوئی آوازیں شب کے صحرا نوردوں کو میزبانوں کے خیموں تک پہنچا دیتی

---

[1] بلوغ الأرب :1/78 .

تھیں۔ اس طرح وہ ان کی مہمانی کر کے اپنی روح کو سکون بخشتے تھے۔ ایک موقع پر ایک شاعر نے اپنے بیٹے کو اپنے کتے کے بارے میں یہ وصیت کی:

> ”میرے بیٹے! میں تجھے اپنے کتے کے بارے میں وصیت کرتا ہوں کہ اس سے اچھا سلوک کرنا، اس میں بعض خوبیاں ایسی ہیں جو مجھے بہت پسند ہیں۔ ان میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ جب فضا رات کی سیاہ چادر اوڑھ لیتی ہے تو یہ میرے مہمان کو رات کی تاریکی ہی میں میرے پاس کھینچ لاتا ہے کیونکہ اس وقت آگ جلانے والے سو جایا کرتے ہیں۔“[1]

---

[1] حوالہ کے لیے دیکھیے: سیرت خاتم النبیین ﷺ: 234۔

وعدے کی پابندی

عربوں میں قول وقرار کی پابندی ضرب المثل بن چکی تھی۔ ایفائے عہد کے لیے اگر انھیں اپنی جان بھی قربان کرنی پڑتی تھی تو وہ دریغ نہیں کرتے تھے۔ اس بات کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جب دولت ایمانی سے مشرف ہوئے تو پورا مکہ برافروختہ ہو کر ان کے مکان پر چڑھ دوڑا۔ مشرکین نعرے لگا رہے تھے کہ ”عمر بے دین ہو گیا۔“ سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے والد عاص بن وائل سہمی یہ حالت دیکھ کر سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مکان پر پہنچے اور ہجوم کو چیرتے ہوئے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔ انھوں نے پوچھا: آپ کے گھر پر یہ ہجوم کس وجہ سے آیا ہے؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اُنھیں اس معاملے کی تفصیلات سے آگاہ کر دیا۔ جب یہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے گفتگو کر کے باہر آئے تو لوگوں سے کہا: ”عمر میری پناہ میں ہے۔ تم لوگ ان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔“ یہ بات سن کر سارا مجمع چھٹ گیا اور لوگ اپنے گھروں کو چلے گئے۔[1]

عہد و پیمان کے احترام کی تصدیق اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ رسالت مآب ﷺ کے ساتھ سفر ہجرت کے لیے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جو رہبر مقرر فرمایا تھا، اس کا نام عبداللہ بن اریقط تھا۔ گو کہ وہ غیر مسلم تھا اور قریشِ مکہ کا ہم مذہب تھا لیکن اس نے اپنا عہد و پیمان خوب نبھایا، پوری رازداری سے کام لیا اور قریش کے ہر قسم کے انعام واکرام کے لالچ

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 3864 .

سے منہ موڑ کر دیانتداری سے پروگرام کے عین مطابق رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو مدینہ منورہ پہنچا دیا۔

اس سلسلے میں امام مرزوقی نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے قبیلہ مضر کے لیے قحط سالی کی بد دعا فرمائی۔ سات سال تک بارش کا ایک قطرہ نہ برسا۔ خشک سالی کی وجہ سے ہر طرف ویرانی پھیل گئی۔ کھانے کا اناج اور پینے کا پانی ناپید ہو گیا۔ حالات سے مجبور ہو کر قبیلے کے سردار حاجب نے اپنی قوم سے کہا کہ میں کسریٰ کے پاس ایران جاتا ہوں کیونکہ قحط کی تباہ کاریوں اور خشک سالی کی وجہ سے اب یہاں رہنا مشکل ہو گیا ہے۔ قوم نے اس کی اس تجویز کو پسند کیا، چنانچہ وہ کسریٰ کے پاس گیا اور اس سے قحط سالی کے خاتمے تک اپنی قوم کے ہمراہ اس کے ملک میں رہنے کی اجازت مانگی۔

کسریٰ نے اس کی درخواست کے جواب میں کہا: تم لوگ قزاقی اور غارت گری کے خوگر ہو اور فتنہ وفساد پھیلاتے ہو۔ اگر تم میرے ملک میں مقیم ہو گئے تو تمھاری عاداتِ بد کی وجہ سے میری قوم اور ملک کا سکون بھی برباد ہو جائے گا اور میں اپنی قوم کا سکون کبھی برباد نہیں ہونے دوں گا۔

سردار قبیلہ حاجب نے کہا: میں عہد کرتا ہوں کہ جب تک میری قوم تیرے ملک میں رہے گی ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گی جس سے ملک کے امن وسکون کو کوئی نقصان پہنچے۔ کسریٰ نے کہا: کیا اس عہد کا کوئی ضامن ہے؟ حاجب نے کہا: میں اپنے عہد کی ضمانت کے طور پر اپنی کمان تیرے پاس رکھتا ہوں۔

کسریٰ کے لیے یہ بات بڑی انوکھی تھی۔ کمان گروی رکھنے کا مطلب اس کی سمجھ میں نہ آیا، پھر تھوڑی دیر کے بعد حاجب اپنی کمان لے کر دربار میں حاضر ہوا تو اہلِ دربار کمان

دیکھ کر ہنس پڑے۔ لیکن کسریٰ نے کہا: ہمیں کمان کی ضمانت منظور ہے۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ جتنا عرصہ حاجب اپنی قوم کے ساتھ ایران کے علاقے میں رہا، قوم کے ہر فرد نے اپنے سردار کے اس عہد کا پاس رکھا اور کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس سے اس کے عہد کی شکست وریخت ہوتی اور ملک کا امن پامال ہوتا۔

چند برس کے بعد حاجب مر گیا اور قبیلہ مضر کو اللہ تعالیٰ نے دربار رسالت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائی اور رسول اللہ ﷺ کی دعا سے ان کے علاقے کی ساری رونقیں واپس آ گئیں۔ تمام علاقہ سرسبز وشاداب ہو گیا۔ کھیت لہلہانے لگے۔ تالاب پانی سے بھر گئے، چنانچہ پورا قبیلہ ایران کی سکونت ترک کر کے اپنے وطن میں واپس آ گیا۔

کچھ عرصہ بعد حاجب کا بیٹا عطارد کسریٰ کے پاس گیا اور اپنے باپ کی رہن شدہ کمان واپس مانگی۔ کسریٰ نے کہا: جس شخص نے کمان گروی رکھی تھی، وہ تو کوئی اور تھا۔ عطارد نے کہا: وہ میرا باپ تھا، میں اس کا بیٹا ہوں۔ میرا باپ فوت ہو گیا ہے، میں اپنے باپ کی کمان لینے آیا ہوں۔ کسریٰ نے وہ کمان واپس کر دی اور ایفائے عہد کی خوشی میں اُسے خلعتِ فاخرہ سے نوازا۔[1]

---

[1] سیرت خاتم النبیین ﷺ۔

ایفائے عہد کی نادر مثال

امرؤ القیس قیصر روم سے ملاقات کے لیے گیا تو اس نے اپنی زرہیں امانت کے طور پر سموأل [1] کے پاس رکھیں۔

امرؤ القیس مر گیا تو شام کے بادشاہ حارث بن جبلہ غسانی نے امرؤ القیس کی زرہیں لینے کے لیے سموأل پر چڑھائی کر دی۔ سموأل قلعہ نشین ہو گیا اور قلعے کے دروازے مضبوطی سے بند کر لیے۔ بدقسمتی سے سموأل کا ایک بیٹا قلعہ سے باہر رہ گیا۔ اُسے بادشاہ نے گرفتار کر لیا۔ بادشاہ نے سموأل کو آواز دی اور کہا: اگرچہ تم قلعہ نشین ہو گئے ہو لیکن دیکھو! تمھارا یہ بیٹا میرے قبضے میں ہے۔ تمھیں علم ہے کہ امرؤ القیس میرا چچا زاد تھا اور میں اس کی میراث کا دوسروں سے زیادہ حقدار ہوں، لہٰذا اگر تم نے اس کی زرہیں میرے حوالے نہ کیں تو میں تمھارے بیٹے کو قتل کر دوں گا۔ سموأل اپنے بیٹے کو اس ظالم کے قبضے میں دیکھ کر سخت پریشان ہوا اور اس سے غور وفکر کے لیے کچھ مہلت مانگی۔ بعد میں اس نے قلعے میں اپنے عزیز و اقارب اور خواتین خانہ سے صلاح مشورہ کیا۔ سب نے یہی مشورہ دیا کہ زرہیں اس کے حوالے کر کے اپنے بیٹے کی جان بچاؤ۔ جب صبح ہوئی تو سموأل نے قلعہ کی فصیل سے جھانک کر بادشاہ کو آواز دی اور کہا:

---

[1] یہ سموأل بن غریض بن عادیاء الازدی ہے۔ زمانۂ جاہلیت کا معروف شاعر اور دانشور تھا۔ مدینہ منورہ کے شمال میں خیبر کا باشندہ تھا۔ اس کا ایک شعری دیوان بھی ہے۔ شاعر امرؤ القیس سے اس کی وفاداری کا قصہ بڑا مشہور ہے۔ (دیکھیے الأعلام:140/3)

”اے بادشاہ! میں تجھے وہ زرہیں کسی قیمت پر نہیں لوٹاؤں گا۔ تیرا جو جی چاہے، کر لے۔“

بادشاہ نے اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے بیٹے کو قتل کر دیا لیکن سموأل نے اسے زرہیں نہ دیں۔ بادشاہ بے نیل ومرام واپس چلا گیا۔ بادشاہ کے واپس جانے کے بعد سموأل زرہیں لے کر امرؤ القیس کے اہل خانہ کے پاس گیا اور زرہیں اس کے ورثاء کے سپرد کر دیں۔ اس کے چند شعر ہیں جن کا ترجمہ یہ ہے:

”میں نے امرؤ القیس کندی کی زرہیں اس کے وارثوں کو پہنچا دیں جن حالات میں دوسری قومیں خیانت کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں، میں ان دگرگوں حالات میں بھی اپنا وعدہ پورا کرتا ہوں۔“[1]

---

[1] یہ واقعہ تاریخ کی متعدد کتابوں میں مذکور ہے، جیسے: البدء والتاریخ: 203/3، والكامل في التاريخ: 405/1، وخلاصة الأثر: 279/2 وغیرہ۔

پاسِ وفا

نعمان بن منذر حیرہ کا گورنر تھا۔ اس کا باپ منذر بن امرؤ القیس تھا۔ منذر کو ''مزدکی'' تحریک کا ساتھ نہ دینے کی وجہ سے نوشیرواں عادل کے باپ نے حیرہ کی گورنری سے معزول کر دیا تھا، بعد ازاں نوشیرواں نے اپنے عہد حکومت میں اسے بحال کر دیا۔ نعمان نے اپنے دور حکومت میں دو خاص دن مقرر کر رکھے تھے۔ ایک کا نام یوم النعیم (خوشی کا دن) تھا اور دوسرے کا نام یوم البؤس (غم کا دن) تھا۔ یوم النعیم کو جس شخص پر اس کی اولین نظر پڑتی، اُسے وہ سو اونٹ انعام دیتا اور یوم البؤس کو جو شخص اسے سب سے پہلے نظر آتا، اُسے وہ قتل کر دیتا تھا۔ ایک روز نعمان بن منذر جنگل میں شکار کے لیے گیا اور ایک گورخر کے پیچھے گھوڑا دوڑایا۔ اس دوران اس کے سارے مصاحبین پیچھے رہ گئے اور بادشاہ وہاں جا پہنچا جہاں اُس کی کسی سے کوئی جان پہچان نہیں تھی۔ اتنے میں بادل امنڈ آئے اور موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ بارش سے بچنے کے لیے وہ کوئی جگہ تلاش کرنے لگا۔ اسے ایک مکان دکھائی دیا۔ یہ بنی طے کے ایک شخص حنظلہ کا مکان تھا۔ حنظلہ اپنی بیوی کے ساتھ اسی مکان میں رہائش پذیر تھا۔ بادشاہ نے دروازہ کھٹکھٹایا، حنظلہ نے دروازہ کھولا۔ بادشاہ نے اس سے سر چھپانے کی درخواست کی، اس نے خیر مقدم کیا اور کہا: اندر تشریف لے آئیں۔

حنظلہ پہچان نہ سکا کہ یہ مہمان حیرہ کا بادشاہ ہے۔ اس کے پاس صرف ایک بکری ہی تھی

جس کا دودھ دونوں میاں بیوی پیتے اور اسی پر جیتے تھے۔ روایتی مہمان نوازی کی وجہ سے حنظلہ نے اپنی بیوی سے کہا کہ یہ تو کوئی بہت عظیم الشان غیر معمولی مہمان ہے، لہٰذا اس کی خاطر خواہ مہمان نوازی کس طرح کی جائے؟ بیوی نے کہا کہ میں نے تھوڑ سا آٹا بچا رکھا ہے۔ میں روٹی پکاتی ہوں، تم یوں کرو کہ پہلے بکری کا دودھ دوہ لو، پھر اسے ذبح کر دو، چنانچہ نعمان کو انھوں نے پہلے دودھ پلایا، پھر بکری ذبح کر کے گوشت اور روٹی سے اس کی مہمان نوازی کی۔ جب مہمان کھانا کھا چکا تو اس کے لیے نہایت آرام سے رات بسر کرنے کا اہتمام کیا۔ صبح کو نعمان وہاں سے رخصت ہوا تو اس نے آگاہ کیا: میں حیرہ کا بادشاہ نعمان ہوں۔ کبھی تمھیں میری ضرورت پڑے تو میرے پاس آنا میں تمھیں تمھاری خدمت کا صلہ دوں گا۔ حنظلہ نے کہا: بہت اچھا۔ خاصا عرصہ گزر گیا اور یہ بات آئی گئی ہوگئی۔ ایک مرتبہ ان کے علاقے میں قحط پڑا۔ خستہ حالی نے ان دونوں میاں بیوی کو بھی آدبوچا۔ ایک دن اس کی بیوی نے کہا: اب تو فاقہ بھی برداشت نہیں ہوتا اور مالی حالت بھی روز بروز خراب ہو رہی ہے۔ حیرہ کے بادشاہ نے تمھیں آنے کو کہا تھا، لہٰذا اس کے پاس جاؤ، شاید وہ ہماری مالی امداد کرے۔ بیوی کے کہنے پر حنظلہ حیرہ روانہ ہوگیا۔ لیکن سوئے اتفاق سے جب وہ نعمان کے دربار میں داخل ہوا، اس روز یوم البؤس تھا۔ سب سے پہلے نعمان نے اسی کو دیکھا اور پہچان گیا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے برسات کی رات میری بڑی خدمت کی تھی۔ اسے بہت دکھ ہوا کہ یہ آج میرے پاس کیوں آ گیا۔ بادشاہ نعمان اُسے نہایت رنج وغم کی حالت میں دیکھ رہا تھا۔ حنظلہ سمجھا کہ شاید اس نے مجھے پہچانا نہیں جو اس طرح مجھے دیکھ رہا ہے، چنانچہ اس نے اپنا تعارف کرایا۔

نعمان نے کہا: میں نے تمھیں پہچان لیا ہے لیکن کاش! تم آج نہ آتے کسی اور دن

آجاتے کیونکہ آج یوم البؤس ہے۔ اس نے کہا: مجھے تو اس بات کا علم نہیں تھا۔ نعمان نے کہا: کچھ بھی ہو، میں مجبور ہوں۔ آج کے دن میرا سگا بیٹا بھی میرے سامنے آجاتا تو میں اُسے بھی قتل کر دیتا، لہٰذا اگر کوئی حاجت ہے تو فوراً بتاؤ کیونکہ میں تمھیں بہر حال قتل کروں گا۔ حنظلہ نے کہا: اگر آپ نے مجھے قتل کر دیا اور میرا وجود ہی باقی نہ رہا تو پھر آپ کا انعام واکرام میرے کس کام کا؟ نعمان نے کہا: تمھاری بات اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن میرے قانون کے تحت تم بہر حال قتل کیے جاؤ گے۔

حنظلہ نے عرض کیا: اگر واقعی میرے قتل کے بغیر چارہ نہیں تو مجھے مہلت دیجیے تاکہ میں ایک مرتبہ اپنے گھر والوں سے مل آؤں اور انھیں آخری وصیتیں کر آؤں۔ میں ان کے لیے مناسب انتظام کر کے واپس آجاؤں گا۔ بادشاہ نے کہا: کوئی ضامن دو۔ حنظلہ نے ادھر اُدھر دیکھا۔ اس کی نگاہ شریک بن عمر پر پڑی۔ اس نے اس سے ضمانت دینے کی درخواست کی لیکن شریک بن عمر نے ضمانت دینے سے انکار کر دیا۔ بنی کلب کا ایک آدمی، جس کا نام قراد بن اجدع تھا، کھڑا ہو گیا اور بادشاہ سے کہا: میں اس کی ضمانت دیتا ہوں۔

نعمان نے حنظلہ کو پانچ سو اونٹنیاں، بہت سا مال ومتاع اور ایک سال کی مہلت دی کہ وہ اس دوران واپس آجائے۔ جب ایک سال گزرنے میں صرف ایک دن باقی رہ گیا تو نعمان نے قراد بن اجدع سے کہا کہ وہ شخص تو واپس نہیں آیا، لہٰذا کل اُس کی جگہ تجھے قتل کر دیا جائے گا۔ قراد نے جواب دیا: اگر آج کا دن منہ موڑ چکا ہے تو کل کا دن بھی قریب ہے، زیادہ دور نہیں۔ آنے والے لمحات کے لیے کاتب تقدیر نے کیا لکھا ہے؟ جلد پتہ چل جائے گا۔

دوسرے دن نعمان بن منذر اپنے حکم کے مطابق ہتھیار سجا کر گھوڑے پر سوار ہو کر ٹھیک اس جگہ آپہنچا جہاں وہ اس روز سب سے پہلے نظر آجانے والے شخص کو قتل کیا کرتا تھا۔

بادشاہ نے جلاد کو قراد بن اجدع کا سر قلم کرنے کا حکم دیا۔ بادشاہ کے وزیروں نے کہا: جب تک اس دن کا سورج اپنا منہ نہ چھپا لے، اخلاقی طور پر آپ اسے قتل کرنے کے مجاز نہیں، لہٰذا سورج غروب ہونے کا انتظار کر لیں۔ نعمان نے رات تک مہلت دے دی لیکن اس کا دل چاہتا تھا کہ قراد بن اجدع قتل ہو جائے اور حنظلہ بچ جائے کیونکہ اس نے موسلا دھار بارش کی رات اس کی مہمان نوازی کی تھی۔

سورج رینگ رینگ کر حجلۂ مغرب میں چھپنے کی تیاری کر رہا تھا اور رات اپنی زلفیں کھول کر اترنے ہی والی تھی۔ جلاد نے قراد کے کپڑے اتار دیے۔ تلوار بے نیام ہوگئی۔ بادشاہ کی ایک نگاہ آفتاب کی طرف اور دوسری جلاد کی طرف تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ جونہی سورج غروب ہو وہ فوری طور پر جلاد کو سر قلم کرنے کا حکم دے دے۔ قراد بن اجدع کو نطع، یعنی چمڑے کے اس فرش پر جس پر جلاد کسی کو قتل کرتا ہے، کھڑا کر دیا گیا۔ اب جلاد بادشاہ کے اشارۂ ابرو کا منتظر تھا کہ اچانک دور سے ایک آدمی بھاگ کر آتا ہوا نظر آیا۔ بادشاہ جلاد کو قراد کے قتل کا حکم دینے ہی والا تھا کہ وزراء نے کہا: جب تک معلوم نہ ہو جائے کہ آنے والا شخص کون ہے، اس وقت تک اسے قتل نہ کیا جائے۔ جب وہ شخص قریب آیا تو سب نے دیکھا کہ وہ حنظلہ تھا۔ بادشاہ نے حنظلہ کو دیکھا تو پریشان ہوگیا۔ اس نے اُسے غصہ بھری نگاہ سے دیکھا اور کہا: جب تم ایک بار قتل ہونے سے بچ ہی گئے تھے اور یہاں سے چلے گئے تھے تو پھر واپس کیوں آ گئے؟ اس نے فوراً جواب دیا: ''الوفاء'' یعنی اپنے عہد کو پورا کرنے کے لیے۔ بادشاہ نے پوچھا: وفا کا یہ سبق تو نے کہاں سے سیکھا؟ اس نے کہا: اپنے بزرگوں سے۔ اس دن سے نعمان نے اپنے آپ کو مکمل طور پر تبدیل کر لیا اور اسی روز سے قتل کرنے کا یہ رواج ختم کر دیا۔ قراد اور حنظلہ دونوں کو معاف کر دیا اور کہا:

وَاللّٰهِ! مَا أَدْرِي أَيُّكُمَا أَوْفٰى وَأَكْرَمُ

''واللہ! میں نہیں جانتا کہ تم دونوں میں سے زیادہ باوفا اور زیادہ کریم کون ہے۔''

حنظلہ نے کہا: میں وہ شخص ہوں کہ وعدہ پورا کرنا جس کی فطرت میں داخل ہے اور میں احسان کا بدلہ دینے کے لیے اپنی جان بھی قربان کرنے پر تیار ہوں۔[1]

---

[1] سیرت خاتم النبیین ﷺ، ص: 29-31، مؤلف: حکیم محمود احمد ظفر۔

دنیا کی بے ثباتی

خورنق کی تعمیر کے بارے میں مؤرخ طبری نے لکھا ہے کہ اس محل کی تعمیر کی وجہ یہ تھی کہ یزدگرد کسریٰ کا کوئی بچہ زندہ نہ رہتا تھا۔ اس نے حکماء سے کہا کہ کوئی ایسی جگہ بتاؤ جو ہر قسم کی بیماریوں سے پاک ہو۔ حکماء نے اس جگہ کی نشاندہی کی جہاں اب حیرہ آباد ہے۔ کسریٰ نے اپنے بیٹے بہرام گور کو نعمان بن امرؤ القیس [1] کے پاس بھیجا کہ میری رہائش کے لیے اس جگہ ایک محل تعمیر کراؤ۔ اس نے ایک مشہور معمار (Architect) ”سنمار“ کو تلاش کیا اور محل کی تعمیر کا کام سونپ دیا۔ جب محل تیار ہو گیا تو نعمان معائنے کے لیے آیا اور محل کی مضبوطی، دلکشی اور خوبصورتی دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

”سنمار“ اپنے کام کی تحسین و آفرین سن کر کہنے لگا: اگر مجھے پتہ ہوتا کہ تم لوگ مجھے پورا پورا معاوضہ دو گے اور میرے کام کی اس قدر تحسین کرو گے تو میں تمھارے لیے ایسا محل تعمیر کرتا جو سورج کے ساتھ ساتھ گردش کرتا رہتا۔ نعمان نے تعجب سے پوچھا: کیا تم اس سے بھی زیادہ خوبصورت محل بنا سکتے ہو؟ یہ بات تم نے پہلے کیوں نہیں بتائی؟ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ ”سنمار“ کو محل کے اوپر لے جا کر دھکا دیا جائے اور نیچے گرا کر مار دیا جائے۔

معمار ”سنمار“ مر گیا اور نعمان اس محل میں رہنے لگا۔ نعمان کو حکومت کرتے کرتے تیس

---

[1] یہ نعمان اکبر کہلاتا ہے اور نعمان بن المنذر کا چچا تھا۔ (مؤلف)

سال بیت گئے۔ ایک دن وہ خورنق محل کی چھت پر بیٹھا دادِ عیش دے رہا تھا۔ اس نے بیٹھے بیٹھے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ اسے پھلوں سے لدے ہوئے باغات، لہلہاتے کھیت، کھجوروں کے اونچے اونچے درخت جھومتے نظر آئے۔ وہ اس دل کش اور روح پرور نظارے سے بڑا خوش ہوا۔

پھر اسے یک دم خیال آیا کہ کل جب میں نہیں ہوں گا تو ان تمام چیزوں کا مالک کوئی اور ہوگا۔ اس خیال نے اسے دنیا کی بے ثباتی کا احساس دلایا۔ وہ سر سے پاؤں تک ہل گیا اور اس کے دل و دماغ کے دریچے کھلتے چلے گئے۔ اس نے محل کے پہرے داروں کو چلے جانے کا حکم دیا۔ مؤرخین بتاتے ہیں کہ جب تمام محافظ اور پہریدار چلے گئے تو اس نے رات کی تاریکی میں ایک کمبل اوڑھا اور ایسا غائب ہوا کہ پھر کسی کو کہیں نظر نہ آیا۔ یوں اس نے یہ محل ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔[1]

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ الاسلام، حسن ابراہیم: 35/1۔ یہ واقعہ قدرے اختلاف کے ساتھ تاریخ کی متعدد کتابوں میں مذکور ہے، مثلاً: المنتظم في تاريخ الملوك والأمم لابن الجوزي: 92,91/2، البداية والنهاية اور البدء والتاريخ وغیرہ۔

خدائی خون کے گھناؤنے دعویدار

ایران کے بادشاہ دعویٰ کرتے تھے کہ (نعوذ باللہ) ان کی رگوں میں خدائی خون ہے، لہٰذا ایران کے باشندے بھی انھیں اسی نظر سے دیکھتے، ان کے آگے سربسجود ہوتے اور انھیں ہر قانون اور نقد ونظر سے ماورا، فوق البشر تصور کرتے تھے۔ مزید برآں ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ بادشاہت ان کا آسمانی حق ہے۔ [1]

ان سلاطین کا ہر انسان پر پیدائشی حق تھا لیکن کسی انسان کا ان پر کوئی حق نہ تھا۔ حکمرانی کے لیے صرف ایک ہی خاص خاندان، یعنی کیانی خاندان مخصوص تھا، اس لیے یہی باور کیا جاتا تھا کہ صرف اسی خاندان کے افراد تاج وتخت کے مالک ہو سکتے ہیں اور بادشاہت پر ان کا یہ حق موروثی اور الٰہی ہے۔ اگر انھیں اس خاندان میں بادشاہت کے لیے کوئی سن رسیدہ شخص نہیں ملتا تھا تو وہ اس خاندان کی کسی عورت یا بچے ہی کو تاج پہنا دیتے تھے، چنانچہ کسریٰ کی لڑکی بوران دخت اور دوسری بیٹی آزرمی دخت تخت نشین ہوئیں اور شیرویہ کے بعد اس کے سات سالہ بچے کو تخت شاہی پر بٹھایا گیا اور خسرو پرویز کے بیٹے فرخ زاد خسرو کو شہنشاہ تسلیم کیا گیا، حالانکہ ان دنوں کئی قابل سپہ سالار اور سردار موجود تھے لیکن زمامِ حکومت محض اس لیے ان کے سپرد نہیں کی گئی کہ ان کا نسبی تعلق شاہی خاندان سے نہیں تھا کیونکہ سمجھا یہ جاتا تھا اور عام پبلک کو بھی یہی سمجھایا جاتا تھا کہ ان کے دل ودماغ دوسرے انسانوں

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو براؤن کی کتاب: Literary History of Persia Vol. iv

سے بہت مختلف ہیں۔ اسی وجہ سے فوکاس (Phocas) نے جب 610ء میں رومی بادشاہ ماریس (Maurice) سے جنگ کی اور اسے قتل کر کے خود تخت پر قابض ہو گیا تو فوکاس نے ایک سفیر کے ذریعے ایران کی حکومت کو اپنی تخت نشینی کی اطلاع دی۔ اس وقت ایران کے تخت پر نوشیرواں عادل کا پوتا خسرو پرویز متمکن تھا۔ خسرو پرویز کو 591ء میں اندرونی بغاوت کی وجہ سے فرار ہونا پڑا تھا۔ اُس موقع پر مقتول رومی بادشاہ ماریس نے اسے اپنے علاقے میں پناہ دی تھی اور تخت و تاج کے دوبارہ حصول میں بھی اس کی بھرپور مدد کی تھی۔ انھی دنوں خسرو پرویز نے ماریس کی لڑکی سے شادی بھی کر لی۔ اس رشتے کی وجہ سے وہ ماریس کو باپ کہتا تھا۔ 610ء میں خسرو پرویز دریائے فرات پار کر کے شام کے علاقے میں داخل ہو گیا اور رومی سلطنت کی حدود میں بڑھتا چلا گیا۔ ایرانی فوجیں انطاکیہ کو فتح کر کے یروشلم پر قابض ہو گئیں۔ خسرو پرویز کی اس کامیابی میں نسطوری اور یعقوبی فرقے کے عیسائیوں اور یہودیوں کا بڑا عمل دخل تھا کیونکہ وہ رومی سلطنت کے خلاف تھے۔

رومی سلطنت کو بچانے کے لیے اعیان حکومت نے افریقی مقبوضات کے رومی گورنر کو خاموش پیغام بھیجا۔ اس نے اپنے لڑکے ہرقل (Heraclius) کو اس مہم پر روانہ کیا۔ ہرقل نہایت رازداری سے آیا، معمولی سی لڑائی کے بعد سلطنت پر قابض ہو گیا اور فوکاس کو قتل کر دیا۔ لیکن ہرقل ایرانی فوجوں کے سیلاب کو نہ روک سکا۔ 616ء تک رومی دارالسلطنت سے باہر مشرقی اور جنوبی حصہ کھو چکے تھے اور عراق، شام، فلسطین، مصر اور ایشیائے کوچک وغیرہ پر صلیبی علم کے بجائے دُرَفشِ کاوِیانی [1] لہرا رہا تھا۔

---

[1] دُرَفش کاوِیانی کے معنی ہیں: ریشمی گوشۂ طلائی پر کام کیا ہوا کپڑا جو عموماً جھنڈے کے سرے پر لگایا جاتا ہے۔ دُرفشیدن کے معنی لرزنا یا لہرانا ہے اور یہ کپڑا ہوا کے جھونکے سے اڑتا اور لہراتا رہتا ہے، لہٰذا یہ اسی ◂◂

ایرانی حکومت نے رومی علاقے پر قبضہ کرنے کے بعد عیسائیت کو نیست و نابود کرنے کے لیے ان پر بڑے سخت مظالم ڈھانے شروع کر دیے۔ ان کے مذہبی شعائر کی توہین کی گئی۔ تقریباً ایک لاکھ بے گناہ عیسائیوں کو قتل کر دیا گیا، کلیسا مسمار اور آتش کدے تعمیر کیے

◂◂ نام سے موسوم ہو گیا۔' کاوہ' ایک آہن گر یا لوہار کا نام ہے۔ یہ اصفہان کا رہنے والا تھا۔ ضحاک بن علوان بڑا ظالم و جابر حکمران تھا۔ اسے ایک بیماری لاحق ہو گئی جس سے شفایابی کے لیے وہ لوگوں کے بھیجے نکلوا کر انھیں چربی میں تبدیل کراتا اور اپنے زخم پر ملواتا تھا۔ اس طرح اسے قدرے آرام ملتا تھا۔ اس نے سارے قیدیوں کے بھیجے اسی طرح نکلوائے اور مرہم بنا کر استعمال کر لیے۔ کاوہ کے چار بچے بھی اس کی بے رحمی کی نذر ہو چکے تھے۔ اس نے اس چمڑے کے کپڑے کا جسے وہ اہرن کے نیچے بچھایا کرتا تھا، پھریرا بنایا اور اسے ایک لکڑی پر لٹکا کر ڈھول بجاتا اور ضحاک بن علوان کے ظلم کا راگ الاپتا ہوا کوچہ کوچہ گلی گلی چکر لگانے لگا۔ سینکڑوں ستم رسیدہ اس کے ساتھ جڑتے چلے گئے یہاں تک کہ سارا اصفہان اس کا ہمنوا ہو گیا۔ پہلے اس نے اصفہان کے حاکم کو قتل کیا، پھر اصفہان سے نکل کر ضحاک کے کئی قلعوں پر قابض ہوا بالآخر ''کاوہ'' نے ضحاک کو قتل کر کے ایرانی سلطنت فریدوں بن جمشید کے حوالے کر دی اور اس چمڑے کو تبرک اور فتح کی علامت خیال کر کے خزانۂ ضحاک کے زر و جواہر سے مرصع کرنے کے بعد مثلِ خورشید چمکدار بنا دیا۔ اس وقت سے اس جھنڈے کا نام ''دُرفش کاویانی'' قرار پایا۔

یہ جھنڈا یزدگرد ایران کے آخری بادشاہ تک اس کے قبضے میں رہا اور اس قدر بیش قیمت ہو گیا کہ زمانے بھر کے جوہری اس کی تشخیصِ قیمت سے عاجز آ گئے چونکہ مال غنیمت سے جو کچھ ہاتھ آتا تھا اس کا ایک حصہ درفش کاویانی پر چڑھا دیا جاتا تھا، اس لیے چمڑا جواہرات سے چھپ کر بوسیدہ اور نظروں سے پوشیدہ ہو گیا۔ چار ہزار برس تک یہ جھنڈا قائم رہا۔ 6 ہجری میں اس کی بھی قضا آ گئی۔ خلیفہ دوم عمر بن خطاب ؓ کے عہد میں جب لشکر اسلام نے مملکتِ ایران پر تسلط پایا اور دُرفش کاویانی اُن کے ہاتھ آیا تو انھوں نے اس کے جواہر تمام فوجیوں میں تقسیم کر دیے اور اس چمڑے کو جلا کر خاکستر کر دیا اور فرمایا: دیکھو! کوئی چیز اللہ وحدہ لاشریک کے سوا یہ طاقت نہیں رکھتی کہ کسی انسان کی مدد کر سکے، لہٰذا اب جو شخص 'کاوہ لوہار' کے جھنڈے کی معاونت چاہے، وہ لوہار کے لوہے ہی سے قتل کر دیا جائے۔ بس یہ ہے ماجرا اُس درفش کاویانی کا جس نے شاہنامے کو مزیدار اور قصہ خوانوں کو اس کا گرفتار بنا دیا۔ (اس کی تفصیل تاریخ کی متعدد کتابوں میں لکھی ہوئی ہے جیسے: تاریخ الطبري، المنتظم لابن الجوزي، البداية والنهاية وغیرہ، البتہ ہم نے یہ معلومات ان کتابوں کے علاوہ زیادہ تر فرہنگ آصفیہ سے لی ہیں)

گئے اور ان کی مقدس صلیب کی اصل لکڑی جن کے متعلق عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ سیدنا مسیح علیہ السلام نے اس پر جان دی تھی، چھین کر ایرانی دار السلطنت مدائن بھیج دی گئی۔

اس وقت ایرانی فاتح خسرو پرویز اپنے آپ کو کیا سمجھتا تھا؟ اس کا اندازہ خسرو پرویز کے اس خط سے ہوتا ہے جو اس نے بیت المقدس سے ہرقل کو لکھا:

> ”سب خداؤں سے بڑے خدا اور تمام روئے زمین کے مالک خسرو کی طرف سے اس کے کمینے اور بے شعور بندے ہرقل کے نام! تو کہتا ہے کہ تجھے اپنے خدا پر بھروسہ ہے اگر ایسا ہی ہے تو تیرے خدا نے یروشلم کو میرے ہاتھ سے کیوں نہیں بچایا؟“

اس خط کے ایک ایک لفظ سے ایرانی بادشاہ کا تکبر اور غرور ٹپک رہا تھا۔ اسی دوران ایرانی جنرل سین (Sain) نے تجویز پیش کی کہ ہرقل صلح کا ایک قاصد شہنشاہ ایران کی خدمت میں روانہ کرے، یہ تجویز ہرقل اور اس کے مشیروں نے بڑی خوشی سے قبول کر لی لیکن شہنشاہ ایران نے کہا:

> ”مجھے یہ بات ہرگز قبول نہیں بلکہ میں چاہتا ہوں کہ خود ہرقل زنجیروں میں بندھا ہوا میرے تخت کے نیچے پڑا ہوا ہو۔ میں رومی حکمران سے اس وقت تک صلح نہیں کروں گا جب تک وہ اپنے صلیبی خدا کو چھوڑ کر سورج دیوتا کی پرستش نہ کرے۔“

ایرانیوں کے ہاں تعدد ازدواج کا عام رواج تھا۔ ایک شخص کے لیے بیویوں کی تعداد کی کوئی حد نہ تھی۔ ہر شخص اپنی آمدنی کے مطابق بیویاں رکھ سکتا تھا، البتہ غریب آدمی کو صرف ایک بیوی پر قناعت کرنا پڑتی تھی۔ خسرو پرویز کے بارے میں علامہ طبری نے لکھا ہے کہ اس کی تین ہزار بیویاں تھیں۔ ان کے علاوہ ہزار ہا لونڈیاں تھیں جو بادشاہ کی ہر طرح سے خدمت کرتی تھیں اور رقص وسرود کا جادو جگاتی تھیں۔ اُس کے پاس تین ہزار خدمت گار،

آٹھ ہزار پانچ سو گھوڑے (ابن اثیر نے پچاس ہزار لکھے ہیں) سات سو ساٹھ ہاتھی اور بارہ ہزار خچر تھے جبکہ ہیرے جواہرات اور سونے چاندی کے برتنوں کا کوئی شمار نہیں تھا۔

کسریٰ کے تاج کی تفصیلات مختلف کتابوں میں درج ہیں۔ یہ خالص سونے کا تھا۔ اس کا وزن کئی من تھا۔ الماس، یاقوت، زبرجد اور دوسرے قیمتی جواہرات سے آراستہ تھا۔ وزنی ہونے کی وجہ سے بادشاہ اسے سر پر اٹھا ہی نہ سکتا تھا، لہٰذا تاج، تخت کے اوپر ایک طلائی زنجیر میں لٹکا رہتا تھا۔ کسریٰ پردے میں تخت پر بیٹھ کر اپنا سر تاج میں داخل کر دیتا تھا۔ اس عمل کے بعد پردہ ہٹا دیا جاتا تھا اور حاضرین اس کی ہیبت اور دہشت سے سجدہ ریز ہو جاتے تھے۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ 16 ہجری میں مدائن کی فتوحات کے بعد سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ تاج سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ کو پہنایا تھا۔[2]

خسرو کے مقرر کردہ گورنر آذربائیجان کے پاس جو اموال تھے، اس کی تفصیل یہ ہے:

> ”ضرورت سے زائد فالتو مد میں بیس لاکھ دینار، پانچ لاکھ دینار کا سونے چاندی کا سامان، چھ لاکھ دینار کے جواہرات، خراسان، عراق، فارس اور آذربائیجان کا کوئی ضلع اور شہر ایسا نہیں تھا جس میں اس کی جاگیریں، مکانات، سرائیں اور زمینیں نہ ہوں۔ تیس ہزار خچر اور گھوڑے تھے، دو لاکھ بھیڑیں، سترہ سو ترک، یونانی اور حبشی غلام اور چودہ سو لونڈیاں۔“[3]

ملک میں اخلاقی ویرانی اور انارکی پھیلی ہوئی تھی۔ کسی کی عزت محفوظ نہیں تھی، شرم وحیا

---

[1] الكامل في التاريخ لابن الأثير: 492/1.

[2] البداية والنهاية: 67/7.

[3] ایران بعہد ساسانیاں، ص: 504,503۔

اور غیرت وحمیت کا جنازہ نکل چکا تھا۔ اخلاقی گراوٹ اور گندگی کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک روز مزدک[1] نے بادشاہ قباد سے، جو اس کا پیروکار بن چکا تھا، کہا کہ آج تیری بیوی جو نوشیرواں عادل کی ماں تھی، میرے پاس رات بسر کرے گی۔ اگرچہ قباد ایران کا مطلق العنان حکمران تھا لیکن مزدک کی صحبت نے اسے اتنا بے حس، بے غیرت اور دیوث بنا دیا تھا کہ اس نے مزدک کی یہ حیا سوز تجویز بلا تامل قبول کر لی اور اپنی بیوی ایک رات کے لیے مزدک کے حوالے کرنے پر راضی ہو گیا۔ نوشیرواں کو باپ کی اس بے غیرتی کا پتہ چلا تو وہ بے قرار ہو گیا مگر وہ بے بس تھا۔ ماں کی عزت محفوظ رکھنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ نہایت نیازمندی سے مزدک کی خدمت میں حاضر ہوا، اپنے ہاتھوں سے اس کے موزے اتارے، اس کے پاؤں کو بوسے دیے، پھر نہایت لجاجت سے مزدک کی خدمت میں ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ اہلِ ایران کی مادر ملکہ اور خاتون اول کی آبروریزی نہ کیجیے۔ اس مہربانی کے عوض جو کچھ آپ چاہیں، میں دینے کے لیے تیار ہوں۔ نوشیرواں کی یہ لجاجت بھری درخواست مزدک نے قبول کر لی اور اس کی ماں کو چھوڑ دیا۔

---

[1] مزدک ایک گمراہ ایرانی فلسفی تھا۔ 487ء میں پیدا ہوا۔ اس کے نظریات نہایت عجیب وغریب تھے۔ وہ خالق کائنات کو اپنی بولی میں ''اہور مزدا'' کے نام سے موسوم کرتا تھا، کہتا تھا کہ ''اہوز مزدا'' نے تمام انسانوں کو برابر سرابر پیدا کیا ہے۔ اونچ نیچ، عدم مساوات، حرص وہوس اور لالچ کا جذبہ ''اہرمن'' کا پیدا کردہ ہے۔ وہ اپنے ہی من گھڑت نظریات پر ایمان رکھتا تھا اور انھی نظریات کا پرچار کرتا تھا۔ زرتشتی مُوبدوں (آتش پرستوں کے مُلّا) اور کاہنوں کا جانی دشمن تھا۔ جانوروں کو ہلاک کرنے کی ممانعت کرتا تھا۔ املاک کی مساوی تقسیم پر زور دیتا تھا۔ اس نے اپنے عہد میں یہ نظریہ عام کر دیا کہ بچے پیدا کرنا صرف خوش جمال مردوں اور خوبصورت عورتوں ہی کو زیبا ہے۔ ایران کے بادشاہ قباد کے بیٹے خسرو نوشیرواں نے مزدک کو 528ء میں اس کے لاکھوں مریدوں سمیت ہلاک کر دیا۔ 1917ء میں روس میں جو اشتراکی انقلاب آیا، کہنے کو تو کہا جاتا ہے کہ وہ کارل مارکس اور لینن کے فکر و جہد کا نتیجہ تھا لیکن بغور دیکھا جائے تو اشتراکیت کے ڈانڈے مزدک ہی کے فاسد نظریات سے ملتے نظر آتے ہیں۔

ابن اثیر نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ بادشاہ قباد جب مزدک کا پیروکار ہو گیا تو اس نے اپنی سلطنت کے تمام گورنروں کو اس تحریک میں شمولیت کی دعوت دی۔ حیرہ کے گورنر منذر نے بادشاہ کی دعوت ٹھکرا دی۔ بادشاہ نے اسے گورنری سے معزول کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد قباد مر گیا۔ نوشیرواں تخت نشیں ہوا۔ نوشیرواں اپنے باپ کے عقیدے سے بہت بیزار تھا۔ نوشیرواں نے لوگوں کو اپنے دربار میں حاضری کا اذنِ عام دیا۔ اتفاق سے دو ممتاز شخصیتیں بھی اکٹھی دربار میں حاضر ہو گئیں۔ پہلے مزدک حاضر ہوا، پھر معزول گورنر حیرہ منذر بن امرؤ القیس۔ نوشیرواں ان دونوں کو دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑا اور بولا: میری زندگی کی دو آرزوئیں تھیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ دونوں تمنائیں پوری ہونے والی ہیں۔ مزدک نے پوچھا: شہنشاہ! وہ کون سی دو آرزوئیں ہیں؟ نوشیرواں نے جواب دیا: ایک آرزو تو یہ تھی کہ اس غیرت مند شخص منذر کو اس کے منصب پر بحال کر دوں جس نے تیری دعوت کو ٹھکرایا تھا۔ دوسری آرزو یہ تھی کہ میں ان زندیقوں کو موت کے گھاٹ اتار دوں جنھوں نے ملک میں اخلاقی بے راہ روی پھیلا دی ہے اور عورت اور دولت کو سب کی مشترکہ چیز بنا دیا ہے۔

مزدک جانتا تھا کہ ملک میں میرے ماننے والوں کی اکثریت ہے اور بادشاہ اس اشتراکی تحریک کو ختم نہیں کر سکتا، لہٰذا اس نے کہا: کیا تیرے بس میں ہے کہ ان تمام انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دے جو اس تحریک کے رکن ہیں۔ یہ جواب سن کر نوشیرواں ایک دم غصے سے بے قابو ہو گیا اور چیخ کر بولا:

> ”او زانیہ کے بیٹے! تو ابھی تک یہاں زندہ سلامت موجود ہے۔ اللہ کی قسم! تیری جرابوں کی بدبو ابھی تک میری ناک میں موجود ہے۔ جب میں نے اپنی ماں کی عصمت بچانے کی خاطر تیری جرابیں اُتاریں اور تیرے متعفن پاؤں کو بوسہ دیا تھا

تو تیرے ناپاک وجود کی سڑاند سے میرا دماغ پھٹنے لگا تھا۔“

چنانچہ نوشیرواں نے اسی وقت حکم دیا کہ اس کا سر قلم کر دیا جائے اور اس کی لاش سولی پر لٹکا دی جائے تاکہ لوگ اس ملعون کے انجام سے عبرت حاصل کریں۔ اس کے قتل کے بعد کچھ مزدکیوں نے ملک میں شورش برپا کرنے کی کوشش کی لیکن نوشیرواں کے حکم سے ایک دن میں ایک لاکھ مزدکی قتل کر دیے گئے۔

مزدک اور اس کے پیروکاروں نے لوگوں کی جو دولت اور جائیدادیں چھینی تھیں، وہ اصل مالکوں کو واپس کی گئیں۔ اس طرح مزدکی فتنہ نوشیرواں کی دلیری سے اپنے انجام کو پہنچا اور لوگوں نے سکھ کا سانس لیا۔ اسی دن سے اُسے نوشیرواں عادل کے لقب سے ملقب کیا گیا۔[1]

یہ ہے مختصر سی داستان اس ملک کی جس کا بادشاہ اپنے آپ کو ”سب خداؤں سے بڑا خدا اور تمام روئے زمین کا مالک“ کہتا تھا، أَنَا وَ لَا غَيْرِي کا ڈنکا بجاتا تھا اور جس کے بادشاہ خسرو پرویز کے القاباتِ غرور اس حد تک پہنچ گئے کہ اس نے اپنے نام کے ساتھ طاغوت و تکبر میں ڈوبے ہوئے یہ الفاظ بھی منسلک کر لیے:

> ”خداؤں میں انسان غیر فانی اور انسانوں میں خدائے لاثانی، اس کے نام کا بول بالا، آفتاب کے ساتھ طلوع ہونے والا اور شب کی آنکھوں کا اُجالا!“[2]

شاہانِ ایران اپنے آپ کو من جانب اللہ اور اپنی ذات کو جملہ اختیارات کا سرچشمہ قرار دیتے تھے۔ ان کے اختیارات اس قدر بے لگام تھے کہ بادشاہ، اس کی ماں اور بڑی ملکہ کو کلی اختیار تھا کہ جس شخص کو چاہیں کوئی جرم ثابت کیے بغیر تختۂ دار پر لٹکا دیں۔ ان کے اس

---

[1] الکامل في التاریخ لابن الأثیر: 1/ 434-436. [2] ایران بعہد ساسانیاں، ص: 338.

ظالمانہ فعل پر کسی شخص کو صدائے احتجاج بلند کرنے کی قطعاً اجازت نہ تھی، چنانچہ ایک مرتبہ ایک باپ نے اپنے چار لڑکے میدان جنگ میں بھیجے۔ ان میں سے ایک بھائی نے بادشاہ سے درخواست کی کہ ان کے پانچویں بھائی کو یہ اجازت دے دی جائے کہ وہ امور زراعت کی نگرانی اور بوڑھے والدین کی خدمت کرے۔ لیکن ''نازک مزاج شاہان تاب سخن ندارد'' بادشاہ کی طبع نازک پر یہ بات نہایت گراں گزری۔ قصر شاہی سے فوراً حکم صادر ہوا کہ اس پانچویں بھائی کو دو حصوں میں کاٹ دیا جائے اور جس راستے سے لشکر شاہی کو گزرنا ہے، اس کے ایک طرف اس کے اوپر والا حصہ اور دوسری طرف اس کا نیچے والا حصہ لوگوں کی عبرت کے لیے رکھ دیا جائے، حکم کی تعمیل ہوئی، تمام لشکر اس نوجوان کی لاش کے دو ٹکڑوں کے درمیان سے گزر گیا اور کسی کو زبان پر حرفِ احتجاج تک لانے کی جرأت نہ ہوئی۔ [1]

یہ ہے خدائی خون کے دعویداروں کی مکروہ تاریخ کی ایک ہلکی سی جھلک!

---

[1] جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے، تاریخ کی کتابوں میں اس کی ناقابل تردید شہادت موجود ہے، مثلاً: اس سلسلے میں البدایہ والنہایہ، البدء والتاریخ، الکامل فی التاریخ، تاریخ طبری اور تاریخ ابن خلدون کے اوراق دیکھے جاسکتے ہیں، البتہ ہم نے یہ معلومات سیرت خاتم النبیین ﷺ، ص: 39-45، مؤلف حکیم محمود احمد ظفر سے لی ہیں۔

امرائے روم وایران کی عیاشیاں

تاریخ بتاتی ہے کہ اپنی رعایا سے رومی حکومت کا برتاؤ نہایت سفاکانہ تھا۔ ان کے شہری اور انسانی حقوق غصب کر لیے گئے تھے۔ سرکاری ٹیکس ادا کرنے کے لیے وہ اکثر اوقات اپنی اولاد کو فروخت کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ غلام بنانے اور بیگار لینے کا عام رواج تھا۔ اسی بیگار کی بنیاد پر رومی حکومت نے وہ ادارے اور کارخانے تعمیر کیے جو رومیوں کا کارنامہ سمجھے جاتے ہیں۔ مختصر لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ رعایا کے لیے رومی حکام کی حکومت بدترین نحوست اور شدید ترین عذاب تھی۔

رومی اور ایرانی سلطنتوں کے اعلیٰ حکام کے سروں پر شہوانی خیالات اور عیاشیوں کا بھوت سوار تھا۔ ان دونوں حکومتوں میں مصنوعی بھڑکیلی تہذیب اور پُر فریب زندگی کا ایک سیلاب امنڈ آیا تھا جس میں ہر شخص سر سے پاؤں تک غرق تھا۔ عیش وعشرت کے سوا ان حکومتوں کے امراء ورؤساء کا کوئی کام ہی نہ تھا۔ تکلفات زندگی، سامانِ آرائش اور اسبابِ تعیّشات کی ان کے ہاں وہ بہتات تھی جس کی قلم کو تاب نگارش نہیں۔ کسریٰ پرویز کے شبستان میں بارہ ہزار عورتیں تھیں۔ اصطبل میں پچاس ہزار اصیل گھوڑے، محلات اور بھاری نقدی اور جواہر کا تو اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔ کسریٰ کا قصر ابیض نوشیرواں نے بنوایا تھا، اس کی تعمیر میں رومی، یونانی اور اس زمانے کے دوسرے متمدن ممالک کے فنِ تعمیر کی تمام نزاکتیں اور رعنائیاں صرف کر دی گئی تھیں۔ یہ محل پانچ دالانوں اور بڑے بڑے گنبدوں پر

مشتمل تھا اور ہر آن اپنی عظمت وجلال کا نظارہ دکھاتا رہتا تھا۔ اس کے سامنے کا حصہ ایک سو پچاس میٹر سے زیادہ چوڑا اور بلندی چالیس میٹر تھی۔ اس قصرِ ابیض پر کتنی رقم خرچ ہوئی؟ اس کا اندازہ مشکل ہے۔ مسلمانوں نے جب کسریٰ کے دار السلطنت مدائن پر قبضہ کیا تو اگرچہ یزدگرد اپنا بہت سا خزانہ، غلام، کنیزیں اور مختلف سامان تعیش اپنے ساتھ لے کر حلوان بھاگ گیا تھا، اس کے باوجود شاہی خزانے سے مسلمانوں کو تیس کھرب دینار ملے تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سا قیمتی سامان ہاتھ آیا تھا جس کی مالیت کا اندازہ مورخین نے بیس کھرب دینار سے زیادہ لگایا ہے۔ تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کہ یزدگرد جب اپنے دار السلطنت سے بھاگا تو وہ اس قدر عجلت، بے بسی اور پریشانی کی حالت میں بھی اپنے ساتھ جو کچھ لے گیا، اس سے اس کے عیش وعشرت کے لیل ونہار کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، مثلاً لکھا ہے:

> ”یزدگرد اپنے ساتھ ایک ہزار باورچی، ایک ہزار گویے، ایک ہزار چیتوں کے محافظ، ایک ہزار بازدار اور بہت سے دوسرے لوگ لے بھاگا۔ اور خدام کی یہ تعداد بھی اس کے نزدیک بہت کم تھی۔“[1]

وہ اپنے ساتھ کتنی نقدی لے گیا؟ اس کی تفصیل نہیں ملی لیکن اس کے ہمراہی خدام کے ہجوم سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کتنے کھرب روپیہ لے گیا ہوگا۔ اسی روپے کے بل بوتے پر وہ اپنے ہی ملک میں کئی سال تک اِدھر اُدھر بھاگتا رہا۔ آخر وہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ایک چکی والے کے ہاتھوں قتل ہوا۔ دم توڑتے وقت اس کی مالی حالت یہ تھی کہ اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔

---

[1] ایران بعہد ساسانیاں، ص: 81.

مؤرخین نے کسریٰ کے اس فرشِ بہار کا حال سُنایا ہے جس پر بیٹھ کر امرائے ایران موسم خزاں میں شراب پیتے تھے۔ ذرا اس کی ایک جھلک دیکھیے:

> ''اس کا رقبہ ساٹھ مربع گز تھا۔ اس کی سطح سونے سے تیار کی گئی تھی جس میں جا بجا جواہرات اور موتیوں کی گلکاری تھی۔ اِس میں پھولدار اور پھلدار درخت کاڑھے گئے تھے۔ درختوں کی لکڑی سونے کی، پتے حریر کے، کلیاں سونے چاندی کی اور پھل جواہرات کے بنائے گئے تھے۔ اِرد گرد ہیرے کی جدول تھی۔ درمیان میں روشیں اور نالیاں بنائی گئی تھیں اور یہ سب جواہرات کی مینا کاریوں سے بنائی گئی تھیں۔ موسم خزاں میں تاجدارانِ آلِ ساسان اس گلشنِ بے خزاں میں بیٹھ کر شراب پیا کرتے اور دولت وثروت کا وہ حیرت انگیز کرشمہ نظر آتا جو زمانے نے کبھی اور کہیں نہ دیکھا تھا۔''[1]

علامہ طبری نے نقل کیا ہے کہ اہل ایران سروں پر جو کلاہ رکھتے تھے، وہ کئی کئی لاکھ دینار کے ہوتے تھے۔ انھوں نے اپنا معیارِ زندگی اتنا اونچا کر لیا تھا کہ ایک شخص اپنی ذات اور اپنے لباس کے محض ایک حصے ہی پر اتنا روپیہ صرف کرتا تھا جس سے پوری ایک بستی پرورش پا سکتی تھی۔ ہرمز کے ایک کلاہ کی قیمت ایک لاکھ دینار تھی جس میں مختلف قسم کے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ شاہ حیرہ کسریٰ کا ایک عزیز تھا، اس کے کلاہ کی قیمت پچاس ہزار اور رستم جو کسریٰ کا وزیر دفاع تھا، اس کے کلاہ کی قیمت ایک لاکھ دینار تھی۔[2]

ان حکمرانوں کا موازنہ حکومت اسلامیہ کے خلاف سے کیجیے تو آپ پر اسلام کی حقانیت اور باطل کی ضلالت روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی۔

---

[1] تاریخ اسلام، مولانا عبدالحلیم شرر: 354/1۔ [2] سیرت خاتم النبیین ﷺ، ص: 48-49۔

......اور انصاف اپنی معراج کو پہنچ گیا

علامہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اپنی مایہ ناز تصنیف ''البدایہ والنہایہ'' میں رقم فرماتے ہیں کہ سلطان محمود بن سبکتگین کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا۔ اس نے جان کی امان پا کر عرض کیا کہ آپ کا بھانجا میری بیوی پر عاشق ہے۔ جب جی چاہتا ہے، وہ زبردستی میرے گھر آ جاتا ہے۔ اس نے میری بیوی سے ناجائز تعلقات قائم کر رکھے ہیں۔ اس کے خوف کی وجہ سے کوئی حاکم اس کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے تیار نہیں۔ میں نے ہر طرف کوشش کی، امراء سے ملا، وزراء سے شکایت کی مگر میری تمام کوششیں ناکام رہیں۔ اس کے شر سے سب پناہ مانگتے ہیں، اس لیے میں آپ ہی سے انصاف کا طالب ہوں۔

سلطان محمود سبکتگین نے یہ شرمناک واقعہ سنا تو اُس کا خون کھولنے لگا۔ اس نے شکایت کرنے والے سے کہا کہ آئندہ جونہی میرا بھانجا تمھارے گھر آئے، فوراً مجھے اطلاع دینا۔ اس بات کی قطعاً پروانہ کرنا کہ رات ہے یا دن۔ پھر سلطان نے اپنے سیکرٹری کو طلب کیا اور حکم جاری کیا کہ تمام سیکورٹی والوں کو اطلاع کر دو کہ جب بھی یہ فریادی آئے، اسے فوراً میرے پاس پہنچا دیا جائے۔

دو دن گزرے، رات کا کچھ حصہ بیت چکا تھا کہ وہ شخص سلطان محمود کے محل آ پہنچا۔ سلطان سو رہا تھا۔ اسے جگا کر بتایا گیا کہ فلاں شخص آپ سے ملاقات کے لیے حاضر ہوا ہے۔ سلطان فوراً اٹھا اور فریادی کے ساتھ اس کے گھر روانہ ہوگیا۔ گھر میں داخل ہوا تو اس

نے اپنے بھانجے اور عورت کو ایک ہی بستر پر یکجا پایا۔ کمرے میں شمع روشن تھی۔ سلطان نے فریادی سے کہا کہ تم پیچھے ہٹ جاؤ۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھا اور شمع گُل کر دی، پھر وہ بجلی کی طرح اپنے بھانجے کی طرف لپکا اور پلک جھپکتے ہی اس کی گردن تن سے جدا کر دی۔ اب سلطان نے آواز دی: جلدی سے پانی لاؤ۔ وہ شخص پانی لے آیا تو سلطان نے بے تابی سے پانی پیا۔

اُس شخص نے سلطان کو قسم دے کر پوچھا کہ آپ نے آتے ہی شمع کیوں بجھائی؟ سلطان نے کہا: تیرا ناس ہو! یہ میرا سگا بھانجا تھا۔ میں اسے ذبح ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے سوچا، ہوسکتا ہے، اس کی شکل دیکھ کر مجھے رحم آ جائے اور میں تقاضائے عدل پورا نہ کرسکوں۔ اس شخص نے اگلا سوال کیا: آپ نے اسے ذبح کرتے ہی پانی کیوں مانگا؟

سلطان نے جواب دیا: جب تم نے مجھے میرے بھانجے کے فعلِ بد کے بارے میں اطلاع دی تھی، میں نے قسم کھائی تھی کہ جب تک تمھاری مدد نہ کرلوں، مجھ پر کھانا پینا حرام ہے۔ میں اُسی وقت سے پیاسا تھا، اس لیے میں نے فوراً پانی مانگا۔

اس شخص نے عادل سلطان محمود کو بڑی دعائیں دیں اور اس واقعے کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

قارئین کرام! یہ ہے ہمارے نیک حکمرانوں کے کردار کی ایک جھلک! انھوں نے حق و انصاف کے معاملے میں اپنے اور بیگانے میں کبھی کوئی تمیز روا نہیں رکھی اور عدل و انصاف کا ترازو ہمیشہ سیدھا رکھا۔[1]

---

[1] البداية والنهاية 634/15 و طبقات الشافعية الكبرىٰ 321/5۔

قصی کے کارنامے

مکہ مکرمہ میں درختوں کو کاٹنا زمانہ جاہلیت میں بھی ممنوع تھا۔ اہل مکہ بیت اللہ کے قریب اپنے مکان نہیں بناتے تھے۔ وہ اس کے قریب رات کو آرام کرنے کو بڑی بے ادبی اور گستاخی تصور کرتے تھے۔ چنانچہ شہر کی آبادی بیت اللہ سے کچھ دور نشیبی حصہ میں تھی۔ چونکہ آبادی قریب نہ تھی اس لیے بیت اللہ کے ادگرد درختوں کے ہجوم نے اس پورے علاقہ کو گھیر رکھا تھا۔ ہر طرف کیکر کے درخت اور بیریاں تھیں۔ رہائش کی جگہ کو توسیع کی ضرورت تھی۔ اللہ کے رسول ﷺ کے جد امجد قصی بن کلاب نے 440ء میں مکہ پر تسلط حاصل کیا۔ اس سے قبل بنو جرہم کوئی دو ہزار ایک سو سال تک مکہ میں حکومت کرتے رہے۔ پھر بنو خزاعہ نے ان سے حکومت چھین لی۔ ان کا اقتدار تین سو سال تک رہا۔ اس وقت مکہ کے اطراف میں قریش کی چند شاخیں باقی رہیں۔ مکہ کی حکومت اور بیت اللہ کی تولیت میں ان کا کوئی حصہ نہ تھا۔ پھر قصی نے مکہ کے والی حُلیل بن حبش خزاعی کی بیٹی حُبّی سے شادی کر لی۔ جب حُلیل کا انتقال ہوا تو قصی نے مکہ کا اقتدار سنبھال لیا۔ یہ نہایت زیرک اور سمجھدار آدمی تھے۔

انہوں نے مختلف قبائل کے ساتھ روابط کو مضبوط کیا۔ حتی کہ قیصر روم کے ساتھ بھی ان کے تعلقات تھے۔ انہوں نے مکہ کی تعمیر نو کا منصوبہ بنایا۔ لوگ بیت اللہ کے ارد گرد پیدا ہو جانے والے جنگل کو کاٹنے سے ڈرتے تھے۔ کیونکہ ان کے عقیدہ میں اسے کاٹنا ایک بہت

بڑا گناہ تھا۔ چنانچہ قصی نے سب سے پہلے خود کلہاڑا چلایا اور لوگوں سے کہا کہ بے شک درخت کاٹنے ممنوع اور ناجائز ہیں۔ لیکن ان درختوں کے کاٹنے سے ہمارا مقصد آبادی ہے بربادی نہیں۔ تعمیر ہے تخریب نہیں۔ لوگ قصی کی اس بات سے مطمئن ہو گئے۔ درختوں کو کاٹ دیا گیا۔ اور ایک نقشے کے مطابق شہر کی تعمیر شروع کی گئی۔ قریش کے بہت سارے قبائل اور افراد مکہ سے باہر رہائش پذیر تھے۔ انہوں نے قریش کو اطراف مکہ سے بلا کر پورا شہران پر تقسیم کر دیا۔ خالی پلاٹ بنائے۔ اور ہر ایک خاندان کو ایک پلاٹ دے دیا۔ جس پر انہوں نے اپنے مکانات بنائے۔ قصی کا ایک نمایاں کارنامہ حرم کعبہ کے شمال میں دارالندوہ کی تعمیر کا بھی ہے۔ یہ ایک وسیع و عریض عمارت تھی۔ جس کا دروازہ حرم میں کھلتا تھا۔ مختلف مواقع پر اہل مکہ کے نمائندے جمع ہوتے اور باہمی مشورہ سے مختلف مسائل کا حل پیش کرتے اور پیش آمدہ سیاسی، معاشرتی، معاشی اور عمرانی مسائل پر گفتگو کرتے۔ اسی دارالندوہ میں مختلف سماجی تقریبات کا بھی اہتمام ہوتا تھا۔ نکاح اور ختنہ وغیرہ کی تقریبات یہیں منائی جاتی تھیں۔ قریش کی کوئی لڑکی جب سن بلوغت کو پہنچتی تو اس کو یہاں لایا جاتا اور قوم کے بزرگ اسے اوڑھنی اڑھاتے اور پردہ کا حکم دیتے تھے۔

اس مقام کو مکے کی پارلیمنٹ کا درجہ حاصل تھا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ایک دن اسی دارالندوہ میں تاریخ کا سب سے خطرناک اجتماع ہوا اس میں قریش کے تمام قبائل کے نمائندوں نے شرکت کی۔ جس میں یہ فیصلہ ہوا کہ اسلامی دعوت کے علمبردار کا قصہ بہ عجلت تمام پاک کر دیا جائے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو کفار کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رکھا اور ان کی دعوت پورے جزیرہ نمائے عرب میں پھیل گئی۔ [1]

---

[1] قصی کے حالات کی تفصیل کے لیے دیکھیے البداية والنهاية 2/210، 254 والبدء والتاريخ 4/109 والكامل في التاريخ 1/557 وغیرھا۔

سچی توبہ!

علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ مسلم بن ابراہیم کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص حبیب فارسی کے پاس آیا اور بڑے تکبر اور رعب سے کہنے لگا: میری بات سنو! حبیب فارسی نے کہا: بتاؤ! کیا بات ہے؟ اس نے کہا کہ میرے تین سو درہم تم پر واجب الادا ہیں، فوراً ادا کرو ورنہ میں قاضی کی عدالت میں تمھارے خلاف مقدمہ دائر کروں گا اور تمھیں لوگوں میں رسوا کروں گا۔ حبیب فارسی کہنے لگے: میرے عزیز! میرے اور تمھارے درمیان آج تک کبھی کوئی ملاقات ہی نہیں ہوئی، کوئی لین دین نہیں ہوا، نہ کبھی میں نے تم سے کوئی قرض لیا، تم مجھ سے تین سو درہم کیسے، کیوں اور کِس کھاتے میں مانگ رہے ہو؟ تمھارا مطالبہ سفید جھوٹ، سراسر ظلم اور صریحًا زیادتی ہے۔

وہ شخص بولا: بس تمھیں مجھے تین سو درہم دینے ہیں، کان کھول کر سن لو، میں ہر صورت میں یہ رقم لے کر رہوں گا۔ حبیب فارسی نے اس سے کہا کہ تم کل تک اپنے مطالبے پر دوبارہ غور کرلو کہ کیا واقعی تمھیں مجھ سے یہ رقم لینی ہے۔ اِدھر میں بھی سوچتا ہوں۔ گھر میں اپنے اوراق دیکھتا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ میں بھول چکا ہوں اور مجھے میرے اوراق میں کوئی ایسی تحریر مل جائے جو تمھاری بات کی تصدیق کرے، تاہم میری یادداشت کے مطابق میرا تمھارا لین دین کا کبھی کوئی معاملہ نہیں ہوا۔

حبیب فارسی اپنے گھر تشریف لائے اور سارے حسابات چیک کیے، ایک ایک ورق کی

جانچ پڑتال کی مگر کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس سے اس شخص کے دعوے کی تصدیق ہوتی ہو۔ یہ مستجاب الدعوات شخص تھے آدھی رات کے بعد انھوں نے وضو کیا، مصلے پر کھڑے ہوئے۔ دو رکعت نماز پڑھی، پھر اللہ کی بارگاہ میں ہاتھ پھیلا دیا اور دعا مانگی:

> ''اے اللہ! اگر یہ شخص اپنے قول میں سچا ہے تو پھر مجھے اس کا حق واپس کرنے کی توفیق عطا فرما اور اگر یہ جھوٹا ہے تو اس کے ہاتھ شل کر دے تاکہ لوگوں کو میرا سچ اور اس کا جھوٹ معلوم ہو جائے۔''

اگلا دن طلوع ہوا تو اچانک بڑا بھیانک منظر نظر آیا۔ اس شخص کو لوگوں نے اپنے کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا کیونکہ اس پر فالج گر گیا تھا اور اس کا آدھا جسم بالکل شل ہو گیا تھا۔ اس شخص نے آتے ہی حبیب فارسی سے کہا کہ کیا آپ نے پہچانا؟ میں وہی شخص ہوں جس نے کل آپ سے دھونس، دھاندلی اور زیادتی کرتے ہوئے تین سو درہم مانگے تھے۔ سچ پُوچھیں تو میرا حق نہیں تھا جو میں آپ سے مانگ رہا تھا، نہ میں نے آپ کو بطور امانت دیے، نہ آپ نے مجھ سے کوئی قرض لیا، نہ میرا آپ سے کوئی لین دین تھا، بس میرے جی میں آئی کہ آپ چونکہ ایک معروف اور شریف آدمی ہیں، لوگوں میں آپ کی بڑی عزت اور شہرت ہے، اس لیے آپ میری دھمکی میں آ جائیں گے اور اپنی عزت بچانے کے لیے میرا مطالبہ پورا کر دیں گے۔

حبیب فارسی نے اس سے کہا: کیا تم دوبارہ ایسی حرکت کرو گے؟ مجھے یا کسی اور مسلمان کو اسی طرح ناجائز تنگ کرو گے اور اس سے غلط اور ناحق مطالبہ کرو گے؟ اس نے کہا: ہرگز نہیں، میں توبہ کرتا ہوں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب کبھی ایسی حرکت نہیں کروں گا۔

حبیب فارسی نے دوبارہ بارگاہِ الٰہی میں ہاتھ اٹھا دیے اور نہایت لجاجت سے عرض

کرنے لگے:

اَللّٰھُمَّ! إِنْ کَانَ صَادِقًا فَأَلْبِسْہُ الْعَافِیَۃَ

”اے اللہ! اگر یہ اپنے قول و قرار میں سچا ہے تو اسے شفایاب کر دے۔“

یہ دعا کرنے کی دیر تھی کہ وہ شخص یک دم اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ اس کا مفلوج بدن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے کسی علاج کے بغیر ہی ٹھیک کر دیا، پھر وہ یوں چلنے لگا جیسے اسے کبھی کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

ظالم کا عبرتناک انجام

ابوقلابہ ؒ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ اپنے دوستوں کے ساتھ شام کے علاقے میں تھا کہ میں نے ایک شخص کی آواز سنی۔ وہ چلاّ چلاّ کر کہہ رہا تھا:

يَا وَيْلَاهُ! النَّار

”ہائے بربادی!......آگ!......آگ!“

موصوف فرماتے ہیں: میں اس کے پاس گیا تو دیکھا، اس شخص کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے تھے، آنکھوں سے نابینا تھا اور منہ کے بل زمین پر پڑا بڑبڑا رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تمھارا یہ حشر کیسے اور کیوں ہوا؟ اس نے جواب میں درج ذیل عبرتناک واقعہ سنایا:

میں ان بدبخت لوگوں میں سے ہوں جو سیدنا عثمان ؓ کے بارے میں فتنے میں مبتلا ہو گئے تھے۔ میں بھی باغیوں کے ساتھ ان کے گھر میں گُھس گیا۔ جب میں حضرت عثمان ؓ کے پاس پہنچا تو ان کی اہلیہ محترمہ نے دہائی دی اور چیخنا شروع کر دیا۔ میں نے ان کے منہ پر تھپڑ دے مارا۔ ان کی اہلیہ نے میرے لیے فوراً بددعا کی:

قَطَعَ اللّٰهُ يَدَيْكَ وَرِجْلَيْكَ وَأَعْمٰى عَيْنَيْكَ وَأَدْخَلَكَ النَّارَ

”اللہ تعالیٰ تیرے ہاتھ اور پاؤں کاٹ ڈالے، تیری بینائی چھین لے اور تجھے آگ میں جھونک دے۔“

یہ بددعا سننے کی دیر تھی کہ مجھ پر ہراس طاری ہو گیا۔ میرا وجود لرزنے لگا اور میں وہاں سے بھاگ آیا، پھر امیر المومنین کی اہلیہ کی بددعا پوری ہو گئی۔ تم میری حالت دیکھ رہے ہو، میرے ہاتھ پاؤں کٹ چکے ہیں، میں اندھا ہو چکا ہوں اور اب آخری بددعا کے مطابق جہنم میں داخل ہونا باقی ہے۔ میں نے اس سے کہا:

بُعْدًا لَّكَ وَسُحْقًا

''تم اسی قابل ہو کہ رحمت سے دور رہو اور جہنم تمھارا مقدر ٹھہرے۔''

قارئین کرام! یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب باغیوں نے امیر المومنین سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے گھر کا محاصرہ کر رکھا تھا اور آپ کے گھر تک غذا اور پانی کی رسد بھی بند کر دی تھی۔ یہ فتنہ آپ کی شہادت کا سبب بنا۔[1]

ظالموں کو خبردار رہنا چاہیے کہ ظلم اپنا تاوان لیے بغیر نہیں رہتا۔ چاہے کوئی کتنا ہی امیر، طاقتور اور مقتدر شخص کیوں نہ ہو، وہ کسی پر ظلم ڈھائے گا تو اس کی سزا ضرور بھگتے گا۔ قرآن اور حدیث کے اوراق بتلاتے ہیں کہ ظالم کو کبھی فلاح نصیب نہیں ہوتی۔ وہ اس فنا پذیر دنیا میں بھی ہولناک انجام کا شکار ہوتا ہے اور آخرت میں بھی اُسے قادر و عادل پروردگار کے حضور اپنی سفاکیوں کا جواب دینا پڑے گا۔

ع...... ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے!

---

[1] اسے محبّ طبری نے "الرياض النضرة في مناقب العشرة" میں بیان کیا ہے۔

غلاموں کی خوش بختی!

اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی امت کو آخری وقت تک یہ تعلیم دی کہ غلاموں، خادموں، نوکروں بلکہ ہر طرح کے کمزوروں، غریبوں اور ناداروں کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے اور غلاموں کا خاص خیال کیا جائے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ ہی وہ پہلی شخصیت ہیں جنھوں نے اپنے کریمانہ اسلوب سے غلامی کے بندھن کھول دیے اور غلاموں کو ان کا پورا پورا حق دلایا۔ آپ ﷺ نے ایسے اصول وضوابط مقرر فرمائے جو درحقیقت غلاموں کی آزادی پر منتج ہوئے۔ اس کا اندازہ درج ذیل واقعے سے کیجیے:

اللہ کے رسول ﷺ نے ایک مرتبہ اپنے صحابی ابومسعود انصاری ؓ کو دیکھا کہ وہ اپنے ایک غلام کو لاٹھی سے مار رہے ہیں۔ ارشاد ہوا:

اِعْلَمْ أَبَا مَسْعُودٍ! أَنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ أَقْدَرُ عَلَيْكَ مِنْكَ عَلٰى هٰذَا الْغُلَامِ

”ابومسعود! اچھی طرح سمجھ لو! کہ اللہ تعالیٰ تم پر اس سے کہیں زیادہ قدرت رکھتا ہے جتنی تم اس غلام پر رکھتے ہو۔“

سیدنا ابومسعود ؓ نے پلٹ کر بات کہنے والے کو دیکھا تو سامنے اللہ کے رسول ﷺ ناراضگی کے تاثر کے ساتھ نظر آئے۔ بہت پریشان ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں اس غلام کو اللہ کے لیے آزاد کرتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد

فرمایا:

أَمَا لَوْ لَمْ تَفْعَلْ لَلَفَحَتْكَ النَّارُ، أَوْ لَمَسَّتْكَ النَّارُ

”خبردار! اگر تم ایسا نہ کرتے (آزاد نہ کرتے) تو آگ تمھیں چھو لیتی۔“ [1]

اس واقعے کے بعد از رُوئے اسلام یہ قاعدہ مقرر ہو گیا کہ جو شخص اپنے غلام کو ناحق مارے گا، اس کو اسے آزاد کرنا پڑے گا۔ ہمیں اپنی حالت پر غور کرنا چاہیے۔ آج ہم میں کتنے سرکش لوگ ہیں جو فنا پذیر جاہ و حشم کے زعم میں لوگوں کو ناحق مارتے ہیں۔ اربابِ اقتدار، چھوٹے بڑے حکام اور پولیس والے بے قصور کمزور اور ناتواں لوگوں کو چند ٹکوں کے لالچ میں پکڑ کر حوالات میں بند کر دیتے ہیں، ان لوگوں کو دل پر ہاتھ رکھ کر غور کرنا چاہیے کہ کل جب وہ حشر کے ہجوم و ہیجان میں اللہ رب العزت کے حضور پیش ہوں گے تو انھیں ان کی سفاکیوں کی کتنی کڑی سزا ملے گی۔ قیامت اٹل ہے۔ وہ دن ضرور آئے گا جب میزانِ عمل گاڑ دی جائے گی، سب کے اعمال نامے کھل جائیں گے اور ہر ظلم و زیادتی کا حساب لگے ہاتھوں چکا دیا جائے گا۔

اللہ کے رسول ﷺ کی مذکورہ حدیث ان سب لوگوں کے لیے درسِ عبرت و موعظت ہے جو اپنے ماتحتوں کو ستاتے اور ان کے حقوق پامال کرتے ہیں۔

---

[1] صحيح مسلم، حديث: 1659.

ہمارے خدشات درست نہ تھے

امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مجاہدین کو ایرانی سرحد پر ایرانیوں سے مقابلے کے لیے روانہ کیا، وہاں عجیب صورتِ حال پیش آئی۔ ہوا یہ کہ جونہی اسلامی لشکر ایرانیوں پر حملہ آور ہوتا اور ایرانی پسپا ہوتے نظر آتے تو انھیں اچانک کسی طرف سے کمک پہنچ جاتی اور وہ دوبارہ اپنی قوت مجتمع کر کے مسلمانوں کے سامنے ڈٹ جاتے۔ امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو یہ اطلاع ملی تو انھیں اس بات سے بڑی تشویش ہوئی۔ آپ کو بتایا گیا کہ ایرانیوں کو اُبلّہ شہر سے کمک پہنچائی جاتی ہے۔ ابلہ دجلہ کے کنارے واقع ایک محفوظ شہر تھا، ایرانیوں نے یہاں اسلحہ محفوظ کرنے کے لیے بڑے بڑے اسٹور اور دشمنوں پر نگاہ رکھنے کے لیے قلعہ کے برجوں پر رصدگاہیں تعمیر کر رکھی تھیں۔

امیر المومنین نے اُبلہ شہر کو فتح کرنے کے لیے مدینہ سے لشکر روانہ کرنا چاہا مگر تمام بوڑھے اور جوان جہاد کے لیے جا چکے تھے اور مدینہ میں بہت تھوڑے لوگ باقی تھے۔ امیر المومنین نے مدینہ میں موجود تمام افراد کی فہرست سامنے رکھ کر ہر ایک کی صلاحیتوں کا بغور جائزہ لیا۔ آپ کی نگاہِ انتخاب سیدنا عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ پر پڑی جو شروع ہی میں اسلام قبول کرنے والوں میں ساتویں مسلمان تھے اور جنھوں نے حبشہ اور مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی، انھیں بدر، احد، خندق اور دیگر غزوات میں بھی کارہائے نمایاں انجام دینے کا موقع ملا تھا۔ ان کی تلوار اور تیر کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوا تھا، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی کمان

میں تین سو انیس (319) مجاہدین کا لشکر اُبُلّہ روانہ کر دیا۔

سیدنا عتبہ بن غزوان ؓ کے لشکر میں ان کی اہلیہ کے علاوہ دیگر پانچ مجاہدین کی بیگمات بھی شامل تھیں۔ لشکر نے ابلّہ شہر کے قریب ایک سرسبز جگہ پر پڑاؤ کیا، لشکر کے پاس کھانے کے لیے کوئی چیز نہیں تھی۔ جب بھوک چمکی تو سیدنا عتبہ بن غزوان ؓ نے چند لوگوں سے کہا: کھانے کے لیے کوئی چیز ڈھونڈ کر لاؤ!...... وہ خوراک تلاش کرنے چل دیے۔ اس مرحلے پر ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ خوراک کی تلاش کے لیے جانے والوں میں سے ایک صاحب کا بیان ہے:

ہم کھانے کے لیے کوئی چیز تلاش کر رہے تھے، چلتے چلتے درختوں کے ایک جھنڈ میں جا پہنچے، وہاں دو مٹکے پڑے تھے۔ ایک میں کھجوریں تھیں اور دوسرے میں سفید رنگ کے چھوٹے چھوٹے باریک دانے تھے جن پر زرد رنگ کا چھلکا تھا۔ ہم نے دونوں مٹکے اٹھا لیے اور لشکر کے پاس لے آئے۔

ہمارے ایک ساتھی نے اس مٹکے کو دیکھا جس میں سفید رنگ کے دانے تھے۔ وہ کہنے لگا: ارے! یہ تو زہر ہے جو دشمن نے تمھارے لیے تیار کر رکھا ہے، اس کے قریب بھی نہ پھٹکنا۔ پھر ہم کھجوروں کے مٹکے کی طرف لپکے اور کھجوریں کھانی شروع کر دیں۔ اتنے میں ایک گھوڑا اپنی رسی تڑا کر بھاگا اور سیدھا اس مٹکے کی طرف لپکا جس میں سفید دانے تھے وہ ان دانوں پر ٹوٹ پڑا اور بڑی رغبت سے کھانے لگا۔ واللہ! ہم نے ارادہ کیا کہ گھوڑے کو ذبح کر دیں ورنہ اِس زہر سے اس کی موت واقع ہو جائے گی۔ ایک ساتھی نے کہا: جلدی نہ کرو۔ گھوڑے کو اسی طرح رہنے دو، میں رات بھر پہرہ دوں گا۔ اگر یہ مرنے لگا تو اسے فوراً ذبح کر دوں گا۔ جب صبح ہوئی تو دیکھا کہ گھوڑے کو تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ میری بہن نے کہا:

بھائی جان! میں نے والد محترم سے سنا ہے، وہ فرمایا کرتے تھے کہ زہر کو آگ پر بھون لیا جائے تو اس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا، پھر بہن نے تھوڑے سے دانے لیے، ہنڈیا میں ڈالے اور نیچے آگ جلا دی۔ تھوڑی دیر بعد کہنے لگی: آؤ دیکھو! ان کا رنگ سرخ ہو گیا ہے، چھلکا اتر رہا ہے اور اندر سے سفید سفید دانے برآمد ہو رہے ہیں۔ ہم نے وہ دانے ایک بڑے پیالے میں ڈالے تو امیر لشکر نے فرمایا:

”اللہ کا نام لے کر کھاؤ......۔“

ہم نے کھائے تو بڑا مزا آیا۔ بعد میں پتا چلا کہ ان دانوں کا نام چاول ہے۔ [1]

---

[1] حوالے کے لیے دیکھیے: حیات صحابہ کے درخشاں پہلو، حصہ سوم، ص: 32،31.

اس نے میری آنکھیں کھول کر اپنی آنکھیں بند کرلیں

میری عمر اس وقت تیس برس کے لگ بھگ ہوگی جب ہمارے ہاں پہلا بیٹا پیدا ہوا۔ میں وہ رات کبھی نہیں بھول سکا، میں حسب معمول رات گئے تک اپنے دوستوں کے ساتھ ایک فارم ہاؤس میں گپیں ہانکتا رہا۔ ساری رات ہم فضول اور لایعنی باتیں کرتے رہے۔ یہ غیبت، چغلی، بولیوں ٹھٹولوں اور ٹھٹھے مذاق سے بھرپور رتجگا تھا...... ہم آوارہ قہقہے لگاتے رہے اور اس رات تو میری شرارتیں عروج پر تھیں۔ نقلیں اتارنے کا فن کوئی مجھ سے سیکھے۔ کسی بھی شخص کی نقل اتارنے میں مجھے چند لمحے لگتے ہیں اور میرے دوست خوب ہنستے ہیں۔ میں آواز تبدیل کر کے اسی شخص جیسی آواز نکال لیتا ہوں جس کی میں نقل اتار رہا ہوتا ہوں۔ شاید ہی کوئی دوست مجھ سے بچا ہو اور اس کی میں نے نقل نہ اتاری ہو......

اس رات مجھے انوکھی شرارت سوجھی۔ شام کے وقت میں بازار سے گزر رہا تھا۔ ایک نابینا لوگوں سے بھیک مانگ رہا تھا۔ میں نے اس کے سامنے اپنی ٹانگ رکھ دی۔ وہ ٹکرا کر گر پڑا...... اس نے میری جانب رخ کیا، بہت بڑبڑایا اور نجانے کیا کیا کہتا ہوا چل دیا۔ ...... اِدھر میں اِس حرکت پر نادم ہونے کے بجائے ٹھٹھے مار رہا تھا......۔

میں رات گئے گھر واپس آیا تو اہلیہ میرے انتظار میں تھی، اسے اس وقت میری اشد ضرورت تھی، ہمیں فوراً ہسپتال جانا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے بڑے کرب سے کہا: راشد! تم کہاں تھے؟

میں نے طنزاً جواب دیا: مریخ پر گیا ہوا تھا اور کہاں تھا!...... اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا......

اس نے بمشکل کہا: راشد! میری طبیعت بہت خراب ہے، لگتا ہے ولادت کا وقت قریب ہے۔ اس کے آنسو رخساروں پر جھلملانے لگے...... مجھے احساس ہوا کہ بلاشبہ میں غلطی پر تھا۔ میں نے اپنی اہلیہ سے اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ ان ایام میں اس کی دیکھ بھال کرنا اور اس کا خیال رکھنا میرا فرض تھا...... کاش! میں ان دنوں دوستوں کے ساتھ زیادہ وقت نہ گزارتا۔......

میں نے یہ خیالات ذہن سے جھٹک دیے۔ اہلیہ کو لے کر فوراً ہسپتال روانہ ہو گیا۔ رات ڈوب رہی تھی، صبح ہونے میں تھوڑی دیر باقی تھی۔ نرسیں میری اہلیہ کو اندر وارڈ میں لے گئیں۔ میں باہر انتظار کرتا رہا، پھر مجھ پر غنودگی چھانے لگی۔ میں صبر نہ کر سکا، گھر جانے کا فیصلہ کیا، اپنا فون نمبر ایک نرس کو دیا اور کہا کہ جب ولادت ہو مجھے اطلاع کر دینا۔

میں گھر آ کر سو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہسپتال سے فون آیا۔ مجھے بیٹے کی خوشخبری دی گئی تو میں فوراً ہسپتال روانہ ہو گیا۔ میں نے جاتے ہی اہلیہ اور نومولود کے بارے میں پوچھا تو ہسپتال والوں نے کہا: تم اس لیڈی ڈاکٹر سے مل لو جو اس کیس کی انچارج تھی۔

میں بڑے جوش و خروش میں تھا۔ بیٹے کو دیکھنے کا شدید خواہش مند تھا...... میں نے کہا کہ ڈاکٹر سے بعد میں ملوں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ میرا بیٹا کہاں ہے؟ میں اُسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ جواب ملا: پہلے ڈاکٹر سے ملو۔ میں ڈاکٹر سے ملا، اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ لمبی تمہید باندھی، مصیبتوں اور پریشانیوں کا ذکر کیا۔ تقدیر پر راضی رہنے کی فضیلت جتائی، پھر اُس نے اچانک اور بھیانک خبر دی: نومولود کی آنکھوں میں سوزش ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ کبھی کچھ دیکھ نہ پائے گا، وہ اندھا ہے!......

یہ سُنتے ہی معًا میرا سر جُھک گیا۔...... میری آنکھوں کے سامنے رات والا وہ نابینا آ گیا جس سے میں نے ٹھٹھا کیا تھا اور اس کی راہ میں اپنی ٹانگ رکھ دی تھی...... بھلا اب میں کیا کہہ سکتا تھا۔ میں نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا اور کمرے سے باہر آ گیا...... اب میرا رخ اہلیہ کے کمرے کی طرف تھا۔ وہ صبر و شکر کا نمونہ بنی بیٹھی تھی...... اس نے بار بار نصیحت کی تھی کہ لوگوں کا مذاق نہ اڑایا کرو، غیبت سے پرہیز کیا کرو اور چغلیاں نہ کھایا کرو......

ہم اگلے دن ہسپتال سے گھر آ گئے۔ میں نے بیٹے کا نام سالم رکھا۔ میرے خیالات کی اسکرین پر اس کی نصیحتیں کچھ دیر تک چمکتی رہیں پھر بُجھ گئیں۔ سچ پوچھیے تو مجھے سالم سے کوئی محبت نہ تھی۔ میں نے اس کی طرف توجہ ہی نہ دی، بس یہ سمجھ لیا جیسے وہ ہمارے گھر میں موجود ہی نہیں۔ ...... جب وہ روتا میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا جاتا...... لیکن جہاں تک میری اہلیہ کا تعلق تھا، وہ اس سے بہت پیار کرتی تھی۔ اس کا بے حد خیال رکھتی تھی...... مجھے اس سے نفرت تو نہ تھی مگر پیار بھی نہیں تھا......

وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ سالم بڑا ہوتا چلا گیا۔ اس نے رینگنا شروع کر دیا۔ اس کا رینگنا عام بچوں سے بہت مختلف تھا۔ جب اس کی عمر ایک سال سے زیادہ ہوئی تو اس نے آہستہ آہستہ چلنا شروع کیا۔ اس کے چلنے سے صاف پتہ چلتا تھا کہ اس کے پاؤں میں لنگڑا پن بھی ہے۔ سالم کی معذوریوں کی وجہ سے میرے ذہن کے بوجھ میں اضافہ ہو گیا۔

میرے ہاں سالم کے بعد دو اور بیٹے عمر اور خالد پیدا ہوئے...... وقت کتنی تیزی سے گزرتا ہے، اس کا اندازہ ہی نہ ہوا۔ سالہا سال گزر گئے، میرے بچے بڑے ہوئے مگر میرے شب و روز میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں گھر میں ٹِکتا ہی نہ تھا، ہمیشہ دوستوں کی محفلوں میں گُھسا رہتا تھا۔ ان محفلوں کی اصل رونق میں ہی تھا۔ ایک مسخرا جو اُنھیں ہر آن نت نئی

شوخیوں سے ہنساتا رہتا تھا۔

میری تمام تر کوتاہیوں کے باوجود ایک ہستی ایسی تھی جو مجھ سے کبھی مایوس نہیں ہوئی، اس نے ہمیشہ میری بہتری کے لیے دعا کی، کبھی ناراضی کا اظہار نہ کیا۔ آپ کو بتاؤں وہ کون تھی؟...... وہ میرے بچوں کی ماں تھی!...... میری اہلیہ...... جو رات گئے تک میرا انتظار کرتی تھی۔ میں سالم کے علاوہ دوسرے دونوں بیٹوں سے شدید محبت کرتا تھا مگر سالم سے میرا تعلق واجبی سا تھا بلکہ سچ پوچھیں تو نہ ہونے کے برابر۔ میں نے اسے کم ہی کبھی بلایا تھا۔ اس سے بے حد کم بات کی تھی۔ بس یہی ایک بات تھی جس پر میری بیوی کڑھتی تھی...... سالم اور اس کے بھائی اب اسکول جانے کی عمر میں تھے۔ میں نے سالم کو نابینے بچوں کے اسکول میں داخل کرا دیا، پھر وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ میرا کام دفتر جانا، کھانا پینا، سونا اور دوستوں کے ساتھ رت جگا کرنا تھا۔

وہ جمعے کا دن تھا، میں گیارہ بجے سو کر اٹھا، میں آج معمول سے پہلے ہی اٹھ گیا تھا۔ ایک دعوتِ ولیمہ میں شرکت کرنا تھی، اس لیے میں نے نیا لباس پہنا، عطر لگایا اور گھر سے باہر جانے لگا۔

میں اپنے کمرے سے نکلا...... میں نے دیکھا سالم زار وقطار رو رہا ہے۔ میرے قدم رک گئے۔ میری زندگی میں پہلی دفعہ ایسا ہوا تھا کہ میں نے سالم کو روتے دیکھا۔ دس سال بیت گئے تھے لیکن میں نے کبھی اس کی طرف توجہ ہی نہیں کی تھی۔ اب بھی خواہش یہی تھی کہ اس کے پاس سے تیزی سے نکل جاؤں۔ وہ اپنی والدہ کو بلا رہا تھا، میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ نجانے وہ کون سا جذبہ تھا کہ میں اس کی طرف بڑھا اور پوچھا: سالم! تم کیوں رو رہے ہو؟ اس نے میری آواز سنی تو رونا بند کر دیا۔ جب اسے احساس ہوا کہ میں اس کے آس پاس

آ گیا ہوں تو اس نے مجھے ٹٹولنے کے لیے اپنے ہاتھ دائیں بائیں لہرائے کہ میں اس کے قریب تو نہیں ہوں۔

جب اسے محسوس ہوا کہ میں اس کے قریب ہی کھڑا ہوں تو وہ ایک طرف سمٹنے لگا۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ مجھ سے دور ہونے کی کوشش کر رہا ہے، میں اس کے قریب تر ہونا چاہتا تھا مگر اس نے رُخ پھیر لیا۔ شاید وہ مجھے میری بے حسی، لاتعلقی اور بیگانگی کا احساس دلا رہا تھا کہ آپ اتنی مدت کہاں رہے؟...... اب دس سال کے بعد میرا خیال آیا ہے۔ میں نے اس کا پیچھا کیا تو وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے گیا۔ میں نے پھر پوچھا: سالم بیٹے! تم کیوں رو رہے تھے؟ مگر اس نے رونے کا سبب بتانے سے انکار کر دیا۔

اب میں اس کے قریب تر ہوا، اس کا ننھا سا ہاتھ پکڑا، پیار سے پوچھا: بیٹے! بتاتے کیوں نہیں، تم کیوں رو رہے تھے؟

میرے اصرار پر سالم نے رونے کا سبب بیان کرنا شروع کیا۔ جوں جوں میں اس کی بات سنتا گیا، میرے دل کی حالت غیر ہوتی چلی گئی۔ میں بالکل ہکا بکا رہ گیا...... میرا تنفس تیز ہو گیا۔ آپ کو بتاؤں کہ اس کے رونے کا سبب کیا تھا؟...... آج اس کا بھائی عمر لیٹ ہو گیا تھا...... وہ اسے وقت سے پہلے مسجد میں لے کر جایا کرتا تھا...... چونکہ یہ جمعے کا دن تھا، اس لیے اسے خدشہ تھا کہ تاخیر کی وجہ سے شاید اسے پہلی صف میں جگہ نہ ملے۔

پھر اس نے عمر کو بلایا، پھر والدہ کو آواز دی لیکن کوئی نہ آیا...... تو وہ رو دیا...... میں نے اس کے آنسو دیکھے جو اس کی بے نور آنکھوں سے برستے چلے جا رہے تھے۔ میں اس کی بقیہ گفتگو نہ سن سکا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے اور پوچھا: سالم! تم صرف اِسی وجہ سے رو رہے تھے کہ مسجد جانے میں دیر ہو گئی ہے؟ اس نے جواب دیا:

جی ہاں!

انسان بہت غافل اور کمزور ہے۔ وہ کیا جانے اگلے لمحے اس کی قسمت میں کیا ہے؟ اپنے نابینا لخت جگر سے بات کرنے کی یہ گھڑی ایسی انقلاب انگیز تھی جس نے آناً فاناً میری زندگی کا دھارا بدل دیا۔ اب...... میری زندگی میں انقلاب آ چکا تھا...... میں اپنے دوستوں کو بھول گیا...... یہ دھیان ہی نہ رہا کہ مجھے دعوت ولیمہ میں شرکت کرنا ہے۔ میں نے سالم کو مخاطب کیا: سالم! غم نہ کرو...... کیا تمھیں معلوم ہے کہ آج تمھیں کون مسجد چھوڑنے جائے گا؟ وہ کہنے لگا: یقیناً عمر جائے گا مگر وہ تو ہمیشہ تاخیر کر دیتا ہے!......

میں نے کہا: فکر نہ کرو۔ آج تمھارا باپ تمھیں مسجد چھوڑنے جائے گا۔ آج میں تمھاری انگلی پکڑ کر چلوں گا...... سالم حیران رہ گیا...... اسے یقین نہ آیا...... اسے گمان ہوا کہ میں اس سے مذاق کر رہا ہوں۔ اس نے اس صورتحال پر تھوڑی دیر سوچا، پھر اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

میں نے اس کے آنسو پونچھے۔ اس کا بازو تھاما اور گاڑی کی طرف لے کر چلنے لگا...... مگر اس نے گاڑی میں بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگا: پدر بزرگوار! مسجد قریب ہے، میں پیدل جانا چاہتا ہوں تاکہ مجھے ہر قدم پر ثواب ملے۔

مجھے یاد نہیں تھا کہ میں آخری بار کب مسجد گیا تھا مگر یہ پہلا موقع تھا کہ میں ندامت سے زمین میں گڑ گیا اور مجھے اپنے مقدس پروردگار سے اتنی دیر تک لاتعلق رہنے پر بڑی شرمندگی محسوس ہوئی۔...... مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے ذرا سی کوشش کی، سالم کے لیے پہلی صف میں جگہ مل گئی۔ ہم نے خطبہ جمعہ سنا۔ نماز کے لیے کھڑے ہوئے، سالم میرے پہلو سے لگا کھڑا تھا...... بلکہ سچ پوچھیے تو میں نے اس کے سائے میں کھڑے ہو کر

نماز ادا کی......

نماز ختم ہوئی، سالم نے مجھ سے کہا: ذرا قرآن کریم دیجیے۔ میں حیران ہوا کہ یہ قرآن کیسے پڑھے گا، یہ تو نابینا ہے...... میں سوچ رہا تھا کہ اس کی بات اَن سنی کردوں مگر میں نے بحث میں پڑنے کے بجائے آگے بڑھ کر قرآن پاک کا نسخہ اس کے حوالے کر دیا۔ اب اس نے کہا کہ سورۂ کہف نکال دیجیے۔ میں نے قرآن کے اوراقِ مبارک پلٹنے شروع کیے، چند صفحات پلٹے، سورۂ کہف سامنے آ گئی۔ اس نے قرآن میرے ہاتھ سے لے لیا۔ ادب اور وقار سے اپنے سامنے رکھا اور سورۂ کہف کی تلاوت شروع کر دی۔ اس کی آنکھوں کے دیے بُجھے ہوئے تھے مگر پھر بھی پورے سکون و سکینت سے تلاوت کیے جا رہا تھا۔ اب مجھ پر منکشف ہوا کہ اگرچہ وہ دیکھ نہیں سکتا مگر اسے پوری سورت زبانی یاد ہے۔ مجھ پر حیرتوں کے دریچے کھلتے چلے گئے۔

پھر مجھے شدید خجالت محسوس ہوئی۔ میں نے بھی قرآن پاک کا نسخہ لیا۔ سورۂ کہف نکالی۔ میرے اعصاب پر رعشۂ سیماب طاری ہو گیا۔ میں نے قرآن پاک پڑھنا شروع کر دیا۔ پڑھتا رہا...... دیر تک پڑھتا رہا۔ جوں جوں پڑھتا گیا، میری آنکھوں سے غفلت کے پردے اُٹھتے چلے گئے، پھر میں نے تڑپ کر اپنے رب سے اپنی ہدایت کی دعا مانگی میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔ ماضی کا غبار چھٹ گیا۔ حافظے کے پردے پر بیتے ہوئے واقعات جھلملانے لگے۔ اپنے گناہ یاد آتے چلے گئے اور خفت و شرمساری نے ایسے کچوکے لگائے کہ میں بچوں کی طرح بلکنے لگا۔

بعض لوگ سنتیں ادا کر رہے تھے...... مجھے ان سے بڑی خجالت محسوس ہوئی۔ میں نے بہ تکلف کوشش کی کہ اپنے گریہ پر قابو پالوں، پھر میری آواز مدہم ہوتی چلی گئی۔ اب میں

آہیں بھر رہا تھا۔ میرے حلق سے سسکیاں نکل رہی تھیں۔ اچانک ایک ننھا ساید بیضا میرا چہرہ صاف کرنے لگا۔ اس نے میری آنکھوں سے آنسو پونچھ ڈالے۔ یہ میرا بیٹا سالم تھا۔ میں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ اس کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا اور اپنے دل میں کہا: سالم! تم اندھے نہیں ہو...... اندھا تو دراصل میں ہوں!

پھر ہم واپس گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ اہلیہ سالم کی وجہ سے مغموم بیٹھی تھی۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ آج سالم کو جمعہ پڑھانے کے لیے میں ساتھ لے گیا تھا۔ جب اسے پتہ چلا کہ ہم دونوں باپ بیٹا اکٹھے مسجد گئے تھے تو اس کا قلق فوری طور پر مسرت میں تبدیل ہو گیا اور پھر میری زندگی میں ایسا انقلاب برپا ہوا کہ...... اس دن سے میری کوئی نماز قضا نہیں ہوئی۔ میں نے بری سوسائٹی ترک کر دی۔ اب میں نے مسجد کے نمازیوں میں سے بہترین متقی انسانوں کو اپنا دوست بنا لیا...... میں نے ایمان کی حلاوت چکھی...... ان سے دین کے حوالے سے بہت سی اہم باتیں سیکھیں، پھر تو یہ حالت ہو گئی کہ کوئی حلقہ درس اور کوئی دینی پروگرام کہیں بھی ہوتا، میں اس سے کبھی غیر حاضر نہیں ہوتا تھا۔ قرآن کریم کی تلاوت میرا معمول بن گیا۔ مہینے میں کم از کم ایک بار قرآن کریم ضرور ختم کرتا۔ میری زبان پر اللہ رب العزت کی حمد و ثنا جاری رہتی۔ اپنا ماضی یاد آتا تو اور زیادہ کثرت اور توجہ سے ذکر اذکار کرتا کہ شاید اللہ تعالیٰ میرے سابقہ گناہ معاف فرما دے۔ میں نے لوگوں کے ساتھ کتنا دل آزار سلوک کیا تھا۔ ان کی نقلیں اتاری تھیں، ان کا مذاق اڑایا تھا۔ ان پر آوازیں کسی تھیں۔ اُن کے دلوں کے آبگینے توڑے تھے!...... آہ! میں کس وادیٔ تاریک میں بھٹکتا پھرتا تھا!

اب میں اپنے گھر والوں سے بہت قریب ہوتا چلا گیا۔ میری اہلیہ کے چہرے کی رونق

لوٹ آئی تھی۔ کہاں اس کا وہ اداس چہرہ جب وہ میرے بارے میں مغموم اور متفکر رہتی تھی اور کہاں اب اُس کا مُسکراہٹوں کی شمیم و شبنم لُٹاتا ہوا ضیا بار مکھڑا! اور پھر میرا سالم! اس کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ گھر میں بہار آ گئی۔ میرا زیادہ وقت سالم کے ساتھ گزرتا تھا اور میں اللہ تعالیٰ کے انعامات پر شکر ادا کرتا تھا۔

ایک دن کچھ ساتھیوں نے کہا کہ ہم دعوت دین کے لیے دور کسی ملک میں جانا چاہتے ہیں، تم بھی ہمارے ساتھ چلو...... میں دعوت دین کے عظیم الشان فریضے سے بے خبر تھا۔ زمین پر بوجھ بنا بیٹھا تھا۔ کبھی بھولے سے بھی خیال نہیں آیا تھا کہ دعوتی مشن کے لیے نقل و حرکت کرنی چاہیے...... میں ذرا متردد ہوا مگر ان کا اصرار بڑھا۔ میں نے استخارہ کیا اور اہلیہ سے مشورہ لیا، وہ تو مدتوں سے منتظر و متمنی تھی کہ میں دین قیم کا داعی بن جاؤں۔ میرا خیال تھا کہ وہ میری روانگی پر راضی نہ ہوگی مگر معاملہ برعکس نکلا۔

میں اس کے ایمان افروز ردعمل پر بڑا خوش ہوا...... اس نے میری حوصلہ افزائی کی...... کہاں ماضی کہ میں اُسے اطلاع کیے بغیر فسق و فجور کے لیے مختلف ملکوں میں جایا کرتا تھا اور کہاں زمانۂ حال کہ اب میں اسلام کا پیغام عام کرنے کے لیے جا رہا تھا۔

میں نے سالم سے بات کی، اُسے اپنے سفر کا مقصد بتایا اور پوچھا تمھارا کیا خیال ہے؟ اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے منور و مسکن بازو میرے گلے میں ڈال دیے اور کہا: ابو! آپ دعوت الی اللہ کے لیے ضرور جائیں، پھر میں دعوتی مشن پر روانہ ہو گیا......

گھر سے نکلے تین مہینے سے زیادہ دن گزر چکے تھے۔ اس دوران گھر والوں سے کئی دفعہ فون پر بات چیت کی مگر نجانے کیوں سالم سے کوئی بات نہ ہو سکی۔ جب بھی بات ہوتی یا تو وہ اسکول گیا ہوتا تھا، یا مسجد میں، یا سو رہا ہوتا تھا۔ میری تمنا تھی کہ میں اس کی آواز سنوں۔

باقی بچوں سے بات ہوگئی مگر میں سالم کی صدا سننے کو ترس گیا۔

جب بھی اہلیہ کو فون کرتا، وہ مجھے سالم کی باتیں سناتی تھی۔ گھر میں خوشیوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا، پھر ایک دن ہم نے واپسی کا ارادہ کیا۔ میں نے آنے سے پہلے اہلیہ کو فون کیا کہ میں واپس آ رہا ہوں۔ بچوں کا کیا حال ہے؟ سالم کیسا ہے؟ آج میں نے محسوس کیا کہ اس کا لہجہ بدلا ہوا ہے۔ وہ شوق اور وہ بے تابی جس کے زیر اثر میں وہ مجھ سے باتیں کیا کرتی تھی، آج معدوم تھی۔ میں نے کہا کہ سالم کو میرا سلام کہنا اور بتانا کہ میں آ رہا ہوں۔ اہلیہ ان شاء اللہ کہہ کر خاموش ہوگئی اور فون بند ہوگیا۔

میں گھر واپس آیا، دروازے پر دستک دی۔ میں چشمِ تصور سے دیکھ رہا تھا کہ سب سے پہلے سالم میرا استقبال کرے گا، دروازہ بھی وہی کھولے گا لیکن مجھے بڑا تعجب ہوا کہ سالم کے بجائے میرا چار سالہ بیٹا خالد بابا بابا کہتا ہوا میرے ہاتھوں میں جھول گیا۔ اس روز نجانے کیوں مجھے سینے میں گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے أعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم پڑھی۔...... گھر میں داخل ہوا۔ بیوی استقبال کے لیے آگے بڑھی۔ اس کا چہرہ اُترا ہوا نظر آیا۔ ہر چند چہرے پر مسکراہٹ تھی مگر اس سے تصنع اور بناوٹ جھلک رہی تھی۔ میں نے پوچھا: خیر تو ہے؟ تمھیں کیا ہوا؟ کہنے لگی: کوئی بات نہیں۔

اور پھر اچانک سالم کا خیال آیا...... سالم کدھر ہے؟......

اہلیہ نے سر جھکا لیا...... کوئی جواب نہ دیا...... اس کے چہرے پر آنسوؤں کی جھیل بہنے لگی۔ میں چیخ اُٹھا...... سالم...... سالم کہاں ہے؟...... میرا بیٹا خالد آگے بڑھا اور توتلی زبان میں کہنے لگا: بابا...... سالم جنت میں چلا گیا۔ اللہ تعالیٰ کے پاس!...... میری اہلیہ کے صبر وقرار کا پیمانہ چھلک اُٹھا، وہ بلک بلک کر رونے لگی اور شدید صدمے کے مارے

نڈھال ہو گئی...... میں کمرے سے نکل آیا۔ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔ خوب پھوٹ پھوٹ کر رویا......

معلوم ہوا کہ میرے واپس آنے سے دو ہفتے پہلے سالم کو بخار ہوا تھا۔ اہلیہ نے اسے ہسپتال داخل کرایا، ماہر ڈاکٹروں سے علاج کرایا مگر...... مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی...... بخار تیز ہوتا گیا ایک دن اُس نے آخری ہچکی لی اور پھر اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی!...... ؎

یہ پھول اپنی لطافت کی داد پا نہ سکا
کھلا ضرور مگر کھل کے مسکرا نہ سکا

سالم نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں مگر اس سے پہلے وہ میری غفلت شعار آنکھیں کھول چکا تھا۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

وہ یمن کا بڑا مشہور کاہن تھا۔ اس کا رنگ کالا بھجنگ اور جسم نہایت موٹا اور بھدا تھا۔ وہ جتنا سیاہ پوست تھا، اتنا ہی سیاہ دل بھی تھا۔ اس کا نام عبہلہ بن کعب تھا مگر لوگ اسے ''اسود عنسی'' کے نام سے جانتے تھے۔ یہ شخص بلا کا مکار اور حیلہ ساز تھا۔ اس دور میں اس سے بڑھ کر کوئی شعبدہ باز نہ تھا۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا آخری دور تھا۔ عرب اس زمانے میں عموماً ان پڑھ اور جاہل تھے۔ یمن میں اسلام کی روشنی آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی مگر پھر بھی جہالت عروج پر تھی۔ یمن میں اس وقت دو بڑے کاہن تھے۔ لوگ ان کا لوہا مانتے تھے۔ ان کے بارے میں عجیب وغریب قصے مشہور تھے۔ لوگ یہ قصے اپنی مجالس میں مزے لے لے کر بیان کرتے تھے۔ ایک کاہن نصف انسان کی صورت میں تھا، اسے شقا کہا جاتا تھا۔ اور دوسرا کاہن حرکت تک نہ کرسکتا تھا، اسے سطیحا بولا جاتا تھا۔ لوگوں کی اس جہالت کا عبہلہ نے خوب فائدہ اٹھایا۔ شعبدہ باز تو وہ پہلے ہی تھا، چنانچہ اس نے ان کاہنوں کی مدد سے یمن پر قبضہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ بدقسمتی سے اس کے اردگرد مریدوں کا ایک بڑا ٹولہ جمع ہوگیا۔ وہ لوگوں کے پاس جا جا کر اس کی کرامتوں کے قصے بیان کرنے اور اسے اللہ کا برگزیدہ بندہ کہنے لگے۔ شروع میں اس کے ساتھ صرف سات سو آدمی تھے۔ یمن پر اس دور میں کسریٰ کے مقرر کردہ امیر باذان کی حکومت تھی۔ پہلے ہم مختصراً یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یمن میں کسریٰ کی حکومت کیسے آئی تاکہ قارئینِ کرام کو اس علاقے کی تاریخ کا صحیح

علم ہو جائے۔ ایک زمانے میں یمن، قبیلہ حمیر کے ماتحت تھا۔ ان کے بادشاہ تُبَّع کہلاتے تھے، پھر شاہ حبشہ نے اپنے دو جرنیلوں اشرم اور ارياط کو فوج دے کر بھیجا۔ انھوں نے حمیر سے یمن چھین لیا۔ یوں یہ ملک حبشیوں کے قبضے میں آ گیا، پھر اشرم اور ارياط میں جھگڑا ہوا تو ارياط مارا گیا، اشرم فتح یاب ہوا۔ اسی اشرم کا نام ابرہہ تھا۔ یہ مذہبًا عیسائی تھا۔ اس نے یمن میں ایک بہت بڑا کلیسا بنایا اور چاہا کہ عرب کعبہ کو چھوڑ کر اس کلیسا کا حج کریں۔ ایک قریشی نے اس کلیسا میں پاخانہ کر دیا۔ جب ابرہہ کو یہ اطلاع ملی تو اس نے حلف اٹھایا کہ وہ بیت اللہ کو تباہ کر دے گا، چنانچہ وہ ہاتھیوں کا غول ساتھ لے کر مکہ کی طرف چل پڑا اور خائب و خاسر ہوا۔ اس کی تفصیل سورۂ فیل میں موجود ہے۔ ابرہہ مکہ سے واپسی کے دوران راستے ہی میں سخت بیمار ہو گیا۔ اس کے اعضاء مسلسل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گرتے رہے۔ جب وہ صنعاء پہنچا تو اس کا دل پھٹ گیا اور وہ مر گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا بادشاہ بنا، پھر اس کا بھائی مسروق بن ابرہہ بادشاہ بنا۔ یمن کی حکومت کم و بیش ستر سال تک حبشیوں کے ہاتھ میں رہی، پھر سیف بن ذی یزن حمیری قیصرِ روم سے ان کے خلاف مدد مانگنے گیا چونکہ حبشی عیسائی تھے، لہٰذا اس نے ہم مذہب ہونے کی وجہ سے ان کے خلاف مدد دینے سے انکار کیا، پھر وہ ایرانیوں کے بادشاہ کسریٰ کے پاس گیا اور اس سے مدد مانگی۔ کسریٰ راضی ہو گیا، چنانچہ کسریٰ کی مدد سے حبشیوں سے یمن کا قبضہ چھڑا لیا گیا۔ مسروق بن ابرہہ کو قتل کر دیا گیا اور دستور کے مطابق سیف بن ذی یزن کو بادشاہ مقرر کیا گیا۔ عرب ہر جانب سے مبارک باد دینے آئے۔ اس کے علاوہ بھی مختلف ملکوں پر کسریٰ کے نائب مقرر تھے۔ یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا حتیٰ کہ اللہ کے رسول ﷺ کی بعثت ہوئی۔ صلح حدیبیہ کے بعد اللہ کے رسول ﷺ نے جن امراء اور بادشاہوں کو خطوط ارسال فرمائے، ان میں ایران کا شہنشاہ خسرو پرویز بھی شامل تھا۔ اس نے جب خط پڑھا تو دیکھا کہ آپ ﷺ نے کسری

کے نام سے پہلے اپنا نام لکھا ہے۔ اس پر خسرو پرویز بہت غضبناک ہوا، اس نے خط پھاڑ دیا اور اپنے یمن کے گورنر باذان کو لکھا کہ جب تمھیں یہ خط ملے تو جزیرہ نمائے عرب کے اس شخص کی طرف دو آدمی بھیج دو جو اپنے آپ کو نبی سمجھتا ہے تاکہ وہ اسے گرفتار کر کے میرے پاس لے آئیں۔ باذان نے دو سمجھدار ہٹے کٹے آدمی مدینہ بھیجے۔ اس نے ہدایت کی کہ ان کے پاس جاؤ جو نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ دیکھو وہ کیسے ہیں۔ اگر وہ جھوٹے ہیں تو گرفتار کر کے خسرو کے پاس لے جاؤ۔ اور وہ سچے معلوم ہوں تو مجھے ان کے معاملے کی اطلاع دو تاکہ میں اس پر غور وفکر کروں۔ وہ دونوں مدینہ پہنچے تو آپ ﷺ کو نہایت اچھے حالات میں پایا۔ وہ مدینہ میں ایک ماہ تک رہے۔ انھوں نے رسالتِ مآب ﷺ کو باذان کا پیغام پہنچایا تو آپ نے ازرُوئے وحی انھیں بتایا کہ آج منگل کی رات 10 جمادی الاولیٰ 7 ہجری کو میرے رب نے تمھارے آقا کو قتل کر دیا ہے۔ وہ دونوں بولے: کچھ ہوش ہے، یہ آپ ﷺ کیا بات کر رہے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم اس کی تصدیق کر لو۔ ادھر باذان کو جب یہ اطلاع ملی تو اس نے کہا: اگر یہ خبر سچ ہے تو پھر یہ سچے نبی ہیں ...... پھر چند دنوں کے بعد کسریٰ کے بیٹے کا خط آ گیا جس میں اس نے لکھا کہ میں نے اپنے باپ کو قتل کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے وعدہ فرمایا تھا کہ اگر باذان اسلام قبول کر لے تو حکومت اسی کے پاس رہے گی، چنانچہ اس نے اپنے ساتھیوں سمیت اسلام قبول کر لیا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اقتدار باذان ہی کے پاس رہنے دیا۔

باذان کی وجہ سے یمن میں اسلام کی روشنی پھیلتی گئی اور آپ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل، حضرت ابوموسیٰ اشعری اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کو تبلیغ کے لیے بھیجا۔ باذان وفات پا گیا تو اللہ کے رسول ﷺ نے اس کے بیٹے ''شہر'' کو صنعاء اور بعض دوسرے صوبوں پر نائب مقرر

کیا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم یمن کے لوگوں کو تعلیم دیتے رہے۔ وہ دینِ حنیف کی تبلیغ و تعلیم کے لیے ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل ہوتے رہتے تھے۔ یہ سب کچھ اللہ کے رسول ﷺ کی زندگی کے آخری زمانے 10 ہجری میں ہوا۔ اسی دوران یہ لعین اسود عنسی منظرِ عام پر نمودار ہوا اور اس نے طاقت پکڑی۔

اس نے اللہ کے رسول ﷺ کے کارندوں کو لکھا کہ تم نے ہمارا جو علاقہ ہتھیا لیا ہے اور جتنا مال جمع کیا ہے، وہ سب واپس کر دو، ہم اس کے زیادہ حقدار ہیں، پھر وہ نجران کی طرف بڑھا، وہاں قبضہ کیا۔ پھر صنعاء کا قصد کیا، وہاں اس کا مقابلہ شہر بن باذان سے ہوا۔ بد قسمتی سے اس لڑائی کا نتیجہ اسود عنسی کے حق میں نکلا۔ ''شہر'' کو شکست ہوئی۔ وہ شہید ہو گیا اور اسود عنسی نے یمن پر مکمل قبضہ کر لیا۔ یمن کے بہت سے لوگ مرتد ہو کر اسود کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ اس نے ''شہر'' کی بیوہ ''آزاد'' سے زبردستی نکاح کر لیا۔ یہ نہایت حسین و جمیل، سچی مسلمان، نہایت نیک سیرت اور صالحہ خاتون تھی۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ صنعاء سے ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضر موت چلے گئے۔ اس دوران صنعاء کے مسلمانوں نے اپنے ایمان کو چھپائے رکھا۔ آزاد کو اسود عنسی سے سخت نفرت تھی۔ جب اللہ کے رسول ﷺ کو ان واقعات کی اطلاع پہنچی تو آپ نے یمن کے مسلمانوں کو اسود عنسی پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ ادھر اسود عنسی نے اپنا اقتدار مضبوط کر لیا اور ہر گھر میں اپنے جاسوس داخل کر دیے۔ شہر کی بیوہ آزاد نے بھی بڑی حکمت عملی سے کام لیا۔ اس نے فرعون کی بیوی آسیہ کی طرح اپنا ایمان چھپائے رکھا۔ اسود بھی اس پر اعتماد کرنے لگا۔ اسود کے حاشیہ نشینوں میں ایک ایرانی النسل شخص فیروز تھا۔ وہ شہر کی بیوہ آزاد کا دودھ شریک اور چچا زاد بھی تھا۔ جب بھی وہ اپنی بہن سے ملنے جاتا تو وہ عبہلہ کے ظلم و ستم کی شکایت کرتی، اس

کے غلط عزائم سے آ گاہ کرتی۔ ادھر مسلمانوں کی فوج کے سپہ سالار ”وَبَر بن یُحنَّس کلبی“ بھی اپنی ذمہ داریوں سے غافل نہ تھے۔ ان کا آزاد اور فیروز سے مسلسل رابطہ تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب اللہ کے رسول ﷺ سخت بیمار تھے اور آپ کا آخری وقت آ چکا تھا۔ مسلمان ان کی تیمارداری میں مصروف تھے، ادھر فیروز اور امیرہ آزاد میں عبہلہ اسود عنسی کو ٹھکانے لگانے کا پروگرام طے پا گیا۔ عبہلہ کے ارد گرد اس قدر کڑا پہرہ رہتا تھا کہ اسے قتل کرنا ناممکنات میں سے تھا۔ آزاد نے فیروز کو محل میں ایک ایسی تنگ وتاریک جگہ بتائی جہاں کوئی محافظ نہیں ہوتا تھا اور وہ مناسب وقت تک وہاں چھپ سکتا تھا۔ آزاد نے فیروز کو پیغام بھیجا کہ تم فلاں دن فلاں وقت اسی جگہ پہنچ جاؤ۔ میں اس رات عبہلہ کو خوب شراب پلاؤں گی، نتیجتاً اس کی عقل ماری جائے گی۔ اسے ارد گرد کا کوئی ہوش ہی نہیں رہے گا۔ اسی لمحے تم اسے قتل کر دینا۔ فیروز مقررہ وقت پر محل پہنچ گیا اور اپنی تلوار لیے مقررہ تنگ جگہ میں چھپ کر رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ رات کو عبہلہ سونے کے لیے آیا، اس کے محافظ محل کے کونوں پر تعینات تھے اور حسب دستور پہرہ دے رہے تھے۔ اس نے سونے سے پہلے حسبِ معمول خوب شراب نوشی کی اور دھت ہو کر بستر پر گر گیا۔ جلد ہی اس کے خراٹوں کی خوفناک آواز آنے لگی۔ ادھر فیروز اسی وقت کا منتظر تھا، آزاد نے چراغ جلا رکھا تھا، اس نے اپنی تلوار سنبھالی اور پوری قوت سے عبہلہ پر وار کیا۔ وہ بیل کی طرح اتنی شدت سے ڈکرایا کہ اس قسم کی دل خراش آواز کبھی نہ سنی گئی تھی۔ عبہلہ کی گرجدار چیخیں دور تک گونجتی چلی گئیں۔ محافظ چوکنے ہو گئے۔ وہ عبہلہ کے کمرے کی طرف دوڑے۔ ادھر فیروز نے دوبارہ بھرپور وار کیا جو کاری ثابت ہوا۔ اس دوران محافظ تلوار سنبھالے دروازے تک آ پہنچے۔ وہاں آزاد کھڑی تھی۔ انھوں نے پوچھا کہ ہم نے امیر کی

آواز سنی ہے۔ اسے کیا ہوا؟ وہ بولی: گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تمھارے نبی پر وحی اُتر رہی ہے۔ وہ واپس چلے گئے۔ ادھر صبح ہوئی تو فیروز نے قلعے کی دیوار پر کھڑے ہو کر آواز دی۔ مسلمان اور کافر قلعے کے ارد گرد سب جمع ہو گئے تو اس نے بلند آواز سے کہا: أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰهِ ''میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔'' اور عبہلہ کذاب ہے، پھر اس نے عبہلہ کا سر ان کی طرف پھینک دیا۔ وہ مسلمان جنھوں نے اپنا ایمان چھپایا ہوا تھا، باہر آ گئے، اس طرح عبہلہ کے ساتھیوں نے شکست کھائی۔ مسلمانوں نے انھیں قتل کیا۔ بعض کو قیدی بنایا اور بعض بھاگ گئے اور رسول اللہ ﷺ کے نائبین اپنی اپنی عملداریوں کی طرف واپس چلے گئے۔

خس کم، جہاں پاک، اسود عنسی کا فتنہ ختم ہوا۔ یہ واقعہ اللہ کے رسول ﷺ کی وفات سے صرف تین دن پہلے پیش آیا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے وحی الٰہی کی بنا پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو اسود عنسی کے قتل کی خوشخبری سُنا دی۔ البدایہ والنہایہ میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے حوالے سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: گزشتہ شب اسود عنسی قتل ہو گیا ہے اور اسے ایک بابرکت آدمی نے قتل کیا ہے جو بابرکت اہل بیت میں سے ہے۔ پوچھا گیا: وہ شخص کون ہے؟ فرمایا: فیروز، فیروز۔ اسود عنسی کے قتل کے بعد وقتی طور پر اس کے امراء کی قوت اور حوصلوں کی کمان ٹوٹ گئی۔ بدقسمتی سے دو بڑے امراء قیس بن مکشوح اور عمرو بن معدیکرب بھی اسود کے ساتھیوں میں تھے۔ یہ بڑے بہادر اور جوانمرد تھے۔ یمن کے لوگ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی امامت پر متفق ہو گئے، چنانچہ وہ صنعاء میں لوگوں کو نماز پڑھانے لگے۔ ادھر اللہ کے رسول ﷺ کی وفات کے بعد جہاں دیگر عرب قبائل مرتد ہوئے، وہاں یمن کے بہت سے لوگ بھی مرتد ہو گئے۔ انھوں نے قیس بن مکشوح اور عمرو بن معدیکرب کو اپنا لیڈر بنایا

اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ انھوں نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور دیگر مسلمانوں کو زہر کے ذریعے ہلاک کرنے کا پروگرام بنایا مگر اللہ نے اپنی خاص رحمت سے ان کی یہ سازش ناکام بنا دی۔ فیروز بال بال بچ گیا۔ یہ وقت مسلمانوں کے لیے بلاشبہ بڑا کٹھن تھا مگر حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی ذہانت اور مضبوط موقف کی وجہ سے جلد ہی مرتدین اور مانعینِ زکاۃ پر قابو پا لیا گیا۔ جوں ہی حضرت ابوبکر ؓ کو مرتدین سے فراغت ملی، انھوں نے فیروز کو پیغام بھیجا کہ عنقریب تمھاری مدد کے لیے ہماری فوج آ رہی ہے۔ ادھر فیروز نے مدد آنے سے پہلے ہی مسلمانوں کی قوت کو اکٹھا کر کے صنعاء کے باہر اسود عنسی کے باقی ماندہ متبعین اور مرتدین سے خوب جم کر جنگ کی۔ کافروں کے سردار قیس بن مکشوح اور عمرو بن معدیکرب تھے۔ جنگ کا انجام یہ ہوا کہ یہ دونوں سردار گرفتار کر لیے گئے اور انھیں بیڑیاں پہنا کر مدینہ منورہ روانہ کر دیا گیا۔ اس طرح یمن میں مرتدین کی قوت پاش پاش ہو گئی۔

جب یہ دونوں حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے سامنے پیش ہوئے تو انھوں نے انھیں سرزنش کی۔ دونوں معافی کے طلب گار ہوئے۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے ان کی معافی قبول کر لی، انھیں آزاد کرنے کا حکم دیا اور واپس اپنی قوم کی طرف یمن بھیج دیا۔ حضرت عمرو بن معدیکرب نے قادسیہ کے میدان میں جس بہادری کا مظاہرہ اور مسلمانوں کو فتح دلوانے میں نمایاں کردار ادا کیا، وہ ایک الگ داستان ہے جو تاریخ کی کتب میں مذکور ہے یمن میں ایک مرد صالح فیروز اور صالحہ خاتون آزاد کی بدولت اسلام کا از سر نو غلبہ ہو گیا اور مرتدین نیست و نابود ہو گئے۔ [1]

---

[1] البداية والنهاية 307/6، والكامل في التاريخ 201/2، والعبر في خبر من غبر 12/1۔

باپ کی عدالت سے بیٹے کے خلاف فیصلہ

قاضی شریح بن حارث اپنے بیٹے کے ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ بیٹے نے کہا: ابا جان! میرا کچھ لوگوں سے جھگڑا ہے، میں آپ سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر میں حق پر ہوں تو مقدمہ آپ کی عدالت میں پیش کروں اور آپ انصاف کے تقاضے مدنظر رکھتے ہوئے میرے حق میں فیصلہ کر دیں اور اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میرا مؤقف کمزور ہے اور میں غلطی پر ہوں تو پھر میں سرے سے یہ مقدمہ پیش ہی نہیں کروں گا بلکہ ابھی ان لوگوں کے پاس جا کر کسی طریقے سے صلح کر لیتا ہوں۔

والد نے دریافت کیا: بتاؤ! کیا جھگڑا ہے؟

بیٹے نے تفصیل بتائی۔ قاضی شریح فرمانے لگے: تم پہلی فرصت میں مقدمہ میری عدالت میں پیش کرو۔

اگلے دن مقدمہ پیش ہوا، فریقین حاضر ہوئے، دونوں نے دلائل دیے بعد ازاں قاضی شریح نے اپنے بیٹے کے خلاف فیصلہ سنا دیا۔

عدالت سے فارغ ہو کر باپ بیٹا گھر آئے تو بیٹے نے کہا: ابا جان! آپ نے تو میرے مخالفین کے حق میں فیصلہ کر دیا، یہ کیا بات ہوئی؟

باپ نے کہا: ہاں میرے بیٹے! میں نے ان کے حق میں اس لیے فیصلہ کیا ہے کہ وہ لوگ حق پر تھے۔

بیٹا کہنے لگا: ابا جان! مجھے فیصلے پر اعتراض نہیں۔ ملال یہ ہے کہ میں نے آپ سے مشورہ کیا تھا اور آپ ہی کے ارشاد پر مقدمہ دائر کیا تھا۔ آپ مجھے مقدمہ دائر کرنے کے لیے نہ فرماتے تو میں ان سے صلح کر لیتا اور آج سرِ عام سب کے سامنے جو میری ذلت اور رسوائی ہوئی ہے، اُس کی نوبت نہ آتی۔ آپ نے اُسی وقت کیوں نہ فرما دیا کہ میں جا کر ان سے صلح کر لوں۔ آپ نے تو مجھے بھری عدالت میں ذلیل کر دیا۔

قاضی شریح نے فرمایا:

وَاللّٰهِ! يَا بُنَيَّ لَأَنْتَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ مِّلْءِ الْأَرْضِ مِنْ مِّثْلِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ أَعَزُّ إِلَيَّ مِنْكَ

”بیٹے! اللہ کی قسم! تم مجھے دنیا جہان سے زیادہ عزیز ہو مگر اللہ تعالیٰ تم سے کہیں زیادہ عزیز تر اور محبوب ہے۔“

میرے لیے ہرگز جائز نہیں کہ میں اپنے رب کو ناراض کروں۔ اگر میں تمھیں بتا دیتا کہ حق تمھارے مخالفین کے ساتھ ہے تو تم ان سے صلح کر لیتے، اس صورت میں ان کا حق مارا جاتا۔ مجھے ان کی حق تلفی گوارا نہیں ہوئی۔ اِسی لیے میں نے ”حق بحقدار رسید“ کا اہتمام کر دیا۔[1]

---

[1] المنتظم في تاريخ الملوك والأمم لابن الجوزي 185/6 وصفة الصفوة لابن الجوزي 668/3 ۔

داستان ایک متکبر کی

اس کا نام جبلہ بن ایہم تھا۔ وہ غسان کا بادشاہ تھا...... اس کے دل میں ایمان کی شمع جگمگا اٹھی۔ اس نے اسلام کے بارے میں سنا، اس پر غور و فکر کیا، پھر اسلام قبول کر لیا۔

یہ سیدنا عمر فاروق ؓ کے دور کی بات ہے۔ مسلمانوں کو اس کے اسلام لانے کی خبر ملی تو بہت خوش ہوئے۔ جبلہ نے سیدنا عمر بن خطاب ؓ کو خط لکھا کہ وہ مدینہ طیبہ آنے کی اجازت چاہتا ہے۔ اُسے اجازت دے دی گئی کہ تم مدینہ طیبہ آ سکتے ہو:

وَلَكَ مَا لَنَا وَعَلَيْكَ مَا عَلَيْنَا

”تمھارے لیے وہی کچھ ہے جو ہمارے لیے ہے اور تم پر وہی کچھ واجب ہے جو ہم پر واجب ہے۔“

جبلہ غسان سے روانہ ہوا، اس کے جلو میں پانچ سو گھڑ سوار تھے۔ وہ مدینہ کے قریب پہنچا تو اس نے شاہی لباس پہنا جس کے دامن پر سونے کی دھاریاں تھیں، پھر اس نے ہیروں اور جواہرات سے مرصع تاج سر پر رکھا۔ اس کے گھڑ سواروں نے بھی بہترین لباس پہنے۔ جب وہ مدینہ میں داخل ہوا تو اہلِ مدینہ یہ خوبصورت منظر دیکھنے کے لیے باہر نکل آئے۔ ان میں عورتیں اور بچے سبھی شامل تھے۔

جب وہ عمر فاروق ؓ کی خدمت میں پہنچا تو انھوں نے اس کی عزت افزائی کی، اس کا پرتپاک استقبال کیا، اپنی مجلس میں جگہ دی اور اپنے پاس ٹھہرایا۔

اسی دوران حج کے دن آ گئے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ حج کے لیے روانہ ہوئے، جبلہ بھی ان کے ساتھ تھا۔ جبلہ نے بیت اللہ شریف کا طواف شروع کیا۔ بنوفزارہ کا ایک مسکین شخص طواف کر رہا تھا۔ اتفاق سے اس کا پاؤں جبلہ کی چادر پر آ گیا۔ جبلہ کو بڑا غصہ آیا۔ اُس نے اسے ایسا زوردار تھپڑ مارا کہ اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی۔

فزاری کو بھی سخت غصہ آیا مگر وہ کوئی جوابی کارروائی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے فوراً اپنا مقدمہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی عدالت میں پیش کر دیا۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جبلہ کو بلوایا اور جواب طلبی کی کہ تم نے دورانِ طواف اپنے مسلمان بھائی کو تھپڑ کیوں مارا؟ تم نے تو تھپڑ رسید کر کے اس کی ناک ہی توڑ ڈالی۔ آخر تم نے ایسا کیوں کیا؟

جبلہ نے بڑے غرور سے کہا کہ اس نے میری چادر کو اپنے پاؤں سے مسل دیا، اس کی یہ مجال! اگر مجھے اس مقدس گھر کی حرمت اور عزت کی پروا نہ ہوتی تو میں اس کی گردن اُڑا دیتا۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جبلہ! تم نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا ہے کہ واقعی تم نے اُسے تھپڑ مارا ہے، اب تمھاری نجات کے لیے ایک ہی حل ہے کہ کسی طریقے سے اُسے راضی کر و ورنہ......

جبلہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ اس سے بھی بدلہ لیا جا سکتا ہے۔ اس نے فوراً پوچھا: ورنہ کیا ہوگا؟

ارشاد ہوا کہ اس فزاری سے کہا جائے گا کہ وہ آگے بڑھے اور تمھارے منہ پر ویسا ہی تھپڑ مار کر اپنا بدلہ لے لے!

جبلہ کہنے لگا: اچھا! تو کیا وہ مجھ سے بدلہ لے گا؟...... میں ایک بادشاہ ہوں اور وہ ایک

ادنیٰ سا بے حیثیت آدمی!

فاروق اعظم نے ارشاد فرمایا: اسلام نے سب کو برابر کے حقوق دیے ہیں۔ تم اور فزاری دونوں برابر ہو۔ اسلام کی نظر میں صرف وہی شخص افضل واعلیٰ ہے جو تقویٰ کے لحاظ سے بہتر ہے۔

جبلہ کو اس قسم کے مساوی سلوک کا سان وگمان بھی نہ تھا۔ اس نے کہا کہ میں اس صورت میں دوبارہ عیسائی بن جاتا ہوں۔

ارشاد ہوا: جو شخص اپنے دین، یعنی اسلام سے پھر جائے، اسلام کی رُو سے اس کی سزا موت ہے۔ اگر تم نے عیسائیت اختیار کی تو میں تمھیں قتل کر دوں گا!

جبلہ کہنے لگا: امیر المومنین! اس صورتِ حال پر غور کرنے کے لیے مجھے کل تک کی مہلت عطا فرمائیں۔

فاروق اعظم نے مہلت دے دی۔

رات کا کچھ حصہ گزرا تو جبلہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ مکہ مکرمہ سے نکل بھاگا۔ وہ قسطنطنیہ پہنچا جہاں اس نے دوبارہ عیسائیت قبول کر لی۔

زمانہ بیت گیا...... اس کی جوانی کا رنگ اُڑ گیا...... نقوش ماند پڑ گئے، شان وشوکت دُھندلا گئی۔ اسے اسلام کے ایام یاد آ گئے۔ نماز اور روزے کی لذت بیدار ہونے لگی...... اُسے اسلام چھوڑنے پر ندامت ہوئی...... زیادہ ندامت اس بات پر ہوئی کہ میں اسلام میں داخل ہونے کے بعد دوبارہ مشرک ہو گیا۔ اس احساس کے باوجود وہ آخری عمر تک عیسائیت پر قائم رہا۔ اس نے آخری عمر میں کچھ اشعار کہے جن کا مفہوم یہ ہے:

”شریف خاندان کے ایک چشم وچراغ نے ایک تھپڑ کے بدلے تھپڑ کھانے میں سبکی

محسوس کی جس کی وجہ سے اسلام سے برگشتہ ہو کر عیسائی بن گیا، حالانکہ تھوڑا سا صبر کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ کاش! میری ماں نے مجھے جنا ہی نہ ہوتا، کاش! میں عمر رضی اللہ عنہ کی بات مان لیتا۔ کاش! شام میں میری معیشت کا ادنیٰ سا سامان بھی ہوتا تو میں اپنی قوم کے افراد کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا۔ اب تو میری سماعت بھی ختم ہو رہی ہے اور بصارت بھی۔‘‘

مگر اس احساس کے باوجود اس نے توبہ کر کے دوبارہ اسلام قبول نہیں کیا۔ اُسے شرک اور کفر ہی کی حالت میں موت آئی۔ [1]

---

[1] الاستقصاء لأخبار دول المغرب الأقصى لأحمد بن خالد الناصری 83/1۔

اصحاب اقتدار کی توجہ کے لیے

سلیمان بن عبدالملک مدینہ منورہ آیا تو یہاں تین دن مقیم رہا۔ اس نے پوچھا: کیا مدینہ منورہ میں کوئی ایسا آدمی بھی ہے جس نے رسول اکرم ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی صحبت پائی ہو؟ ہمیں اس کی بات سننے کا شوق ہے۔

اُسے بتایا گیا: جی ہاں! یہاں ایسا ایک آدمی موجود ہے، اُسے ابو حازم[1] کے نام سے جانا جاتا ہے۔

سلیمان بن عبدالملک نے ابو حازم کو بلا بھیجا۔

ابو حازم تشریف لائے تو سلیمان نے پوچھا: ابو حازم! یہ کیسی بے نیازی ہے؟

ابو حازم: جناب والا! آپ کو میری بے نیازی کی اطلاع کس طرح پہنچی؟

سلیمان: مجھے مدینہ منورہ کے تمام اصحاب کے دیدار کا شرف حاصل ہوا لیکن آپ تشریف نہیں لائے؟

---

[1] ان کا نام سلمہ بن دینار تھا۔ فارسی الاصل تھے۔ معروف واعظ اور مدینہ منورہ کے شیوخ میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی والدہ روم سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ بنولیث کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ان کا رنگ گہرا سرخ تھا اور چلنے میں تھوڑی سی لنگڑاہٹ تھی امام ابن خزیمہ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے اور ان کے زمانے میں ان کی مثل کوئی نہ تھا۔ حکمت و دانائی سے بھی انھیں وافر حصہ عطا ہوا تھا۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کہتے ہیں کہ میں نے حکمت و دانائی میں ابو حازم سے بڑھ کر کسی کو نہیں پایا۔ ان سے بہت سی احادیث مروی ہیں۔ وہ مدینہ کی ایک مسجد میں نماز فجر اور عصر کے بعد وعظ کرتے تھے۔ انھوں نے 140 ھ میں ابو جعفر منصور کے دور حکومت میں وفات پائی۔ (سیر أعلام النبلاء 96/6)

ابوحازم: میری اور آپ کی کوئی جان پہچان نہیں۔ کسی قسم کا کوئی تعارف نہیں...... میں ایسی صورت میں آپ کی خدمت میں کس طرح حاضر ہوتا۔

سلیمان: شیخ! آپ نے سچ فرمایا۔ ذرا یہ تو بتایئے کہ ہم موت کو کیوں ناپسند کرتے ہیں؟

ابوحازم: اس لیے کہ تم لوگوں نے دنیا کو آباد اور آخرت کو برباد کر لیا ہے، اسی لیے تمھیں آباد کردہ مکان سے برباد شُدہ گھر کی طرف سفر کرنا ناگوار گزرتا ہے۔

سلیمان: سچ فرمایا۔ یہ بتایئے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس کیسے جانا ہوگا؟

ابوحازم: نیک آدمی کی مثال مسافر جیسی ہے جو اپنے اہل وعیال کے پاس مسرت و شادمانی کے ساتھ آتا ہے اور بُرے آدمی کی مثال بھگوڑے غلام جیسی ہے جو اپنے آقا کے پاس خوف و ہراس کے عالم میں منہ لٹکائے بھیگی بلی کی طرح آتا ہے۔

یہ سن کر سلیمان بن عبدالملک رو پڑا۔ کہنے لگا: کاش! مجھے معلوم ہو جائے کہ اللہ کی بارگاہ میں میرا کیا انجام ہے؟

ابوحازم: اپنے آپ کو اللہ کی کتاب قرآن کریم کی کسوٹی پر رکھو، تمھیں خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ اللہ کے ہاں کون سا انجام تمھارا استقبال کر رہا ہے۔

سلیمان: اے ابوحازم! اللہ تعالیٰ کی کتاب میں مجھے اس کا جواب کہاں مل سکتا ہے؟

ابوحازم: اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ عالی میں:

﴿إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ۝ وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ﴾

”یقیناً نیک لوگ (جنت کے عیش و آرام اور) نعمتوں میں اور بدکار لوگ جہنم میں ہوں گے۔“[1]

---

[1] الانفطار 82:13,14۔

سلیمان: ابوحازم! اللہ تعالیٰ کی رحمت کہاں ہے؟

ابوحازم:

﴿إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ﴾

”بے شک اللہ تعالیٰ کی رحمت نیک کام کرنے والوں کے قریب ہے۔“[1]

سلیمان: سب سے زیادہ عقلمند کون ہے؟

ابوحازم: جس نے حکمت و دانائی سیکھی اور اسے لوگوں کو بھی سکھلایا۔

سلیمان: بے وقوف کون ہے؟

ابوحازم: وہ جو ظلم و زیادتی کرنے والے کی مدد کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور دوسرے کی دنیا بناتے بناتے اپنی آخرت برباد کر بیٹھتا ہے۔

سلیمان: سب سے زیادہ کن لوگوں کی دعائیں اللہ کے دربار میں سنی جاتی ہیں؟

ابوحازم: اللہ کے حضور خشوع و خضوع اختیار کرنے اور اس سے ڈرنے والوں کی۔

سلیمان: سب سے بہتر اور پاکیزہ صدقہ کون سا ہے؟

ابوحازم: کم مایہ آدمی کا طاقت کے بقدر کیا گیا صدقہ۔

سلیمان: ابوحازم! جس حال میں ہم زندگی گزار رہے ہیں، اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ابوحازم: اس سلسلے میں اظہار خیال سے مجھے معاف رکھیے۔

سلیمان: کوئی نصیحت فرمائیے!

---

[1] الأعراف 56:7.

ابوحازم: لوگوں نے خلافت پر قبضہ کر لیا۔ اس سلسلے میں مسلمانوں سے کوئی مشورہ نہیں لیا گیا، نہ ان کی رائے کا اجماع ہوا، چنانچہ ان لوگوں نے دنیا طلبی میں خون کی ندیاں بہائیں اور اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ معلوم نہیں کہ ان لوگوں نے آسمان وزمین کے خالق کو کیا جواب دیا اور ان سے کیا کہا گیا؟

مجلس میں سے کسی آدمی نے یہ سن کر کہا:

یا شیخ! یہ آپ نے بہت بری بات کہی ہے!

ابوحازم: تم جھوٹے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے علماء سے عہد لے رکھا ہے کہ وہ لوگوں کو حق بات پہنچائیں گے اور سچائی کو پوشیدہ نہیں رکھیں گے۔

سلیمان: ابوحازم! آیئے، ہمارے ساتھ ہو جایئے۔ اس طرح آپ ہم سے مستفید ہوں گے اور ہم آپ سے!

ابوحازم: اس بات سے اللہ کی پناہ!

سلیمان: کیوں؟

ابوحازم: خدشہ ہے کہ کہیں میرا میلان آپ کی طرف نہ ہو جائے، پھر دنیا کے چند ٹکوں کے عوض آخرت کے کئی گنا عذاب اور المناک سزائیں میری چمڑی ادھیڑ کر رکھ دیں۔

سلیمان: مجھے کوئی مشورہ دیجیے۔

ابوحازم: اللہ تعالیٰ کا خوف کرو کہ وہ تمھیں ایسی جگہ نہ دیکھے جہاں سے اس نے روکا ہے اور تمھیں ایسا کام نہ کرتے دیکھے جسے اس نے ممنوع قرار دیا ہے۔

سلیمان: ہمارے لیے بھلائی کی دعا فرمائیے۔

ابوحازم: الٰہی! اگر سلیمان تیرا ولی ہے تو اس کے لیے خیر اور بھلائی کے راستے آسان فرما۔ اگر اس کے برخلاف ہے تو اس کی پیشانی خیر کے کاموں پر جھکا دے۔

سلیمان: اے غلام! سو دینار لاؤ............ دینار پیش کر دیے گئے۔

سلیمان: ابوحازم! یہ قبول فرما لیجیے۔

ابوحازم: اس کی مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ اس مال میں میرے اور میرے علاوہ دوسروں کے لیے نمونہ ہے۔ اگر تم نے یہ مال ہمارے درمیان عدل و انصاف سے تقسیم کیا تو ٹھیک ہے ورنہ اس سے مجھے کوئی غرض نہیں۔ بنو

ابوحازم نے مزید فرمایا: بنو اسرائیل جب خیر و بھلائی اور فلاح کے ایام بسر کر رہے تھے، اس زمانے میں ان کے امراء علماء کی سخت ضرورت محسوس کرتے تھے لیکن علمائے کرام کا حال یہ تھا کہ وہ اپنے دین کے بچاؤ کے لیے اُمراء سے دور بھاگتے تھے۔ جب بنی اسرائیل کے گھٹیا لوگوں نے علماء کا یہ مقام و مرتبہ دیکھا تو وہ علم سیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑے اور اس کی بنیاد پر امراء تک ان کی رسائی ہوتی گئی۔ یہ لوگ امراء کے ساتھ معصیت پر اکٹھے ہو گئے۔ اس طرح یہ لوگ اپنے مرتبے سے نیچے گر گئے اور امراء کی اطاعت میں سرِ تسلیم خم کرنے لگے۔ اگر یہ علماء اپنے دین اور علم کا تحفظ کرتے اور امراء کے پٹھو نہ بنتے تو امراء پر ان کا رعب اور دبدبہ قائم رہتا۔[1]

---

[1] مختصر منهاج القاصدين لابن قدامة: ص166. معمولی تصرف کے ساتھ۔

مالکِ ارض وسماء کی پہچان

یہ اللہ کے نبی موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ ابھی نبوت کا تاج نہیں ملا۔ سسرال سے اپنے اہل خانہ کے ساتھ نکل پڑے ہیں۔ صحرا میں تن بہ تقدیر چلے جا رہے ہیں، داہنے ہاتھ میں ایک لاٹھی ہے۔ لاٹھی پر ٹیک لگانے کا کام بھی لیتے ہیں اور بکریوں کے لیے پتے بھی اسی سے جھاڑا کرتے تھے۔ راستے میں اللہ تعالیٰ کا فضل واحسان اور انعام واکرام ان کے استقبال کو تیار ہے۔ اپنے رب کریم سے ملاقات اور کلام کا شرف نصیب ہوتا ہے۔ حکم ملتا ہے: اُس ظالم وجابر اور سرکش مجرم فرعون کی طرف جاؤ جس نے روئے زمین پر دہشت گردی کا بازار گرم کر رکھا ہے جس نے بنی اسرائیل کے بچوں کا قتلِ عام کیا ہے، ان کی خواتین کو لونڈیاں بنا لیا ہے اور پوری قوم کو گمراہی وضلالت کے پھندوں میں پھانس کر خود معبود بن بیٹھا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے شرفِ نبوت کی سرگزشت خود قرآن کی زبانی سنیے:

﴿وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۝ فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ۝ اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ۝ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ﴾

”آپ کو موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بھی معلوم ہے؟ جبکہ انھوں نے آگ دیکھ کر اپنے گھر والوں سے کہا کہ تم ذرا ٹھہر جاؤ، مجھے آگ دکھائی دی ہے، بہت ممکن ہے کہ میں اس کا کوئی انگارا تمھارے پاس لاؤں یا آگ کے پاس سے راستے کا سُراغ مل

> جائے۔ جب موسیٰ علیہ السلام وہاں پہنچے تو آواز آئی: اے موسیٰ علیہ السلام! یقیناً میں ہی آپ کا پروردگار ہوں، آپ اپنے جوتے اتار دیں کیونکہ آپ پاک میدان طویٰ میں ہیں اور میں نے آپ کو منتخب کرلیا ہے، اب جو وحی کی جائے اسے کان لگا کر سنیے۔ بے شک میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، پس آپ میری ہی عبادت کیجیے اور میری یاد کے لیے نماز قائم کیجیے!'' [1]

پس وہی ہے رب العالمین جس نے سارے انسانوں کو اپنی بندگی کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ اہل سنت والجماعت کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی حقیقت یہی ہے کہ اگر کوئی پوچھے کہ اللہ کون ہے؟ تو اس کا جواب یہی ہے کہ اللہ وہ ہے جو پوری کائنات کا خالق' مالک اور مدبر ہے۔ زندگی موت' عزت ذلت' خوشحالی تنگ دستی' سب اسی کے ہاتھ میں ہے' اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اور نہ ہی کسی مخلوق کو اس کی عبادت میں شریک کرنا جائز ہے۔ یوں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی پہچان کرائی اور ان سے فرمایا کہ لوگوں سے میری جان پہچان کرانے سے پہلے آپ خود مجھے پہچان لیں کہ میں کون ہوں:

﴿ اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ○ اِنَّ السَّاعَۃَ اٰتِیَۃٌ اَکَادُ اُخْفِیْھَا لِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰی ﴾

> ''بے شک میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، پس آپ میری ہی عبادت کیجیے اور میری ہی یاد کے لیے نماز قائم کیجیے۔ قیامت یقیناً آنے والی ہے۔ میں اسے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں تاکہ ہر شخص کو اُس کے عمل کا بدلہ دیا جائے۔'' [2]

---

[1] طٰهٰ 20:9-14۔

[2] طٰهٰ 20:14,15۔

لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے

مؤرخ ابن عساکر نے اپنی تحریر کردہ ‘‘تاریخ دمشق’’ میں یہ واقعہ بیان کیا ہے۔ خلیفہ ابوجعفر منصور نے عقبہ بن سَلَم ہنائی کو بصرہ کا گورنر مقرر کیا۔ عقبہ بن سلم ہنائی کے بارے میں بہت جلد لوگوں میں یہ بات پھیل گئی کہ وہ مسلمانوں کا ناحق خون بہاتا ہے، ان کے اموال ناجائز طور پر جھپٹ لیتا ہے اور اللہ کے حقوق کا بھی پاس لحاظ نہیں کرتا۔ عقبہ بن سلم کے بارے میں لوگوں کا یہ تأثر غلط نہ تھا۔ ان دنوں بصرہ کے قاضی سوَّار بن عبداللہ تھے۔

اسی زمانے کا واقعہ ہے، ایک تاجر بحری راستے سے چند قیمتی جواہرات لے کر بغرضِ تجارت بصرہ پہنچا۔ جب اس تاجر کے بارے میں بصرہ کے گورنر عقبہ بن سلم کو معلوم ہوا کہ اس کے پاس قیمتی جواہرات ہیں تو اس نے تاجر کو بلوایا اور اس کے جواہرات غصب کر کے اسے قید خانے میں ڈال دیا۔ ادھر جب تاجر کی بیوی کو معلوم ہوا کہ اس کا شوہر بصرہ کے قید خانے میں بند ہے اور اس کے جواہرات گورنرِ بصرہ نے اُڑن چُھو کر لیے ہیں تو وہ سیدھی بصرہ کے قاضی سوار بن عبداللہ کی عدالت میں پہنچی اور فریاد کی:

> ‘‘قاضی صاحب! میرا شوہر تجارت کی غرض سے قیمتی جواہرات لے کر بصرہ آیا تھا۔ جب یہاں کے گورنر عقبہ بن سلم کو معلوم ہوا کہ میرے شوہر کے پاس قیمتی جواہرات ہیں تو اس نے میرے شوہر کو گرفتار کر کے اس کے جواہرات پر قبضہ کر لیا۔ میں آپ

کی عدالت میں انصاف کے لیے حاضر ہوئی ہوں۔“

خاتون کا مقدمہ سن کر قاضی سوار بن عبداللہ نے گورنر عقبہ بن سلم کو اپنے ایک قاصد کے ہاتھ یہ پیغام بھیجا:

إِنْ كَانَ ذٰلِكَ حَقًّا فَأَطْلِقِ الرَّجُلَ وَارْدُدْ عَلَيْهِ جَوْهَرَتَهُ

”اگر اس خاتون کا مقدمہ برحق ہے تو اس تاجر کو چھوڑ دیجیے اور اس کے جواہرات اسے واپس کر دیجیے۔“

گورنر کو قاضی سوار بن عبداللہ کا یہ پیغام ملا تو وہ طیش میں آ گیا، اس نے قاصد کو بھی برا بھلا کہا اور ساتھ ہی قاضی کو بھی گالیاں سُنا دیں۔

قاصد قاضی سوار بن عبداللہ کی خدمت میں واپس آیا اور گورنر سے ملاقات میں پیش آنے والی ساری صورتحال کہہ سنائی تو اب قاضی سوار بن عبداللہ نے گورنر عقبہ بن سلم کے پاس اپنے خاص سیکرٹریوں کی ایک ٹیم کو وہی پیغام دے کر بھیجا جو پہلے قاصد کے ذریعے بھیجا تھا۔

قاضی کے سیکرٹریوں کی یہ ٹیم پیغام لے کر گورنر عقبہ بن سلم کے پاس پہنچی اور قاضی کا پیغام پہنچایا تو وہ ان پر بھی برس پڑا، ان کی خوب سرزنش کی اور ساتھ ہی قاضی کی شان میں بھی نہایت گستاخانہ کلمات کہے۔ یہ ٹیم قاضی کے پاس واپس آئی اور جو کچھ ان کے ساتھ پیش آیا تھا، وہ کہہ سنایا۔ جب قاضی نے اپنی ٹیم کی چشم دید شہادت سنی اور اسے یقین ہو گیا کہ سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلے گا تو اب اس نے گورنر عقبہ بن سلم کے پاس یہ تحریری پیغام بھیجا:

وَاللّٰهِ! لَئِنْ لَمْ تُطْلِقِ الرَّجُلَ وَتَرُدَّ عَلَيْهِ جَوْهَرَتَهُ لَآتِيَنَّكَ فِي ثِيَابِ بِيَاضٍ مَاشِيًا وَلَأُدَمِّرَنَّ عَلَيْكَ بِغَيْرِ سِلَاحٍ وَّلَا رِجَالٍ، وَّلَأَقْتُلَنَّكَ قِتْلَةً يَتَحَدَّثُ بِهَا النَّاسُ

”اللہ کی قسم! اگر اس بار تو نے تاجر کو قید سے آزاد نہ کیا اور اس کے جواہرات واپس نہ کیے تو میں خود سفید پوشاک میں پیدل تیرے پاس آؤں گا اور کسی ہتھیار، پولیس اور فوج کے بغیر ہی تیری چمڑی ادھیڑ کر رکھ دوں گا اور تجھے عبرتناک طریقے سے قتل کروں گا کہ لوگ ہمیشہ یاد رکھیں گے۔“

جب قاضی سوار بن عبداللہ کا یہ دھمکی آمیز پیغام گورنر عقبہ بن سلم کو ملا اور اس کے ہم نشینوں نے یہ پیغام سنا تو خوف کے مارے سب کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ گورنر سے کہنے لگے:

أَيُّهَا الْأَمِيرُ! وَاللّٰهِ! مَا يَقُولُ شَيْئًا إِلَّا يَفْعَلُهُ

”امیر کی خیر ہو! اللہ کی قسم! یہ قاضی جو کچھ بھی اپنی زبان سے کہتا ہے، اسے بے باکی سے کر گزرتا ہے۔“

ہم نشینوں نے عقبہ بن سلم سے یہ بھی کہا:

”امیر محترم! یہ کوئی عام قاضی نہیں ہے بلکہ امیر المومنین کا قاضی ہے۔ قبیلۂ مضر، قبیلۂ تمیم اور قبیلۂ بلعنبر کے سب افراد اس کی آواز پر لبیک کہتے ہیں۔ مناسب یہی ہے کہ آپ قاضی سوار بن عبداللہ کے پیغام کے مطابق عمل کریں اور تاجر کو اس کے جواہرات سمیت قید خانے سے آزاد کر دیں، اسی میں بھلائی ہے۔“

چنانچہ عقبہ بن سلم ہنائی نے اپنے ہم نشینوں کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے تاجر کو آزاد کر دیا اور اس کے قیمتی جواہرات بھی واپس کر دیے۔[1]

---

[1] دیکھیے تاریخ دمشق، ذکر من اسمه أحمد: 5/56-57.

نومولود کی گواہی

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لَمْ يَتَكَلَّمْ فِي الْمَهْدِ إِلَّا ثَلَاثَةٌ

''......تاریخ انسانی میں......صرف تین بچوں نے گہوارے میں گفتگو کی ہے۔''

ان تین بچوں میں سے ایک تو عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور دوسرے کا قصہ ص 354 پر آرہا ہے جبکہ تیسرا جریج کی گواہی دینے والا ہے۔ اس قصے کی تفصیل یہ ہے کہ جُریج بنی اسرائیل میں ایک عابد وزاہد اور شب زندہ دار بزرگ تھے۔ انھوں نے عبادت کے لیے آبادی سے باہر ایک جھونپڑی نما گرجا گھر بنالیا تھا۔

ایک دن وہ عبادت میں مشغول تھے، ان کی ماں آئی اور آواز دی: اے جُریج! جُریج نے اپنے دل میں کہا: اے اللہ! میری ماں پکار رہی ہے اور میں اس وقت نماز میں مصروف ہوں۔ ماں کو جواب دوں یا نماز میں مشغول رہوں؟ بہرحال وہ اپنی صوابدید کے مطابق نماز پڑھتے رہے اور ماں کی پکار کا جواب نہیں دیا۔ ماں واپس چلی گئی۔ دوسرے دن پھر وہ گرجا گھر آئی، اس وقت بھی جُریج نماز پڑھ رہے تھے۔ ماں نے آواز دی: اے جُریج!......

جُریج نے اپنے دل میں کہا: اے اللہ! میں تیری عبادت میں مشغول ہوں۔ ادھر میری ماں مجھے پکار رہی ہے...... میں کیا کروں؟ بہرحال اِس کشمکش کے باوجود وہ نماز میں مشغول رہے۔ ماں واپس چلی گئی۔ تیسرے دن پھر آئی، اس دن بھی جُریج عبادت میں مشغول

تھے۔ ماں نے آواز دی: اے جُریج! جُریج نے دل ہی دل میں کہا: اے میرے پروردگار! میری ماں اور میری نماز!...... اور وہ چپ چاپ حسب معمول نماز ہی پڑھتے رہے۔ ماں کی صدا کا جواب نہیں دیا۔ ماں کے منہ سے بددعا نکل گئی:

اَللّٰھُمَّ! لَاتُمِتْہُ حَتّٰی یَنْظُرَ اِلٰی وُجُوْہِ الْمُومِسَاتِ

"اے اللہ! اسے اس وقت تک موت نہ آئے جب تک یہ بدکار عورتوں کا منہ نہ دیکھ لے۔"

جُریج کی ماں بددعا کر کے واپس چلی گئی۔ بنی اسرائیل میں جُریج کے بارے میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ وہ جُریج کی عبادت پر حسد کرنے لگے۔...... انھوں نے خود تو جریج کی بلندی تک پہنچنے کی کوشش نہ کی...... البتہ ان کی خواہش تھی کہ وہ جریج کو اپنی پستی تک اُتار لائیں تاکہ وہ بھی ان ہی کی طرح فسق و فجور اور فحاشی و بدکاری میں مبتلا ہو جائیں۔

بنی اسرائیل نے حدودِ الٰہی پامال کر کے پردے کی اہمیت کو فراموش کر دیا تھا، لہٰذا عورتوں اور مردوں کا باہم اختلاط شروع ہو گیا۔ مردوں کی مجلسوں میں عورتیں بناؤ سنگار کر کے شریک ہونے لگیں اور مرد بھی عورتوں سے لطف اندوز ہونے لگے۔ اِس وجہ سے ان میں زناکاری و بدکاری اور سرکشی وطغیانی کی وبا پھیل گئی۔

چنانچہ ماں کی بددعا کے بعد بنی اسرائیل جُریج کی پاکیزہ زندگی کو داغدار کرنے کی منصوبہ سازی کرنے لگے۔ ان لوگوں کی بستی میں ایک بدکار عورت رہتی تھی۔ وہ نہایت خوبصورت تھی۔ لوگ خوبصورتی میں اس کی مثال دیا کرتے تھے۔ اس نے بنی اسرائیل سے کہا: اگر تم چاہو تو میں جُریج کو اپنے دامِ فریب میں پھانس لوں؟ انھوں نے کہا: ٹھیک ہے، یہ بڑی اچھی ترکیب ہے۔

چنانچہ اُس فاحشہ نے خوب بناؤ سنگار کیا۔ جرتج کی خدمت میں پہنچی اور اُن پر ڈورے ڈالنے

لگی۔ لیکن انھوں نے ذرا بھی التفات نہیں کیا۔ اب فاحشہ نے ایک اور چال چلی، وہ ایک چرواہے کے پاس گئی جو جُریج کے گرجے کے پاس رہتا تھا۔ اس چرواہے نے اس فاحشہ کے ساتھ بدکاری کی تو وہ حاملہ ہو گئی۔ جب بچہ پیدا ہوا تو اس نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ بچہ جُریج کا ہے بنی اسرائیل جُریج کو رُسوا کرنے کی تاک میں تھے، وہ ان کے پاس آئے، انھیں عبادت گاہ سے باہر گھسیٹا، اسے ڈھا دیا اور انھیں بری طرح سے زدوکوب کرنے لگے۔

جُریج نے پوچھا: کیا وجہ ہے، تم لوگ مجھے کیوں مار رہے ہو؟

لوگوں نے کہا: تم نے اس بدکار عورت سے منہ کالا کیا ہے۔ اس پاپ کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اس کے بطن سے تیرا بچہ پیدا ہوا ہے۔

جُریج نے پوچھا: وہ بچہ کدھر ہے؟

لوگ اس بچے کو لے کر ان کے پاس آئے۔

جُریج نے کہا: مجھے نماز پڑھ لینے دو۔

چنانچہ وہ نماز پڑھ کر بچے کے پاس آئے اور اس کا پیٹ دبا کر پوچھا:

اے بچے! بتا تیرا باپ کون ہے؟

اللہ کی قدرت سے شیر خوار بچہ بول اٹھا: میرا باپ فلاں چرواہا ہے۔

بچے کی گفتگو سنتے ہی لوگ جریج کو بوسہ دینے اور بطور تبرک چھونے لگے۔

لوگوں نے کہا: ہم آپ کی عبادت گاہ سونے کی بنا دیں گے۔

جُریج نے کہا: نہیں! بلکہ مٹی کی ویسی ہی بنا دو جیسے یہ پہلے تھی۔

چنانچہ لوگوں نے جُریج کی جھونپڑی پہلے ہی کی طرح بنا دی۔[1]

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 3436، و صحيح مسلم، حديث: 2550.

فرشتہ صفت نوجوان شیطان کے نرغے میں

راوی بیان کرتا ہے: ہم لوگوں نے ایک کشتی میں سوار ہو کر مختلف شہروں کا چکر لگانے کا فیصلہ کیا تا کہ اپنے لیے اللہ کی زمین کے کسی حصے میں ذریعۂ معاش تلاش کریں۔ ہمارے ساتھ ایک صالح، پاک طینت اور خوش اخلاق نوجوان بھی آ گیا۔ اس کے چہرے پر تقویٰ اور للّٰھیت کے آثار نمایاں تھے۔ جب بھی دیکھتے وہ باوضو ہوتا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مگن رہتا۔ مہلت پاتا تو صراطِ مستقیم کی طرف دعوت دیتا۔ نماز کا وقت ہوتا تو خود اذان دیتا اور ہماری امامت وہی کرتا۔ ہم میں سے جو نماز سے پیچھے رہ جاتا یا تاخیر کرتا تو اُسے سرزنش کرتا۔ ہمارے پورے سفر میں اس نوجوان کا یہی معمول رہا۔

ہم بحری سفر طے کرتے ہوئے ہند کے ایک جزیرے پر جا پہنچے۔ وہاں کچھ عرصہ قیام کے لیے کشتی سے اترے۔ ہم لوگ یہاں پر خرید و فروخت کرتے اور رات کو کشتی کی طرف لوٹ آتے۔ کشتی والوں میں کچھ گمراہ لوگ بھی تھے۔ وہ لہو ولعب اور خواہشاتِ نفس کی تکمیل کے لیے فسق و فجور کے اڈوں اور طوائف خانوں کے پھیرے لگایا کرتے تھے۔ اُن کے برعکس اِدھر یہ نیک بخت نوجوان ہمیشہ کشتی ہی میں رہتا، کشتی سے اتر کر باہر گھومنے پھرنے نہ جاتا بلکہ اس مدت میں اپنا سارا وقت کشتی کی مختلف چیزوں کی اصلاح و مرمت میں گزارتا تھا۔ وہ رسی بٹتا تھا اور اس سے کشتی کی لکڑیاں درست کر کے باندھتا تھا۔ بقیہ اوقات ذکر اذکار، قراءتِ قرآن اور نماز میں صرف کرتا تھا۔

راوی آگے نہایت افسوس سے بیان کرتا ہے...... ایک مرتبہ ہم لوگ کشتی سے نکلے۔ وہ نوجوان معمول کے مطابق اپنے نیک اعمال میں مشغول تھا۔ کشتی میں اس کے ایک دوست نے اسے کہا: ارے بھئی! تم ہر وقت کشتی سے چمٹے رہتے ہو، کبھی باہر نکلو۔ گھومو پھرو، باہر کیوں نہیں جاتے؟ کشتی سے کیوں نہیں اترتے تا کہ دنیا کی حقیقت سے آگاہ ہوسکو اور اُن دنیاوی چیزوں میں غور وفکر کرسکو جو تمھارے دل کا دریچہ کھولنے اور نفس کو مانوس کرنے میں معاون ثابت ہوں؟ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ سرکشی میں مبتلا کرنے والے اڈوں اور اللہ کی نافرمانی کے لیے مخصوص ٹھکانوں پر چلو، نہ میں یہ تقاضا کرتا ہوں کہ ان مقامات کی سیر کرو جو اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دیتے ہیں، مگر مباح چیزوں کو دیکھنے میں تو کوئی حرج نہیں۔ پھر اس نے وہاں کے بازاروں اور طرح طرح کے کھیل تماشوں کا نقشہ کچھ اس خوبصورتی سے پیش کیا کہ وہ بے اختیار ہو کر کہنے لگا:

کیا اس دنیا میں واقعی ایسی دلچسپ چیزیں بھی ہیں جو تم بیان کر رہے ہو؟

برے ساتھی نے کہا: ہاں ہاں! دنیا تو دور کی بات ہے، اسی جزیرے میں یہ ساری چیزیں موجود ہیں۔ کنویں کے مینڈک نہ بنو، ذرا کشتی سے اتر کر دیکھو، پھر دیکھنا کتنا مزہ آتا ہے اور تمھیں کتنی خوشی نصیب ہوتی ہے!

صالح نوجوان اپنے ساتھی کے اصرار پر کشتی سے اتر آیا۔ دونوں بازاروں کا چکر لگانے لگے۔ چلتے چلتے دونوں ایک ایسے راستے پر ہو لیے جو بہت تنگ اور چھوٹا سا تھا۔ وہ اس راستے پر چلتے رہے، راستے کے آخر میں ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ برا ساتھی اس گھر میں گھس گیا اور نوجوان سے کہا: تھوڑی دیر انتظار کرو، میں جلد ہی واپس آ رہا ہوں لیکن خبردار! تم اس گھر کے قریب نہ پھٹکنا۔

یہ نیک نوجوان اُس گھر کے دروازے سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا اور ذکر اذکار اور قرآن کریم کی تلاوت میں مشغول ہو گیا۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ایک آوارہ قہقہہ گونجا۔ نوجوان حیران ہوا، نظر اُٹھائی تو سامنے ایک نہایت خوبصورت لڑکی نظر آئی نوجوان نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا' پھر اس کا نفس امارہ حرکت میں آیا، وہ آگے بڑھا۔ دروازے کے قریب پہنچا اور دھیان سے گھر کے اندر کی گفتگو سننے لگا۔ اتنے میں پھر ایک نقرئی قہقہے کی آواز سنائی دی جس نے اس کے جذبات میں ہل چل سی مچادی۔ اب وہ لپک کر دروازے سے چمٹ گیا اور سوراخ سے جھانکا تو ہکا بکا ہو گیا، اس کی نگاہ ایسے مناظر پر پڑی جو اس کے لیے بالکل نئے تھے۔ وہ ایسے عریاں مناظر کا مشاہدہ کرتا رہا جنھیں پہلے دیکھنا اُسے ہرگز گوارا نہ تھا، نہ اس قسم کی چیزیں پہلے کبھی اس نے دیکھی تھیں، پھر وہ اپنی جگہ واپس آ کر بیٹھ گیا۔ جب اس کا برا ساتھی دروازے سے باہر آیا تو نوجوان نے اُسے لتاڑا: ارے! تو کیسے گھناؤنے فعل میں مبتلا تھا، تیرا ستیاناس ہو! تیری یہ حرکت اللہ کا غصہ بھڑکانے والی ہے۔

راوی آگے بیان کرتا ہے: ہم رات کو دیر سے کشتی کی طرف آئے اور آتے ہی سو گئے۔

ادھر نوجوان رات بھر جاگتا رہا جو کچھ اس نے دن میں دیکھا تھا، اُس کے خیالوں کا رُخ بار بار اُنھی مناظر کی طرف مُڑ جاتا تھا۔ اگلی فجر طلوع ہوئی اور روشنی نے تاریکی کا پردہ چاک کیا تو سب سے پہلے کشتی سے اترنے والا وہی نوجوان تھا۔ وہ سیدھا فحاشی والے مکان کے پاس پہنچا اور بلا تردد اس میں داخل ہو گیا۔ پھر وہ سب کچھ بھول کر اگلے دو دن تک شراب و شباب میں ڈبکیاں لگاتا رہا۔

ادھر کشتی ران نے کشتی سے نوجوان کو غائب پایا تو پوچھا: مؤذن کدھر گیا؟ ہمارا امام کہاں ہے؟ کیا وہ نوجوان چلا گیا؟

کشتی میں موجود لوگوں میں سے کسی نے کشتی ران کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ اس نے لوگوں کو نوجوان کی تلاش کے لیے مختلف مقامات پر بھیجا۔ جب کشتی ران کو اطلاع ملی کہ فلاں شخص نے نوجوان کو بہکا کر ایک بدنام زمانہ مکان کی سیر کرائی تھی تو اس نے اسے ڈانٹ پلائی اور کہا: تجھے اللہ تعالیٰ کا کوئی خوف نہیں، کیا تجھے اس کی دردناک سزا سے ڈر نہیں لگتا؟ جا اور نوجوان کو جلد سے جلد بُلا کر لا!

بہکانے والا شخص نوجوان کو بلانے گیا لیکن نوجوان نے واپس آنے سے انکار کر دیا۔ اس بہکانے والے آدمی نے اُس سے بڑی منت سماجت سے بارہا کہا کہ کشتی کا کپتان تمھیں بلا رہا ہے۔ اب تمھیں واپس چلنا چاہیے۔ نوجوان نے اس کی ایک نہ سُنی۔ اب وہ اِس رنگین دنیا سے جُدا ہونے کو تیار نہ تھا۔ اُس نے واپسی کا ہر تقاضا مسترد کر دیا۔

جب جہاز ران کو اُس کے واپس آنے سے انکار کی اطلاع ملی تو اس نے چند لوگوں کو بھیجا اور کہا کہ نوجوان کو زبردستی پکڑ لاؤ، چنانچہ وہ لوگ آئے اور نوجوان کو زبردستی کشتی پر لے گئے۔

راوی آگے بیان کرتا ہے: جب کشتی اپنے شہر روانہ ہوئی اور اس میں سوار لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے تو وہ نوجوان کشتی کے ایک گوشے میں جا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کی آہ و بکا سُن کر یوں لگتا تھا جیسے اب اس کے دل کی رگیں پھٹ جائیں گی۔ لوگ اس کے سامنے کھانا پیش کرتے لیکن وہ کھانے کو ہاتھ نہ لگاتا اور کسی سے کوئی بات نہ کرتا۔ وہ کئی دنوں تک اسی طرح بھوکا پیاسا آہ و زاری کرتا رہا۔ ایک رات اس کی آہ و بکا بہت تیز ہو گئی، اس کے پھوٹ پھوٹ کر رونے اور سسکیاں بھرنے کی وجہ سے کشتی میں سوار تمام لوگوں کی نیند اڑ گئی۔

بالآخر کشتی ران آیا اور اس نوجوان سے کہا: ارے! کیا تجھے اللہ کا خوف نہیں، آخر تجھے کیا ہو گیا؟ تیرے رونے دھونے کی صداؤں نے ہماری نیند اڑا کر رکھ دی ہے۔ تیرا ناس ہو، آخر ایسی کیا چیز ہے جس نے تجھے بدل کر رکھ دیا ہے، آخر تجھ پر کون سی آفت آن پڑی ہے؟ نوجوان نے انتہائی افسوس کے ساتھ مریل لہجے میں جواب دیا: مجھے میری حالت پر چھوڑ دو، تم نہیں جانتے کہ مجھے کس آفت نے گھیر رکھا ہے۔

کشتی ران نے پوچھا: بتا تو سہی، تجھے کون سی مصیبت لاحق ہو گئی؟

نوجوان نے اپنی شرمگاہ کھول کر کشتی ران کو دکھلائی، اس کی شرمگاہ سے نہایت کریہہ کیڑے گر رہے تھے۔ کشتی ران نے یہ گھناؤنا منظر دیکھا تو اس پر کپکپی طاری ہو گئی، وہ بے ساختہ بولا: ہم ایسی حالت سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں۔ یہ کہہ کر کشتی ران اس کے ہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

فجر سے کچھ دیر پہلے ایک زبردست چیخ نے کشتی والوں کی آنکھیں کھول دیں۔ لوگ چیخ مارنے والے کی طرف لپکے تو دیکھا وہ نوجوان موت کے شکنجے میں جا چکا ہے اور اپنے دانتوں سے کشتی کی لکڑی پکڑے ہوئے ہے۔

کشتی والوں نے إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ پڑھا اور اللہ تعالیٰ سے حسن خاتمہ کی دعائیں کرنے لگے۔ اس کے بعد اس نوجوان کا قصہ درس عبرت کے طور پر باقی رہ گیا۔ [1]

---

[1] سنیے شیخ احمد القطان کی کیسٹ، نیز دیکھیے کتاب، مائة قصة وقصة للشهاوي، ص: 270.

شیر خوار بچے کا اعلانِ حق

صحیح بخاری، صحیح مسلم اور بعض دیگر کتب میں ایک روایت مروی ہے کہ ایک بچہ اپنی ماں کا دودھ پی رہا تھا۔ اتنے میں وہاں ایک آدمی کا گزر ہوا، وہ بہت خوبرو اور خوش پوشاک تھا اور ایک عمدہ گھوڑے پر سوار تھا۔ عورت نے اس کی شان و شوکت دیکھ کر کہا:

اَللّٰهُمَّ! اجْعَلِ ابْنِي مِثْلَ هٰذَا

”اے اللہ! میرے بچے کو بھی اس جیسا بنا دے۔“

بچہ فوراً ماں کی چھاتی چھوڑ کر اس آدمی کی طرف دیکھنے لگا، پھر بولا: ”اے اللہ! مجھے اس آدمی کی طرح ہرگز نہ بنانا۔“ اور پھر دودھ پینے لگا۔

اسی اثنا میں وہاں ایک اور واقعہ پیش آیا۔ لوگ ایک لونڈی کو مارتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے:

زَنَيْتِ سَرَقْتِ

”تو نے زنا کاری کی ہے۔ تو نے چوری کی ہے۔“

اور وہ لونڈی پکار پکار کر کہہ رہی تھی:

﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾

”اللہ ہمیں کافی ہے، وہ بہت اچھا کارساز ہے۔“[1]

---

[1] آل عمرٰن 3:173 .

یہ منظر دیکھ کر ماں نے کہا:

اَللّٰھُمَّ ! لَا تَجْعَلِ ابْنِي مِثْلَهَا

”اے اللہ! میرے بیٹے کو اس کی طرح مت بنانا۔“

بچے نے دودھ پینا موقوف کیا، اس لونڈی کی طرف دیکھا اور بولا: ”اے اللہ! مجھے اس لونڈی کی طرح بنا دینا۔“ یہ کہہ کر وہ پھر دودھ پینے لگا۔

اس کی ماں نے کہا: ارے میرے بچے! ایک اچھی صورت والا باوقار آدمی گزرا تو میں نے دعا کی کہ اے اللہ! میرے بچے کو اس کی طرح بنا مگر تو نے کہا کہ اے اللہ! مجھے اس کی طرح مت بنانا، پھر لوگ ایک لونڈی کی پٹائی کرتے ہوئے گزرے۔ وہ اس سے کہہ رہے تھے کہ تو نے زنا کیا ہے، چوری کی ہے، میں نے دعا کی کہ اے اللہ! میرے بچے کو اس کی طرح مت بنانا مگر تو بول پڑا کہ اے اللہ! مجھے اس کی طرح بنا دینا...... آخر اس کا سبب کیا ہے؟!

بچہ کہنے لگا: وہ آدمی (جو شان و شوکت کے ساتھ سواری پر جا رہا تھا) ظالم و جابر تھا، اس لیے میں نے کہا کہ اے اللہ! مجھے اس کی طرح مت بنانا اور یہ لونڈی جس کو لوگ مار رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ تو نے زنا کیا ہے، چوری کی ہے، وہ ایک غلط اور بے اصل بات کہہ رہے تھے۔ اس نے زنا کیا تھا نہ چوری کی تھی وہ بالکل بے گناہ تھی، اس لیے میں نے دُعا کی کہ اے اللہ! مجھے اس کی طرح بنا دینا۔ [1]

---

[1] صحيح البخاري، حديث:3436، و صحيح مسلم، حديث: 2550 الفاظ مسلم کے ہیں۔

کامیاب حربہ

محمد بن عبد الملک ہمدانی اپنی تاریخ میں یہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ خلافت عبّاسیہ کے وزیر اعظم عضد الدولہ کو کُرد قوم کے ایک گروہ کے بارے میں شکایت پہنچی کہ یہ لوگ ڈاکو ہیں۔ انھوں نے راہ گیروں کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ ان کا بسیرا پہاڑ کی گھاٹیوں میں ہے۔ یہ وہاں سے گزرنے والے قافلوں کو لوٹ لیتے ہیں اور گھاٹیوں میں چھپ جاتے ہیں۔ ان سے سب ڈرتے ہیں، کسی میں ان سے تعرض کی ہمت نہیں۔ لوگوں نے وزیر اعظم سے درخواست کی تھی کہ وہ اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کریں اور عوام کو ان ڈاکوؤں سے چھٹکارا دلائیں۔

عضد الدولہ نے اس شکایت کا سنجیدگی سے نوٹس لیا اور راہ گیروں کو ڈاکوؤں سے نجات دلانے پر غور کرنے لگا۔ اسے ایک ترکیب سوجھی، اس نے حلوہ بنانے کا حکم دیا، اس میں خوب میوہ جات شامل کرائے اور ایک خاص خوشبو ڈلوائی۔ یہ خاص قسم کا حلوہ تھا جو امراء ہی کھاتے تھے۔ اس نے اپنے ایک خاص آدمی کو حکم دیا کہ وہ چپکے سے اس حلوے میں ایک خطرناک زہر بھی ملا دے تاکہ اسے کھانے والا فوراً مر جائے۔ اس نے یہ حلوہ نہایت خوبصورت طشتریوں میں سجایا، پھر اسے قیمتی صندوق میں بند کرنے کا حکم دیا۔ اب اس نے ایک سمجھدار تاجر کو بلوایا، اسے اعتماد میں لیا اور کہا کہ فلاں قافلہ روانہ ہو رہا ہے، تم بھی اس میں شامل ہو جاؤ۔ جب ڈاکو تمھارا راستہ روکیں اور تمھیں لوٹنے لگیں تو شور مچا دینا کہ میرے پاس اس صندوق میں

بڑا قیمتی حلوہ ہے جو میں امراء کی بیگمات کے لیے بطور تحفہ لے کر جا رہا ہوں۔ تاجر نے اس صندوق کو خچر پر لادا اور قافلے کے ساتھ شامل ہو گیا۔

تاجر ہوشیار تھا۔ عضد الدولہ کا مقصد سمجھ گیا اور قافلے کے ساتھ مہم کی تنفیذ کے لیے روانہ ہو گیا۔ تاجر آگے آگے تھا اور قافلہ اس کے پیچھے پیچھے۔ جب یہ قافلہ اس جگہ پہنچا جہاں ڈاکوؤں کا ٹھکانا تھا، وہاں پہلے ہی سے ڈاکو گھات لگائے بیٹھے تھے۔ وہ اس قافلے کے انتظار میں تھے۔ ڈاکو ایک دم گھاٹیوں سے نکلے اور قافلے پر ٹوٹ پڑے۔ سارا ساز و سامان لوٹ لیا۔ اسی دوران ایک ڈاکو نے اس خچر پر قبضہ کر لیا جس پر حلوہ لدا ہوا تھا۔ تاجر نے شور مچا دیا کہ اس میں امراء کی بیگمات کے لیے حلوہ ہے۔ ڈاکو سامان لوٹ کر پہاڑ پر چڑھ گئے اور غریب مسافر حیران و پریشان کھڑے رہ گئے۔

ڈاکو لوٹ مار سے فارغ ہو گئے تو انھیں بھوک نے ستایا۔ وہ تاجر کی زبانی اس صندوق کے بارے میں پہلے ہی سن چکے تھے کہ اس میں قیمتی حلوہ ہے۔ انھوں نے صندوق کھولا تو اس میں نہایت نفیس حلوہ تھا جس سے بڑی اشتہا انگیز خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو آواز دی تو وہ سب آ گئے، انھوں نے خوشبودار حلوہ دیکھا تو کہنے لگے: یار! یہ حلوہ تو بہت اعلیٰ ہے۔ شاید شاہی گھرانے میں جا رہا ہے۔ انھوں نے اس سے پہلے کبھی اتنا عمدہ حلوہ نہیں دیکھا تھا، چنانچہ وہ حلوے پر پل پڑے اور مزے لے لے کر کھانے لگے۔ بھوک تو پہلے ہی چمکی ہوئی تھی، اس لیے وہ جلد ہی سارا حلوہ چٹ کر گئے۔ حلوے کے زہر نے اپنا اثر دکھلایا۔ کوئی یہاں گرا، کوئی وہاں گرا، دیکھتے ہی دیکھتے سارے ڈاکو موت کی نیند سو گئے۔

مسافروں اور تاجروں کا قافلہ یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ جب انھیں ڈاکوؤں کی موت کا یقین ہو گیا تو انھوں نے جلدی جلدی ان کے اُن تمام اموال و سامان اور ہتھیاروں پر قبضہ

کرلیا جنھیں ڈاکوؤں نے راہ گیروں اور مسافروں کو لوٹ لوٹ کر ذخیرہ کیا تھا، پھر یہ قافلہ ڈاکوؤں کے سامان کے ساتھ عضد الدولہ کی خدمت میں خوشی خوشی حاضر ہوا۔ اس طرح زمین میں فتنہ وفساد پھیلانے والے ان ڈاکوؤں کا صفایا ہوگیا اور فتنہ پروری کے کانٹے جڑ سے اکھاڑ پھینکے گئے۔[1]

---

[1] دیکھیے كتاب الأذكياء لابن الجوزي، ص: 92,91 .

تربیت اولاد سے غفلت کا نتیجہ

حمید کی عمر بیس سال ہو چکی تھی مگر اسے یاد نہیں کہ اُس نے اپنی بیس سالہ زندگی میں ایک دن بھی اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ سنجیدگی سے بسر کیا ہو...... ابھی اس کے والد کے انتقال کو کچھ ہی دن گزرے تھے...... باپ کی موت کے بعد وہ تنہا اپنی ماں کے ساتھ رہ رہا تھا...... مگر اس کے اور اس کی ماں کے درمیان ہم آہنگی نہیں ہو رہی تھی...... تھوڑی دیر کے لیے حمید اپنے والد کے بارے میں سوچنے لگا...... اس والد کے بارے میں جس نے کبھی بھول کر بھی اس کی اچھی تربیت کی کوشش نہیں کی تھی...... اس نے جب آنکھ کھولی تو دیکھا کہ اس کا والد دن رات اخلاق سے گرے ہوئے کاموں میں مشغول رہتا ہے...... اس کی زندگی بہت افسوسناک تھی...... اکثر و بیشتر وہ جب گھر آتا تو معمولی معمولی بات پر اپنی بیوی اور بچے کو فحش گالیاں بکتا تھا...... صرف بیوی بچے ہی کو نہیں بلکہ جس غریب اور لاچار آدمی کو دیکھتا اسے گالیاں دیتا تھا......

حمید کے والد کا بیشتر وقت گھر کے پڑوس میں ایک قہوہ خانے میں گزرتا تھا...... وہ تاش کھیلنے میں مصروف رہتا!...... تاش حمید کے والد کا پسندیدہ مشغلہ تھا...... اور تاش کھیلتے کھیلتے گالی گلوچ اور ہاتھا پائی کرنا اس کی عادت تھی۔

حمید کا والد رات کے آخری پہر میں تھکا ماندا گھر واپس آتا...... بیوی جب تاخیر سے

پہنچنے کا سبب پوچھتی تو اس پر بری طرح برس پڑتا اور بے تحاشا گالیاں بکتا...... بسا اوقات بیوی پر ہاتھ بھی چھوڑ دیتا...... بیوی بھی کچھ کم نہیں تھی...... وہ بھی زبان درازی میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی تھی...... وہ راتوں کو دیر تک آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔

حمید کی پرورش و پرداخت اسی لڑائی جھگڑے اور گالی گلوچ کے ماحول میں ہوئی...... اس نے کبھی اپنے والدین کو مہذب لہجے میں بات کرتے نہیں دیکھا تھا......اس ماحول کا اثر پڑنا یقینی بات تھی، چنانچہ حمید بھی اپنے والدین کا پرتو ثابت ہوا...... وہ بھی اپنے ہم عمر لڑکوں سے جھگڑا کرتا اور انھیں گالیاں بکتا...... وہ اسکول میں داخل ہوا مگر جلد ہی اسے اساتذہ سے بدتمیزی کے الزام میں نکال دیا گیا......

حمید کی عمر اب 14 سال کی ہو چکی تھی...... اس عمر میں اس نے سگریٹ نوشی شروع کر دی۔ اس کی ماں بھی حقہ پیتی تھی...... ماں کی عمر 70 سال سے متجاوز تھی۔ اسے حقہ نہ ملتا تو سگریٹ پی لیتی تھی۔...... اس کا والد بھی سگریٹ اور حقے کا عادی تھا...... حمید آخران کا بیٹا تھا، وہ بھی والدین کے نقشِ قدم پر چلنے لگا......

حمید نے کبھی شراب نہیں چکھی تھی۔ ہاں! ایک مرتبہ اس کا والد شراب پی رہا تھا۔ اسی دوران وہ بھی گھر میں داخل ہوا، اس کے والد نے اُسے خود اپنے ہاتھوں سے شراب کے چند گھونٹ پیش کیے تھے، پھر حمید اس گھٹیا شراب کا عادی ہوتا چلا گیا جو کم قیمت پر بازار میں دستیاب تھی...... مگر یہ شراب عام شرابوں سے زیادہ نشہ آور تھی......

حمید فسق و فجور کی راہ پر چلنے کے لیے اپنی ماں سے مال اینٹھتا رہتا تھا...... باپ کی زندگی میں تو ماں اس کی مراد پوری کرتی رہی، مگر جب شوہر کا انتقال ہو گیا تو حمید کو اس کے حسبِ خواہش مال دینا ماں کے لیے ممکن نہ رہا...... چنانچہ اب اس نے اپنے بیٹے کو پیسہ دینا

بند کر دیا۔ اب حمید بڑی مشکل سے اپنی ماں سے لڑ جھگڑ کر مال لے پاتا...... جب بھی وہ ماں کے سامنے مال کا مطالبہ رکھتا، وہ گالیاں دینا شروع کر دیتی اور بڑی چیخ و پکار کے بعد ہی اسے کچھ مال دیتی...... اس دوران محلے کے لوگ بھی ہنگامہ سن کر اکٹھے ہو جاتے تھے......

جب حمید نے مال کے حصول میں مشکلات دیکھیں تو اس نے کچھ کام کرنے کا سوچا...... لیکن وہ کام بھی کیا کر سکتا تھا؟...... پورے محلے کے لوگ اس کے اخلاق و کردار سے واقف تھے، وہ اُسے کسی قیمت پر اپنے ہاں کوئی کام دینے کو تیار نہیں تھے...... اور جہاں تک بڑی بڑی کمپنیوں یا سرکاری دفاتر کی بات ہے تو اسے وہاں بھی کام نہیں مل سکتا تھا کیونکہ اس کے پاس کوئی ڈگری یا ڈپلومہ نہیں تھا۔ ......

بہت غور و فکر کے بعد اسے ایک کاروبار سوجھا...... واقعی وہ کام اس کے لیے مناسب تھا...... چونکہ اس کی ذہن سازی اور تربیت ہی اس انداز میں ہوئی تھی کہ وہ کسی اچھے کام کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتا تھا...... اس نے بیڑی بنانے اور بیچنے کا کام سوچا اور اپنی ماں کے پاس پیسے مانگنے پہنچ گیا۔ اسے اپنے کاروبار کے ارادے سے آگاہ کیا...... ماں نے کچھ پیسے دے دیے...... اس نے بیڑی بنانے والے پتے خریدے اور نشہ آور بیڑی بنا کر اپنے باپ کے پرانے ساتھیوں کے ہاتھ بیچنی شروع کر دی...... دیکھتے ہی دیکھتے اس کی بنائی ہوئی نشہ آور بیڑی کے خریداروں میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا اور اس کی تجارت چل پڑی...... تھوڑی سی مدت میں اسے توقع سے کہیں زیادہ فائدہ ہوا...... محلے میں اس کی تجارت کا چرچا ہونے لگا اور وہ لوگوں میں مشہور ہو گیا...... اس تجارت سے اس کے پاس بہت سا روپیہ جمع ہو گیا...... ادھر جب اس کی ماں نے بیٹے کی ترقی دیکھی تو اس کی آمدنی سے وہ بھی اپنا حصہ مانگنے لگی...... اس نے بیٹے کو دھمکی دی کہ اگر تم مجھے اپنے منافع میں

سے خطیر رقم نہیں دو گے تو میں پولیس کو خبر کر دوں گی کہ تم غیر قانونی طور پر نشہ آور بیڑیاں بنا کر بیچتے ہو۔

اس وقت ملک بھر میں ایک ہی کمپنی تھی جو بیڑیاں بنا کر سپلائی کیا کرتی تھی اور صرف اسی کے پاس بیڑیاں بنانے کا لائسنس تھا...... کوئی دوسرا آدمی غیر قانونی طور پر سگریٹ بیڑی کا کاروبار کرتا تھا تو اسے نہایت سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔

ادھر حمید کی تجارت زیادہ دن نہ چل سکی۔ شام سے فرانسیسی لوگوں کے نکلنے کے بعد حمید کی کمپنی ماند پڑ گئی...... مزید برآں بہت سے دوسرے لوگ بھی اس پیشے سے منسلک ہو گئے اور بیڑی بنانے لگے جس کی وجہ سے حمید کے خریداروں کی تعداد میں روزافزوں کمی ہوتی گئی...... اب حمید کو اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ اپنی ماں کے پاس موجود مال سے اپنا کام چلائے...... وہ اس مدت کے دوران اپنی ماں کو مال دیتا رہا تھا...... اسی دوران اسے ایک دوسرا کام مل گیا...... اس کے ایک دوست نے لوگوں کی شکایتیں قلمبند کرنے اور انھیں متعلقہ حکام تک پہنچانے کا دفتر کھول رکھا تھا۔ حمید بھی وہاں ملازمت کرنے لگا۔ کچھ عرصے کے بعد اس نے اپنا دفتر کھول لیا......

حمید کی ماں بوڑھی ہو چکی تھی...... اس نے بیٹے کی شادی کرنی چاہی تا کہ گھر میں رونق ہو۔ بہو آئے، اس کی خدمت کرے، گھر کی دیکھ بھال کرے۔ یوں بھی وہ اب حقہ پینے کے سبب بہت کمزور تھی۔

حمید کی شادی ہو گئی...... گھر میں بہو آ گئی...... ماں کو یقین تھا کہ اب گھر کے حالات بہتر ہو جائیں گے...... مگر شادی کے کچھ ہی دنوں بعد حمید کی ماں کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا...... اس نے دیکھا کہ اس کی بہو صرف حمید ہی کی خدمت کرتی ہے اور ساس کا کوئی

خیال نہیں رکھتی...... دونوں میاں بیوی ساتھ کھاتے پیتے، ہنستے، بات چیت کرتے...... مگر ماں کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا...... کوئی اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا بھی نہ کھاتا...... نہ اس کی خیریت دریافت کرتا......

حمید کی ماں کو بڑا صدمہ تھا، گھر میں بہو بیٹا دونوں ہنسی خوشی ہیں مگر اس پر کوئی دھیان نہیں دیتا...... اب وہ اس فکر میں لگ گئی کہ اپنے بیٹے اور بہو کو ان کی بے حسی اور بے نیازی کا مزہ کس طرح چکھایا جائے۔ ...... اس نے عدالت میں پیش ہو کر اپنا گھر اپنی اکلوتی بیٹی کے نام کر دیا جس کی شادی پہلے ہی ہو چکی تھی اور وہ اپنے شوہر کے گھر رہ رہی تھی...... اب حمید کے لیے ماں کے گھر میں رہنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی...... وہ اپنی بیوی کو لے کر اپنے باپ کی طرف سے وراثت میں ملے ہوئے ایک چھوٹے سے گھر میں منتقل ہو گیا...... ماں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ وہ اس گھر میں سے بھی اپنے حق کا مطالبہ کرنے لگی...... کیونکہ اس گھر میں بھی آدھا حصہ اُسی کے نام تھا...... چنانچہ وہ گھر کا کرایہ بھی مانگنے لگی۔

حمید کو ماں کے اس سلوک سے بڑی تکلیف ہوئی...... وہ تنگ آ گیا۔ اپنی کمائی بے روک ہو کر پورے اسراف کے ساتھ اپنے بیوی بچوں پر خرچ کرنے لگا تا کہ نہ اس کے پاس کچھ بچے، نہ ماں اس سے کوئی مطالبہ کر سکے...... ادھر ماں روزانہ بیٹے کے اللّوں تللوں پر جھگڑا کرتی...... ماں بیٹے کو اور بیٹا ماں کو گالیاں دیتا...... بسا اوقات ان کا شور وغل سن کر محلے والے آ جاتے اور ان کا جھگڑا رفع دفع کروا دیتے۔

اتفاق سے ایک دن حمید کی ماں بیٹے کے گھر گئی...... دیکھا کہ بہو کے گھر والے اس کے بیٹے کے دسترخوان پر انواع واقسام کے پُرتکلف کھانے تناول کر رہے ہیں...... یہ صورتِ حال دیکھ کر حمید کی ماں کو بڑا غصہ آیا۔ وہ آپے سے باہر ہو گئی...... اور بہو کے گھر والوں پر

برس پڑی...... گالیاں دینے میں وہ پہلے ہی اتارو تھی......بس اب کیا تھا؟ اُس کی زبان گالیوں کا آتش فشاں اگلنے لگی......حمید بھی سسرال والوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس نے بیٹے کو گالیاں دیتے ہوئے کہا: نکل جا میرے گھر سے، اب میں ایک پل کے لیے بھی تجھے اس گھر میں نہیں رہنے دوں گی۔

حمید سسرال والوں کے سامنے یہ ذلت برداشت نہ کر سکا......فوراً اٹھا اور بوڑھی ماں پر برس پڑا......اس بدبخت نے اپنی ماں کو گالیاں دیں اور پھر مارنا شروع کر دیا......وہ بوڑھی بھی تھی اور کمزور بھی، ایک دم زمین پر ڈھیر ہو گئی......اس نے شدید غصے میں اپنی ماں کو دانت مار کر کاٹ بھی لیا......اس کے خون کا اثر اس کی رگوں میں پھیل گیا......اور اس پر معاً کپکپی طاری ہو گئی......سسرال والوں نے مداخلت کرتے ہوئے حمید سے کہا: اللہ کے بندے! ہوش میں آؤ۔ آخر یہ تمھاری ماں ہے، اس کا احترام کرو۔ تمھیں وحشیوں کی طرح آپے سے باہر نہیں ہونا چاہیے۔

حمید نے سسرال والوں کو جواب دیا: بچپن سے لے کر جوانی تک میں نے اس سے ایک بات بھی قاعدے کی نہیں سنی۔ اس نے میری تربیت پر کبھی دھیان نہیں دیا۔ میں نے بچپن سے آج تک اسے کوئی اچھا کام کرتے نہیں دیکھا۔ یہ میرے برے افعال و اعمال دیکھتی رہی مگر اس نے مجھے کبھی منع نہیں کیا۔ ایسی ماں کو اپنی اولاد کے ہاتھوں یہی سزا بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت سزا ملنی چاہیے...... پھر حمید ماں کو گالیاں بکتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ ماں بھی فحش گالیاں دیتی رہی......اور اس کے لیے بددعائیں کرتی رہی...... یا اللہ! اِسے غارت کر......اسے برباد کر دے...... یہ واپس آئے تو اس کا داہنا ہاتھ اس کی پیٹھ کے پیچھے لگا کر اسے درسِ عبرت کا سب سے بڑا ذریعہ بنا دے!......

رات کے 9 بج رہے تھے۔ اچانک حمید کے گھر کے دروازے کے سامنے ایک گاڑی آ کر رکی۔...... دروازے پر دستک ہوئی۔ جونہی دروازہ کھلا، چند لوگ ایک لاش اٹھائے ہوئے گھر میں داخل ہوئے...... یہ حمید کی لاش تھی۔ اس کی بیوی پر سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ چلانے لگی...... ہائے میرے شوہر کو کیا ہو گیا؟...... یہ کیسے ہو گیا؟...... ادھر حمید کی ماں ''الحمد للہ! الحمد للہ!'' کا ورد کر رہی تھی کیونکہ اس کی مراد پوری ہو گئی تھی۔......

ہوا یہ کہ گھر سے نکلنے کے بعد حمید اپنے دوستوں کے پاس چلا گیا اور تاش کھیلنے لگا۔ اِسی دوران...... اچانک اس کے دماغ کی کوئی رگ پھٹ گئی اور وہ پیٹھ کے بل گر کر آناً فاناً مر گیا...... اس کا داہنا ہاتھ اس کی پیٹھ سے جا لگا تھا...... انتہائی کوشش کے باوجود وہ ہاتھ پیٹھ سے جدا نہیں ہوا......۔[1]

---

[1] ابوالقعقاع محمد بن صالح نے یہ واقعہ اپنی کتاب "قصص من الواقع" (132-126) میں بیان کیا ہے۔ اور ہم نے اسی کتاب سے لے کر اُردو کے پیراہن میں پیش کر دیا ہے۔ فاعتبروا یا أولي الأبصار! دیکھیے! اس واقعے میں ہمارے معاشرے کے کتنے ہی آفات و آلام کی عکاسی کی گئی ہے جو والدین بچوں کی اچھی تربیت نہیں کرتے، وہ کیسی کیسی مصیبتیں جھیلتے ہیں اور ان کی اولاد کتنے اندوہناک انجام سے دو چار ہوتی ہے۔ اِس واقعے میں آج کی نوجوان نسل کے لیے خاص طور پر بہت بڑا سبق موجود ہے۔ جو اولاد ماں باپ کا ادب کرے گی، وہ ہر طرح کے مصائب و مکروہات سے محفوظ اور اللہ رب العزت کی بارگاہ میں محبوب و ممتاز رہے گی۔

طوفانوں کے مقابل کوہ گراں

اس کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جو اپنی عزت اور شرف کی حفاظت کرنے والا تھا۔ وہ روس کی رہنے والی تھی مذہب کے اعتبار سے وہ عیسائی تھی اور ارتھوڈکس فرقے سے وابستہ تھی۔ یاد رہے کہ یہ عیسائیوں کا نہایت متعصب گروہ ہے۔ قصہ یوں ہے کہ ایک روسی تاجر نے اخبار میں اشتہار دیا کہ مجھے انگلش جاننے والی ایسی لڑکیوں کی ضرورت ہے جو بطور مترجم میرے ساتھ عرب ممالک جاسکیں۔ ہم وہاں سے الیکٹرانک سامان خریدنا چاہتے ہیں تاکہ روس لاکر فروخت کریں۔

جلد ہی بہت سی لڑکیوں نے درخواستیں بھیجیں۔ اس نے ان کے انٹرویو لیے، متعدد نہایت خوبصورت لڑکیوں کو منتخب کیا اور انھیں لے کر ایک خلیجی ملک میں آ گیا۔ یہاں آنے کے بعد اس نے انھیں ایک بنگلے میں ٹھہرا دیا اور ان سے کہا: میں تو جسم وجنس کا بیوپاری ہوں۔ میرا مقصد یہاں کسی الیکٹرانک سامان کی خرید وفروخت نہیں بلکہ جسم کی خرید وفروخت کا ہے۔ یہ امیر ملک ہے، تمھارا سراپا خوبصورت ہے، تمھارے چاہنے والوں کی کمی نہیں ہوگی، تم پر دھن برسے گا، بس ہمیں پیسہ چاہیے۔

”مگر ہمارا تمھارے ساتھ یہ معاہدہ تو نہ تھا۔“ ایک لڑکی نے احتجاج کیا۔ اس نے لڑکی کو ڈانٹ دیا۔ اس عیسائی لڑکی کے علاوہ ہر لڑکی نے رفتہ رفتہ ہتھیار ڈال دیے اور بدکاری پر آمادہ ہوگئیں۔ جہاں تک اس عیسائی لڑکی کا تعلق ہے جس کا قصہ ہم بیان کرنے جا رہے ہیں، اس نے نہایت حقارت سے اس کی تمام ترغیبات ٹھکرا دیں اور کہا کہ میں اپنی عزت

کسی قیمت پر نیلام نہیں کروں گی۔ مجھے فوراً میرے وطن واپس بھجوا دو۔

اس نام نہاد تاجر نے اس کا مذاق اڑایا اور کہا: تم پگلی ہو، تمھیں بالآخر میری بات ماننی پڑے گی۔ واپسی کی بات بھول جاؤ، تمھارا ٹکٹ اور پاسپورٹ میرے پاس ہے، تمھارے پاس کچھ نہیں۔ تاجر نے لڑکی کو تنگ کرنا شروع کیا۔ اپنی بات منوانے کے لیے تمام حربے آزمائے، مگر اس لڑکی نے بکاؤ مال بننے کی ذلت گوارا نہ کی۔ اپنی بات پر ڈٹی رہی اور وہاں سے بھاگنے کے منصوبے بنانے لگی۔ ایک دن تمام لڑکیاں بازار گئی ہوئی تھیں اور یہ کمرے میں اکیلی تھی، اس نے تلاشی لینی شروع کر دی تو اللہ نے کرم فرمایا، اسے اچانک ایک الماری میں اپنا پاسپورٹ اور ٹکٹ نظر آ گیا۔ اس نے یہ موقع غنیمت جانا۔ اپنا پاسپورٹ اور ٹکٹ اپنے قبضے میں کر لیا۔ باہر کا دروازہ بند تھا، وہ بنگلے کی دیوار پھاند کر سڑک پر آ گئی۔ اس کے پاس سوائے پاسپورٹ کے کچھ نہ تھا۔ اس کے دل میں کئی سوالات پیدا ہوئے کہ میں یہاں اجنبی ہوں، نہ جانے میرا رخ کس طرف ہے، غریب الدیار ہوں، ایک پیسہ بھی پلے نہیں، نہ خوراک، نہ لباس، نہ رہائش...... مگر وہ اِدھر اُدھر احتیاط سے دیکھتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی۔ اُسے اطمینان اور خوشی یہ تھی کہ وہ عزت کے سوداگروں کے ہتھے نہیں چڑھی اور اس نے اپنی عصمت بچا لی۔ یہ نعمت اس کے لیے بہت بڑی متاع تھی۔

اچانک اس کی نظر ایک نوجوان پر پڑی۔ اُس کے ساتھ تین عورتیں بھی تھیں، وہ اسی کی طرف آ رہے تھے۔ ان میں ایک عورت ادھیڑ عمر کی تھی، دو جوان لڑکیاں تھیں۔ اِس روسی لڑکی کے دل میں گمان گزرا کہ یقیناً یہ ماں بیٹیاں ہیں اور یہ لڑکا اس خاتون کا بیٹا ہی ہوسکتا ہے۔ اشاروں میں بات کرنا قدیم ترین بین الاقوامی زبان ہے۔ لڑکی نے اپنا ہاتھ ہلا کر اشارے سے انھیں روکا، پھر روسی زبان میں کہنے لگی: مجھے آپ لوگوں کی مدد درکار ہے۔

انھوں نے بھی اشارے ہی سے جواب دیا کہ ہمیں تمھاری زبان نہیں آتی۔ اب لڑکی نے انگریزی میں پوچھا: کیا آپ لوگوں کو انگلش زبان آتی ہے؟ اس فیملی نے اثبات میں سر ہلایا۔ لڑکی کے چہرے پر خوشی کے آثار نمایاں ہو گئے، پھر اس کی آنکھیں گیلی ہو گئیں، ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ اُس نے روہانسی آواز میں بتایا: میرا تعلق روس سے ہے، مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ اس نے مختصرًا اپنی مصیبت کا حال سنایا اور بتایا کہ میں بدمعاشوں کے جال میں پھنس گئی تھی، اب کسی نہ کسی طرح نکل بھاگی ہوں۔ آپ مجھے میرے وطن واپس بھجوا دیں۔ میں انسانیت کے نام پر آپ سے مدد کی درخواست کرتی ہوں۔ بس چند دن اپنے گھر رکھ لیں، میرا پاسپورٹ اور ٹکٹ میرے پاس ہے۔ میں اپنے گھر رابطہ کروں گی اور فورًا واپس چلی جاؤں گی۔

ادھیڑ عمر معزز خاتون نے اپنے بیٹے کو حکم دیا: خالد! اس لڑکی کو اپنے گھر لے چلو، ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے۔ وہ بولا: اماں جان! ہو سکتا ہے، یہ فراڈ کر رہی ہو۔ ہم کیا جانیں، اس کی کہانی سچی ہے یا جھوٹی؟ ...... یہ سُن کر خالد کی ماں نے کہا: اسے گھر لے جانے میں کوئی قباحت نہیں، ہم مقامی لوگ ہیں اگر کوئی مسئلہ ہوا تو ہم بآسانی حل کرا سکتے ہیں۔ خالد کی بہنوں نے بھی لڑکی کے بہتے ہوئے آنسوؤں سے متاثر ہو کر اپنی والدہ کی تائید کی، پھر وہ اسے اپنے گھر لے گئے۔

لڑکی نے ان کے گھر پہنچتے ہی اپنے گھر فون کرنا شروع کیا مگر اتفاق سے وہاں کی لائنیں خراب تھیں۔ پوری کوشش کے باوجود اس کا اپنے والدین یا بھائیوں سے رابطہ نہ ہو سکا۔ وہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد فون ملانے کی کوشش کرتی رہی، اس دوران گھر والوں کو معلوم ہو گیا کہ یہ لڑکی عیسائی ہے۔ انھوں نے اس سے نہایت مہذب سلوک اور اعلیٰ اخلاق

کا مظاہرہ کیا۔ خالد کی بہنیں اس سے محبت بھری باتیں کرتی رہیں۔ اسے دلاسے دیتی رہیں اور ساتھ ساتھ اسلام کی آفاقی سچائی سے آگاہ کرتی رہیں۔ آہستہ آہستہ اس روسی عیسائی لڑکی پر اسلام کی سچائی کھلتی چلی گئی اور اس کی آنکھوں سے غفلت کے پردے اُٹھنے لگے۔ وہ گھر والوں سے مختلف سوالات کرتی رہی۔ اس دوران خالد قریبی اسلامی سنٹر گیا، روسی زبان میں اسلامی لٹریچر لے آیا، اور اس عیسائی لڑکی کے حوالے کر دیا۔ یہ لٹریچر پڑھ کر اُس کے دل و دماغ میں آگہی کے چراغ جل اُٹھے۔ چند ہی دنوں میں وہ نہ صرف اسلام کے قریب آ گئی بلکہ اس نے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے سے گھر والوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ خصوصاً خالد کی والدہ کو یہ لڑکی بہت پسند آئی تھی۔ لڑکی کیا تھی، پری تھی، نہایت خوبرو، پڑھی لکھی اور سمجھدار...... خالد کی والدہ نے خوشی سے بے قابو ہو کر اعلان کیا: اگر یہ اسلام قبول کر لے گی تو میں اسے بہت بڑا اعزاز بخشوں گی، یہ میرے گھر کی بہو بنے گی۔ میں اس سے خالد کی شادی کر دوں گی۔ اب یہ میرے ہی گھر میں رہے گی...... اِدھر لڑکی کو یہ خوف لاحق ہو گیا کہ میں واپس روس گئی تو ممکن ہے میرے گھر والے مجھے بطور مسلمان قبول نہ کریں اور دوبارہ عیسائیت اختیار کرنے پر مجبور کریں۔ اس دوران وہ دن رات دینِ حنیف کا مطالعہ کرتی رہی۔ صالحات کی مجلس میں بیٹھتی اور اپنی دینی معلومات میں اضافہ کرتی رہی، پھر ایک دن آیا جب اس نے برضا و رغبت خالد سے شادی کر لی۔ وہ خالد سے کہیں بڑھ کر دین سے محبت کرنے والی ثابت ہوئی۔ بہت سی مسلم عورتوں پر سبقت لے گئی اور اسلامی تعلیمات سے والہانہ محبت کرنے لگی۔

ایک دن وہ خالد کے ساتھ مارکیٹ گئی، اس نے شاید پہلی مرتبہ چند عورتوں کو نقاب پہنے دیکھا۔ خالد سے کہنے لگی کہ کیا ان خواتین کے چہروں پر کوئی داغ یا نشانات ہیں جنھیں

چھپانے کے لیے انھوں نے نقاب پہنے ہوئے ہیں۔ خالد نے جواب دیا: نہیں، ایسی کوئی بات نہیں بلکہ اصل اسلامی پردہ اسی نقاب کا نام ہے۔ ان عورتوں نے اللہ کو راضی کرنے کے لیے حجاب کا اہتمام کر رکھا ہے اور اللہ کے رسول ﷺ نے درحقیقت ایسے ہی پردے کا حکم دیا ہے جس کی بدولت عورت اپنے چہرے کو غیر محرم مردوں سے چھپائے رکھے۔ یہ سن کر وہ خاموش ہوگئی، چند لمحوں تک غور کرتی رہی، پھر کہنے لگی: خالد! تم سچ کہتے ہو، بلاشبہ یہی حقیقی اسلامی پردہ ہے۔ خالد نے پوچھا: یہ تمھیں کیسے معلوم ہوا؟ وہ بولی: میں جب بھی کسی دکان میں داخل ہوتی ہوں تو دکاندار سب سے پہلے میرے چہرے کو گھورتا ہے مگر اب میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ میرا چہرہ صرف میرے سرتاج کی امانت ہے، اب یہ چہرہ نگاہِ غیر سے کبھی آلودہ نہ ہوگا۔ اب میں اس بازار سے مکمل برقع خرید کر واپس جاؤں گی۔ خالد نے کہا کہ تم نے جو حجاب کر رکھا ہے، بس وہ مناسب ہے، اسی کو اختیار کیے رکھو، میری والدہ اور بہنیں بھی تو اسی قسم کا حجاب رکھتی ہیں کہ ان کا چہرہ کھلا ہوتا ہے مگر اس نے کہا: خالد! میں تو ایسے حجاب و نقاب کا التزام چاہتی ہوں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور جس کی تاکید ہمارے رہبر اعظم حضرت محمد ﷺ نے فرمائی ہے۔

وقت کا قافلہ گزرتا چلا گیا۔ وہ بتدریج اپنے اسلام کو پختہ تر کرتی گئی۔ اس کا ایمان نہایت مستحکم ہوگیا۔ اب وہ مکمل اسلامی حجاب ہی میں باہر نکلتی تھی۔ وہ اپنے اعلیٰ اخلاق اور حسنِ کردار کی بدولت تمام اہل خانہ کے دل میں عزت و احترام کی سب سے اونچی مسند پر فائز ہوگئی۔

ایک دن اس نے اپنا پاسپورٹ دیکھا کہ وہ عنقریب ختم ہونے والا ہے۔ اس کی تجدید کے لیے ضروری تھا کہ جس شہر سے اس کا اجراء ہوا تھا، وہیں سے اسے دوبارہ بنوایا جائے،

چنانچہ لازم تھا کہ وہ روس جائے اور وہاں سے نیا پاسپورٹ بنوا کر لائے۔ اس نے خالد سے کہا: اب میں بغیر محرم سفر نہیں کر سکتی، تمھیں میرے ساتھ روس جانا ہوگا۔ خالد راضی ہوگیا، پھر انھوں نے سفر کی تیاری شروع کر دی۔

یہ روسی ائیر لائن کا جہاز تھا، وہ مکمل حجاب کی شان سے جہاز میں بیٹھی تھی۔ خالد بھی اس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سرگوشی کی کہ تمھارے حجاب کی وجہ سے مبادا کوئی مصیبت آ پڑے۔ اس نے کہا: سبحان اللہ! کیا تم چاہتے ہو کہ میں ان کافروں کی اتباع کروں، ان سے ڈر جاؤں اور انھیں راضی کرنے کے لیے اپنے مقدس خالق و مالک کو ناراض کر لوں۔ یہ لوگ جو جی چاہے سوچتے رہیں، مجھے ان کی ذرہ بھر پروا نہیں، وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ لوگوں نے ان کی طرف دیکھنا شروع کیا، ہر شخص اپنے انداز میں تبصرہ کرنے لگا۔ خالد روسی زبان نہیں سمجھتا تھا، اس لیے اس کے پلے کوئی بات نہ پڑی۔ مگر وہ دیکھ رہا تھا کہ کوئی اس پر ہنس رہا ہے، کوئی منہ چڑا رہا ہے اور کوئی مذاق اڑا رہا ہے۔ خالد نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا، وہ بے نیازی سے مسکرا رہی تھی۔ وہ ان کی باتوں کا ترجمہ خالد کو سنانے لگی۔

خالد کے چہرے پر غصے کے آثار اُبھر آئے، وہ کہنے لگی: کیوں پریشان ہوتے ہو؟ شانِ بے نیازی سے ان کی باتیں سنو، غم نہ کرو۔ یہ تو ان پریشانیوں کے مقابلے میں بڑی معمولی بات ہے جو صحابۂ کرام اور صحابیات کو پیش آئی تھیں، چنانچہ وہ دونوں صبر وضبط سے بیٹھے رہے حتی کہ جہاز روس پہنچ گیا۔

خالد کا بیان ہے کہ جب ہم ائیر پورٹ پر اُترے تو میرا خیال تھا کہ ہم سیدھے سسرال جائیں گے، وہاں ہمارا استقبال ہوگا اور ہم روسی پکوانوں کی ضیافت اڑائیں گے مگر میری اہلیہ کا معاملہ مختلف تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میرے خاندان والے آرتھوڈکس مذہب کے

لوگ ہیں اور نہایت متعصب ہیں، وہ ہمیں برداشت نہیں کر پائیں گے۔ ہم پہلے کرائے پر کمرہ لیتے ہیں جب تک پاسپورٹ نہیں بن جاتا، ہم وہیں قیام کریں گے۔ ہاں! واپسی سے پہلے میں اپنے گھر اور خاندان والوں سے مل لوں گی۔ میں نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ ہم نے ہوٹل میں ایک کمرہ کرائے پر حاصل کیا۔ یہ اس کے گھر کے قریب واقع تھا چونکہ اس نے مکمل حجاب کیا ہوا تھا، اس لیے اُسے کسی نے نہیں پہچانا۔

اگلے روز ہم پاسپورٹ آفس گئے۔ متعلقہ کلرک کے پاس پہنچے۔ اس نے سابقہ پاسپورٹ اور تصاویر مانگیں۔ اس نے اپنی تصاویر نکالیں تو یہ بلیک اینڈ وائٹ تھیں، ان میں صرف چہرہ دیکھا جا سکتا تھا۔ اس کا سر اور گردن حجاب میں تھی۔ متعلقہ کلرک کہنے لگا کہ یہ تصاویر ٹھیک نہیں، یہ پرانی اور بلیک اینڈ وائٹ ہیں، ہمیں حالیہ رنگین تصویریں چاہئیں۔

اب ایک نئی بحث کا آغاز ہوگیا۔ کلرک کہتا تھا کہ ہمیں ایسی تصاویر درکار ہیں جن میں سر کے بال کھلے ہوں اور چہرہ گردن تک واضح طور پر نظر آ رہا ہو۔ اس نے کہا کہ میں ایسی تصاویر دینے کے لیے تیار نہیں۔ ہم دوسرے کلرک کے پاس گئے، اس نے بھی انکار کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ ہمیں پردے کے بغیر تصویر درکار ہے۔ اس شعبے کے تمام ملازمین نے رنگین تصویروں ہی کا مطالبہ کیا جبکہ میری بیوی کہہ رہی تھی کہ میں انھیں ایسی تصویر کبھی نہیں دوں گی۔

ہم وہاں سے مایوس ہوکر پاسپورٹ آفس کے منیجر کے پاس گئے۔ میری بیوی نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔ اُس نے دلیل دی: دیکھو! کیا یہ میری حقیقی تصویر نہیں ہے؟ اس نے بھی کسی قسم کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ میری بیوی نے پوچھا کہ اب مسئلے کا حل کیا ہے؟ کون ہے جو ہماری مدد کرے؟ منیجر نے جواب دیا کہ اس کا حل ماسکو میں اس شعبے کے

افسر اعلیٰ کے پاس ہے۔ ہم پاسپورٹ آفس سے نکلے تو وہ کہنے لگی: خالد! ہمیں اب ماسکو جانا ہوگا۔ میں نے کہا: تم انھیں تصویریں کیوں نہیں دے دیتیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾

''اللہ تعالیٰ کسی جان پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالتا۔''[1]

ہمیں اللہ تعالیٰ نے ایک حد تک مکلّف کیا ہے۔ اور ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ ''جہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو''[2] کے تحت ہمیں اللہ تعالیٰ سے اپنی طاقت کے مطابق ڈرنے کا حکم ہے۔ تصویر تو ایک ضرورت ہے، ہماری مجبوری ہے، اسے محض چند افراد دیکھیں گے، پھر ایک مدت تک یہ پاسپورٹ تمھارے پاس رہے گا، تاوقتیکہ اس کی مدت ختم ہو جائے۔ چھوڑو، اس مسئلے کو اتنا طول دینے کی کیا ضرورت ہے۔ میرے خیال میں ماسکو جانے کی ضرورت نہیں۔ اس بات کے جواب میں اس نے دوٹوک الفاظ میں کہا: میرے لیے ناممکن ہے کہ میں دین کا علم حاصل کرنے کے بعد ان لوگوں کو اس قدر عریاں چہرے والی تصویریں دوں۔

وہ اپنی بات پر ڈٹی رہی۔ اس کی ضد کے پیش نظر بالآخر ہم ماسکو پہنچ گئے۔ اگلے دن ہم پاسپورٹ آفس میں صبح سویرے حاضر ہو گئے۔ ایک کلرک سے دوسرے کلرک کے پاس، دوسرے سے تیسرے کے پاس، سب کے وہی سوالات اور میری بیوی کا ایک ہی جواب! بالآخر ہم سب سے بڑے آفیسر کے دفتر گئے۔ یہ شخص نہایت خبیث تھا۔ تصاویر کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا، پھر سر اٹھایا اور میری بیوی سے کہنے لگا: مجھے یہ ثبوت کون دے گا کہ یہ جو تصاویر تم نے مجھے دی ہیں، وہ تمھاری ہی ہیں، اپنے چہرے سے نقاب اُٹھاؤ تاکہ میں

---

[1] البقرۃ 2:286. [2] التغابن 64:16.

تمھاری شکل ان تصاویر کے ساتھ ملا سکوں۔ وہ اس بہانے اس کا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا۔ میری بیوی نے کہا: تم اپنی سیکرٹری کو بلاؤ یا تمھارے دفتر میں جو لڑکیاں کام کرتی ہیں، ان میں سے کسی کو بلواؤ، میں اُسے اپنا چہرہ دکھادوں گی۔ جہاں تک تمھارا تعلق ہے، میں تمھیں چہرہ نہیں دکھا سکتی۔

وہ بڑا افسر تھا، یہ باتیں اس کے لیے اہانت آمیز تھیں، وہ غصے سے بھڑک اٹھا، اس نے پرانا پاسپورٹ اور تصویریں سمیٹ کر میز کی دراز میں رکھ لیں اور کہا کہ جاؤ، جب تک تم اپنی رنگین تصویریں نہیں لاؤ گی، پرانا پاسپورٹ ملے گا نہ نیا۔

میری بیوی احتجاج کرتی رہی۔ منت سماجت کرتی رہی مگر اس شیطان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ دونوں روسی زبان میں گفتگو کر رہے تھے۔ میرے پلے کچھ نہیں پڑ رہا تھا، البتہ میں اشاروں سے جو کچھ سمجھ سکا، وہ یہی تھا کہ ہمارا ماسکو آنا یکسر بے سُود رہا۔ میں نے اپنی بیوی کا بازو پکڑا اور کہا: کیوں قلق کرتی ہو؟ جب یہ نہیں مان رہے ہیں تو آؤ چلتے ہیں، انھیں رنگین تصاویر دے دیتے ہیں۔ ضرورت ہماری ہے، ان کی نہیں ہے۔ ہم کب تک ان دفتروں کے دھکے کھاتے رہیں گے۔ میری بیوی نے کہا: خالد! قرآنِ کریم نے ہمیں بشارت دی ہے:

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ط﴾

”جو اللہ سے ڈرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے نکلنے کے راستے بنا دیتا ہے اور اسے ایسی جگہ سے روزی فراہم کرتا ہے جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔“[1]

اب میرے اور بیوی کے مابین بحث میں تیزی آ گئی۔ میں نے اسے مجبور کیا، وہ

---

[1] الطلاق 65:2,3.

بھی بلند آہنگ ہوگئی۔ پاسپورٹ آفیسر دیر تک ہماری باہمی بحث برداشت کرتا رہا، پھر اس نے ہمیں سختی سے حکم دیا کہ دفتر سے نکل جاؤ۔ میں پریشان ہوگیا۔ کبھی میں اس پر ناراض ہوتا کہ آخر یہ عورت کیا کر رہی ہے؟ کبھی مجھے اس پر ترس آتا۔ میں نے کہا: چلو ہوٹل چل کر اس موضوع پر گفتگو کرتے ہیں۔ رات اُتر آئی۔ ہم نے عشاء کی نماز پڑھی۔ میرے جسم کا انگ انگ درد کر رہا تھا۔ سفر کی مشقت اور مسلسل ناکامی سے میں دلبرداشتہ ہوگیا تھا۔ میں بستر پر لیٹ گیا تو اس کی آواز آئی: خالد! تم سونے لگے ہو۔ میں نے کہا: ہاں! کیا تمھیں کوئی تھکاوٹ نہیں ہوئی؟ کہنے لگی: سبحان اللہ! ان حالات میں تھک جاؤں۔ اٹھو! آج رب سے دُعا مانگنے کی رات ہے۔ صرف وہی ہے جو سب کی بگڑی بناتا ہے۔ آؤ! آج ہم رب العزت کے حضور روئیں، گڑگڑائیں اور اپنی التجا پیش کرکے اپنی حاجت پوری کرالیں۔ اس قادر مطلق کی شان تو یہ ہے کہ وہ اپنی چوکھٹ پر آنے والے کو کبھی کسی غیر کا محتاج نہیں رکھتا...... حق یہ ہے کہ میں اپنی نومسلمہ بیوی کے ایمان کی تازگی اور شادابی دیکھ کر اس پر رشک کرنے لگا۔ وہ اٹھ گئی، مصلّے پر کھڑی ہوگئی۔ میں نے بھی وضو کیا اور کھڑا ہوگیا، پھر جتنی اللہ نے توفیق دی، نوافل ادا کیے۔ اللہ تعالیٰ سے مدد کی درخواست کی۔ میں تو سوگیا مگر میری بیوی نے رات کا بیشتر حصہ مناجات ومعروضات میں گزارا۔ فجر ہوئی تو اس نے مجھے جگایا۔ چلو فجر ہوگئی ہے۔ ہم نے اکٹھے نماز ادا کی۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد صبح 9 بجے ناشتہ کیا۔ وہ کہنے لگی: چلو پاسپورٹ آفس چلتے ہیں۔ میں نے کہا: تم نے تصاویر کا کیا سوچا؟ کہنے لگی: تمھیں اس سے کیا؟ بس تم میرے ساتھ چلو، میں اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہوں۔ ہم تھوڑی دیر کے بعد پاسپورٹ آفس چل دیے۔ میری بیوی بدستور کامل حجاب میں تھی۔ جوں ہی ہم دفتر میں داخل ہوئے، ایک کلرک نے اسے زور سے پکارا:

تمھارا فلاں نام ہے نا؟ جواب دیا: ہاں۔ وہ بولا، یہ لو اپنا پاسپورٹ۔ پاسپورٹ دیکھا تو اس پر مکمل حجاب والی تصویر لگی ہوئی تھی۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور کہا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لیے ہر دشواری سے نکلنے کی راہ کھول دیتا ہے۔

ہم وہاں سے رخصت ہونے لگے تو متعلقہ افسر نے بلایا اور یاد دہانی کرائی کہ تم واپس اپنے شہر جاؤ تو وہاں اس پر مہر لگوا لینا، اسی صورت میں یہ پاسپورٹ استعمال کے قابل ہوگا، چنانچہ ہم واپس اسی شہر میں آ گئے جہاں سے چلے تھے۔ اِدھر میں سوچ رہا تھا کہ اب موقع مل جائے گا کہ ہم اس کے والدین اور بھائیوں سے مل سکیں۔ ہم نے کرائے پر کمرہ لیا، پھر پاسپورٹ آفس گئے اور پاسپورٹ پر مہر لگوائی۔ اس طرح وہ مقصد جس کے لیے ہم روس آئے تھے، الحمد للہ پورا ہو گیا۔

ہمارا آخری مرحلہ اہلیہ کے گھر والوں سے ملاقات تھی۔ ہم ان کے گھر گئے، دروازہ کھٹکھٹایا۔ یہ متوسط درجے کا گھر تھا۔ اس کا صدر دروازہ بازار کی طرف کھلتا تھا۔ بازار میں رونق تھی۔ میری اہلیہ کے بڑے بھائی نے دروازہ کھولا۔ یہ بھاری بھرکم نوجوان تھا، لمبا تڑنگا۔ اس کے بھرے بھرے بازو اس کی طاقت اور جوانی کی گواہی دے رہے تھے۔ میری اہلیہ نے اپنے بھائی کو دیکھا تو بے تاب ہو کر نقاب اٹھا دیا۔ مسکرا کر بھائی کو دیکھا۔ سلام کیا اور اس کے گلے لگ گئی۔ ادھر اس کے بھائی نے اُسے نہ پہچانا مگر چند لمحوں بعد اسے یقین ہو گیا کہ یہ اس کی بہن ہی ہے۔ اُسے اپنی بہن کا حلیہ، لباس اور حجاب دیکھ کر بڑا تعجب ہوا۔ وہ اپنے بھائی کے پیچھے پیچھے گئی۔ میں صحن کے ایک طرف کھڑا تھا، وہاں ایک کرسی تھی، میں اس پر بیٹھ گیا۔ اس کا دوسرا بھائی اور والد بھی آ گیا۔ والدہ اور بہن بھی نکل آئیں۔ وہ

بے حد ناراض دکھائی دیتے تھے۔ میری اہلیہ اندر چلی گئی۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ اندر سے اچانک بھیانک آوازیں آنے لگیں۔ وہ سخت برہم تھے، پھر یکایک اندر سے تین نوجوان نکلے اور مجھ پر درندوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔ میں حواس باختہ ہوگیا کیونکہ میں اس ناگہانی آفت کے لیے تیار نہ تھا۔ انھوں نے مجھے مارنا شروع کر دیا۔ میں اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ تین اور میں اکیلا۔ جسم کا کوئی حصہ نہ تھا جو اُن کی ضربوں سے بچا ہو۔ اچانک ایک زوردار مکا میری ناک پر پڑا، میری نکسیر پھوٹ پڑی اور کپڑوں پر خون گرنے لگا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ انھوں نے مزید مارا تو میری جان بچنی مشکل ہو جائے گی۔ میں پیچھے ہٹا اور دروازہ کھول کر نکل بھاگا، بازار پہنچا۔ انھوں نے مجھے پکڑنے کی کوشش کی۔ میری قسمت اچھی تھی۔ میں راہگیروں کی بھیڑ میں گم ہوگیا، ان کے ہاتھ نہیں آیا۔

میں سیدھا اپنے ہوٹل پہنچا جو زیادہ دور نہ تھا۔ میرے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ چکے تھے۔ جابجا خون کے دھبے لگے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے آپ کو سلامت پا کر اللہ کا شکر ادا کیا۔ لیکن معاً مجھے اپنی بیوی کا خیال آیا کہ نہ جانے وہ بے چاری کس حال میں ہوگی۔ میں چشمِ تصور سے دیکھ رہا تھا کہ اس پر کیا بیت رہی ہوگی۔ میں تو مرد تھا، اتنی مار سہہ گیا۔ کیا ایک تنہا کمزور عورت ان وحشی درندوں کی حرب وضرب سے بچ جائے گی؟ ایسا نہ ہو کہ وہ خودکشی کر لے...... دل میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ شیطان نے میرے دل میں وسوسے ڈالنے شروع کر دیے کہ یہ کمزور عورت ان کا کہاں تک مقابلہ کر سکے گی۔ یقیناً مرتد ہو جائے گی۔ ثابت قدم رہنا بڑا مشکل ہے۔ لگتا ہے مجھے اکیلے ہی وطن واپس جانا پڑے گا مگر میں کب اور کیسے جاؤں؟ کیا اکیلا چلا جاؤں؟ اس کے بھائی تو بہائم ہیں۔ یہ ملک یوں بھی بڑا سستا ہے۔ معمولی سی رقم کے عوض آدمی کا قتل عام بات ہے۔ اس کے بھائی میری

قیام گاہ کا آسانی سے سُراغ لگالیں گے، پھر وہ کسی بھی آدمی کو میرے قتل پر مامور کر سکتے ہیں۔ کرائے کا قاتل محض دس پندرہ ڈالر کے عوض کسی بھی شخص کو ٹھکانے لگا سکتا ہے۔ ایسی گڈمڈ وحشت ناک باتیں سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔ اگلا دن طلوع ہوا، میں صبح سویرے بیوی کے گھر کی طرف چل دیا۔ ایک کونے میں کھڑے ہو کر میں نے دروازے کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے تینوں بھائی گھر سے نکلے، انھوں نے مزدوروں کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کام پر جا رہے ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا، میں نے اندر جھانکا تو مجھے اپنی بیوی نظر آئی۔ اس کا چہرہ سوجا ہوا تھا، مار پیٹ اور زخموں کے نشانات نمایاں تھے۔ جسم پر کہیں کہیں خون کے دھبے تھے۔ میں یہ دلخراش منظر برداشت نہ کر سکا۔ نتائج کی پروا کیے بغیر میں دروازے کی طرف بڑھا۔ اُسے قریب سے دیکھا تو لرز گیا۔ اس کے ہاتھوں اور پاؤں کے زخموں سے خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں، لباس تار تار تھا، پاؤں میں زنجیریں پڑی ہوئی تھیں۔ ہاتھ پیچھے کی طرف بندھے ہوئے تھے۔ اُس کی یہ درگت دیکھ کر میرے آنسو نکل پڑے۔ میں بے ساختہ چیخ پڑا۔ تمھارا کیا حشر ہوا ہے؟ بتاؤ تم پر کیا بیتی ہے؟ کیسی ہو؟ میں اندھا دھند سوالات کرتا چلا گیا۔ اس نے جواب دیا: خالد! بات سنو۔ پریشان ہونے اور رونے دھونے کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک آزمائش ہے۔ یہ تکلیف، یہ پریشانی، یہ مار پیٹ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر گزرنے والے تہلکوں کے مقابلے میں ہیچ اور ناقابلِ توجہ ہے۔ صبر اور دعا کرو۔ سیدھے ہوٹل چلے جاؤ، میرے اور میرے گھر والوں کے درمیان آنے کی غلطی نہ کرنا، یہ وحشی ہیں، تمھیں زندہ نہیں چھوڑیں گے، فوراً چلے جاؤ۔ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلنا۔ وہیں میرا انتظار کرو۔ کثرت سے قیام اللیل کرو۔ سمیع و بصیر کے حضور دعائیں مانگو……

وہ دانائے قلوب ہماری حالت دیکھ رہا ہے، وہ ہم پر ضرور کرم فرمائے گا۔

میں وہاں سے چلا آیا۔ دل پر بڑا بوجھ تھا۔ میں اس شہر میں غریب الدیار تھا۔ یہاں کی زبان سے ناواقف تھا۔ میں نے بے بسی کے عالم میں تکیے پر سر رکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ دن بھر اپنے کمرے میں بند رہا۔ بڑی بے بسی کا عالم طاری رہا۔ بھوک اُڑ گئی، کچھ کھانے پینے کو جی نہ چاہا، نہ نیند آئی، کروٹیں بدلتا رہا اور دعائیں کرتا رہا۔ اگلا دن بھی اسی طرح بیت گیا۔ مجھے اپنی جان کا خطرہ تھا۔ اکیلا وطن بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اگر چلا جاؤں تو بیوی کا کیا بنے گا؟

تیسرے دن رات ڈوب رہی تھی، اچانک کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس وقت دروازے پر کون ہو سکتا ہے؟ میری نگاہوں کے آگے خوف کی پرچھائیاں ناچنے لگیں۔ آدھی رات کا وقت ہے...... ہوسکتا ہے میری بیوی کے گھر والوں کو میری رہائش گاہ کا علم ہو چکا ہو۔ ہوسکتا ہے میری بیوی تشدد کی تاب نہ لا کر اسلام سے پھر گئی ہو۔ ذہن میں طرح طرح کے سوالات گردش کر رہے تھے۔ اُدھر دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔ میں اپنی پوری توانائیاں سمیٹتے ہوئے اٹھا۔ منہ خشک ہو چکا تھا۔ بمشکل آواز نکالی: کون ہے؟ میری بیوی کی دھیمی سی آواز آئی: دروازہ کھولو۔ میں نے لائٹ جلائی اور دروازہ کھولا تو سامنے میری متاعِ حیات کھڑی تھی مگر اس کی حالت بڑی ابتر تھی۔ چہرہ مُرجھایا ہوا، جسم پر زخموں کے نشانات، کپڑے پھٹے ہوئے۔ اس نے بلا تمہید کہا: ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ ہمیں ابھی یہاں سے بھاگنا ہے۔ جلدی سے سامان پیک کرو میں اس دوران کپڑے بدل لیتی ہوں میں نے فوراً سامان سمیٹا۔ اس نے کپڑے بدل لیے، پھر ہم دونوں بھاگ نکلے۔

ٹیکسی میں بیٹھے تو میں نے محسوس کیا کہ وہ بڑی اذیت میں ہے۔ گزشتہ چند دنوں کی وحشیانہ پٹائی نے اس کا انجر پنجر ہلا ڈالا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے ایئرپورٹ چلنے کے لیے کہا۔ میری بیوی نے کہا: نہیں، ہم ایئرپورٹ نہیں جائیں گے بلکہ پہلے فلاں چھوٹے شہر میں جائیں گے۔ میں نے پوچھا...... کیوں؟ کیا اب ہمیں اس ملک سے جلد از جلد نکلنا نہیں چاہیے؟ وہ بولی: نہیں، احتیاط کے پیشِ نظر ضروری ہے کہ ہم ایئرپورٹ نہ جائیں، کسی دوسرے چھوٹے شہر جائیں۔ ایک دو دن بعد کسی بڑے شہر سے سفر کریں گے۔ ابھی میرے گھر والے ہماری تلاش میں سرگرداں ہوں گے۔ میں وہاں سے فرار ہو کر آ رہی ہوں، وہ میری تلاش میں سیدھے ایئرپورٹ پہنچیں گے۔

چنانچہ ہم پہلے ایک شہر میں گئے۔ وہاں سے دوسری ٹیکسی لی، پھر بڑے شہر پہنچے۔ یہاں انٹرنیشنل ایئرپورٹ تھا۔ ہم سیدھے ایک ہوٹل گئے، وہاں سامان رکھا اور ایئرلائن کے دفتر سے ٹکٹ خریدے۔ واپسی کی تیاری کی۔ سفر میں ایک دو دن کا وقفہ تھا۔ ہم گزشتہ دو دنوں سے مسلسل بھاگ رہے تھے۔ جان بھی کیا چیز ہے، اسے بچانے کے لیے انسان کیسے کیسے جتن کرتا ہے، اس کا اندازہ اب ہو رہا تھا۔ بہرحال ہمیں ذرا سا آرام کا موقع ملا تو میں نے بیوی سے کہا کہ اب جبکہ سفر کی تیاری مکمل ہے اور ہمیں تھوڑا سا سکون ملا ہے، میں جاننا چاہتا ہوں کہ والدین کے ہاں تم پر کیا بیتی، تم نے ان ظالموں کی زنجیریں کس طرح توڑیں؟ کس طرح جان چھڑائی اور مجھ تک کس طرح پہنچیں؟ اس نے اپنی سرگزشت اس طرح بیان کی:

> ”جب میں باپردہ لباس میں والدین سے ملی تو انھیں بڑی حیرت ہوئی۔ انھوں نے نہایت تعجب سے میرا لباس دیکھا، پوچھنے لگے کہ یہ کون سا لباس ہے؟ میں نے جواب دیا کہ یہ اسلام کا لباس ہے۔ اُن کا اگلا سوال تھا کہ یہ جو نوجوان تمھارے

> ساتھ ہے، یہ کون ہے؟ میں نے کہا کہ میرا شوہر ہے۔ میں مسلمان ہو چکی ہوں اور اس مسلمان نوجوان سے میں نے شادی کر لی ہے۔ وہ ایک دم طیش میں آ گئے، کہنے لگے: یہ ناممکن ہے۔ میں نے کہا: پہلے میری پوری بات تو سن لو کہ اُس بدبخت روسی تاجر نے مجھ سے کیا سلوک کیا اور میں کن خطرناک حالات سے گزری۔ میں نے مختصرًا بتایا کہ کس طرح اس تاجر نے مجھے بدکاری پر مجبور کیا اور میں کس طرح اس کے پھندے سے بھاگ کر اس خاندان کی پناہ میں آئی۔ ان کا جواب بڑا الم انگیز اور بہیمانہ تھا، وہ کہنے لگے کہ اگر تم بدکاری کا راستہ اختیار کر لیتیں تو یہ ہمارے لیے تمھارے اسلام لانے سے بہتر ہوتا۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہمارے گھر کا کوئی فرد اپنے باپ دادا کے دین سے پھر جائے گا اور مسلمان ہو جائے گا۔ اب اپنی خیریت چاہتی ہو تو تمھارے لیے ایک ہی راستہ ہے، دوسرا کوئی نہیں۔ یا تو تم اپنے مذہب میں واپس آ جاؤ یا مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ انکار کی صورت میں اس گھر سے تمھاری لاش ہی باہر نکلے گی۔''

پھر انھوں نے فورًا مجھے ایک کمرے میں دھکیلا اور تالا لگا دیا، پھر وہ تمھاری طرف بڑھے۔ میں تمھاری چیخیں سن رہی تھی مگر بے بس تھی تم بھاگ گئے تو میرے بھائی واپس آ گئے۔ انھوں نے مجھے پیار سے سمجھایا کہ اسلام چھوڑ دو۔ میں نے یک قلم انکار کر دیا۔ انھوں نے ڈرایا دھمکایا، پھر مجھ پر تشدد شروع کیا۔ گالی گلوچ، طعنے، تھپڑ، گھونسے، لاتیں...... غرضیکہ وہ جو کچھ کر سکتے تھے، پوری سفاکی سے کرتے رہے۔ میں صبر و تحمل سے چپ چاپ ان کا ظلم سہتی رہی مگر آخر کب تک برداشت کرتی، میں بے ہوش ہو گئی۔ اس دوران میرا ایک بھائی بازار گیا، زنجیر خرید لایا اور میرے ہاتھوں اور پاؤں میں زنجیر ڈال کر مجھے ایک

ستون سے باندھ دیا، پھر آزمائش کا اگلا مرحلہ شروع ہوا۔ مجھے جیسے ہی ہوش آتا مار پیٹ، گالیاں اور بددعائیں شروع ہو جاتیں۔ میرے بھائی گھر سے باہر جاتے تو تالا لگا کر چابی ساتھ لے جاتے۔ ادھر مجھے اپنی نہیں، تمھاری فکر تھی کہ نہ جانے تم کس حال میں ہو۔ بھائیوں کے جانے کے بعد گھر میں میری بوڑھی ماں اور چھوٹی بہن رہ جاتیں۔ وہ مجھ سے ہمدردی کرتیں، مجھے سمجھاتیں کہ تم نے اپنے آپ کو عذاب میں کیوں ڈال رکھا ہے۔ بہرحال یہی وقت میرے لیے سکون کا ہوتا تھا ورنہ میرے بھائی تو اتنے شقی القلب ہیں کہ جب تک میں بے ہوش نہ ہو جاتی وہ مجھے مسلسل مارتے رہتے تھے۔ میری ماں ان سے بہت ڈرتی تھی اور ڈر کے مارے ان سے کچھ نہ کہتی تھی۔

میری چھوٹی بہن کی عمر 15 سال ہے۔ وہ آہیں بھرنے کے سوا کچھ نہ کر سکی۔ میرے بھائیوں کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ اسلام ترک کر دو مگر جوں جوں وہ مجھ پر ستم ڈھاتے گئے، اسلام کے لیے میرے دل میں مزید احترام اور استحکام پیدا ہوتا گیا۔ میرے بھائی چلے جاتے تو بہن میرے پاس بیٹھ جاتی۔ وہ پوچھتی تھی کہ آخر میں نے اپنے مذہب کو کیوں چھوڑ دیا؟ وہ اسلام کے بارے میں بھی طرح طرح کے سوالات پوچھتی تھی۔ میں نے اسے آہستہ آہستہ اسلام کی خوبیاں بتائیں۔ توحید و رسالت پر روشنی ڈالی۔ وہ بھی بتدریج اسلام سے متاثر ہوتی چلی گئی۔ آخر وہ میری بہن ہے۔ میری حالت دیکھ کر بہت کڑھتی تھی مگر میرے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ بے چاری مجبور تھی۔ میں اسے اسلام کے اصول و مبادیات بتاتی رہی۔ وہ متاثر ہو گئی اور تیسرے دن بے اختیار بول اُٹھی کہ بلاشبہ تم حق پر ہو۔ یہ دین سچا ہے۔ مجھے بھی یہی سیدھا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ وہ میری حالت زار دیکھ کر بہت روئی اور بولی: بتاؤ میں تمھارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟ میں نے کہا: مجھے اپنے خاوند

کی فکر ہے۔ میں اس کے بارے میں سخت پریشان ہوں۔ کاش! تم اس کا پتہ چلا سکو کہ وہ کس حال میں ہے۔ اس نے دروازہ کھولا تو تمھیں سامنے پایا۔ وہ بھاگتی ہوئی میرے پاس آئی۔ تمھارا حلیہ بتایا اور کہا کہ وہ آدمی ہمارے گھر کے سامنے بازار میں کھڑا ہے۔ میں نے کہا: ہاں! وہی میرا خاوند ہے۔ تم دروازہ کھول دو۔ میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں، پھر میری تم سے بات ہوگئی۔ مجھے قدرے سکون آ گیا۔ شام کو میرے بھائی گھر آتے تو پھر بری طرح زدوکوب کرتے اور فحش گالیاں دیتے تھے۔

میری بہن میری استقامت سے متاثر ہوئی۔ اس کے دل میں بھی ایمان کی محبت پرورش پانے لگی اور وہ برملا اس کا اظہار بھی کرنے لگی، پھر بولی: تم کب تک ان زنجیروں میں جکڑی رہوگی؟ تمھیں نکلنا چاہیے۔ میں اس کی ترکیب کرتی ہوں۔ دراصل میری زنجیروں کی چابی میرے بھائی کے پاس ہوتی تھی۔ میرے فرار کا کوئی راستہ نہ تھا۔ اس دوران میری بہن نے بھی اسلام قبول کرلیا۔ اب وہ مجھے آزاد کرنے کے منصوبے سوچنے لگی۔ اس نے عجیب چال چلی۔ بہت تیز شراب تیار کی۔ اس میں بہت نشہ آور اشیاء ملائیں۔ بھائی گھر آئے تو میری بہن نے انھیں پلانی شروع کی۔ وہ پیتے گئے اور جلد ہی مستی میں آ گئے۔ جب اُن کے ہوش وحواس گم ہو گئے تو میری بہن نے بھائی کی جیب سے چابی نکال لی اور مجھے آزاد کر دیا۔ رات ڈھل رہی تھی، میں فوراً بھاگ نکلی اور تمھارے پاس پہنچ گئی۔

میں نے گھبرا کر پوچھا: اللہ کی بندی! اب تمھاری بہن کا کیا بنے گا؟ تمھارے سنگدل بھائی اُسے ہلاک کر دیں گے۔ کہنے لگی: ''اس کی فکر نہ کرو۔ میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ فی الحال اپنے اسلام کو چھپائے رکھو۔ کسی پر ظاہر نہ ہونے دو حتی کہ اللہ تعالیٰ تمھاری خلاصی کی کوئی صورت پیدا فرما دے۔''

اگلے دن ہم بخیر و عافیت اپنے وطن واپس پہنچ گئے۔ ہم ایئر پورٹ سے سیدھے ہسپتال گئے۔ میری بیوی چند دن ہسپتال میں رہی اور مکمل طور پر صحت یاب ہو گئی۔ اب ہم اس کی بہن کے لیے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے دین اسلام پر ثابت قدم رکھے اور اس کے لیے نجات کی آسان سبیل پیدا فرما دے۔ آمین!

قارئین کرام! دیکھیے، اس داستان میں ہمارے لیے عبرت و موعظت کے کیسے کیسے مینار چمک رہے ہیں، اگرچہ آج اہل باطل کا طریق کار بدل گیا ہے لیکن ان میں سفاکی اور سفلہ پن کی وہی رُوح کام کر رہی ہے جو فرعون، نمرود، ابوجہل اور ابولہب کی رگوں میں دوڑتی پھرتی تھی۔ جس طرح کل ابوجہل اور امیہ بن خلف جیسے سنگدل سیدنا بلال رضی اللہ عنہ اور سیدہ سمیہ بنت خیاط کو ”جرم حق پرستی“ کی پاداش میں ظلم و ستم کا نشانہ بناتے تھے، اُسی طرح آج بھی اہل حق دار و رسن کی آزمائش میں مبتلا ہیں۔ حق پرستوں کا شیوہ ہی یہ ہے کہ وہ حق پر ڈٹے رہتے ہیں اور اُنھیں دنیا کی کوئی طاقت راہ راست سے نہیں ہٹا سکتی۔

المکتبۃ الرحمانیۃ
۹۹-جے ماڈل ٹاؤن-لاہور
نمبر 17658

النقوش الذهبية

(باللغة الأردية)

زیر نظر کتاب در حقیقت ایک پکچر گیلری ہے۔ اس میں اچھے اور بُرے دونوں طرح کے لوگوں کی زندگی کے سچے واقعات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ یہ واقعات خود بھی توجہ سے پڑھیے اور اپنے بیوی، بچوں، بہن، بھائیوں، جملہ عزیز واقارب اور دوست احباب کو بھی ان کے مطالعے کی ترغیب دیجیے۔ تاکہ آپ کو اَلدَّالُ عَلَى الْخَيْرِ كَفَاعِلِهِ کی نقد سعادت بھی حاصل ہو جائے۔ نیکی کا لازمی نتیجہ کامیابی اور فتح مندی ہے جب کہ گناہ چاہے کتنا ہی چھپ کر کیا جائے وہ ہمارا پیچھا کرتا ہے، اپنا تاوان لیتا ہے اور ندامت کے ساتھ سچی توبہ نہ کی جائے تو ہمیشہ خون کے آنسو رلاتا ہے۔

دار السلام
کتاب و سُنّت کی اِشاعت کا عالمی اِدارہ

ISBN NO.
9 786035 000017